مدیر: سید جلال الدین عمری

معاون: محمد مسعود عالم قاسمی

ماہنامہ **زندگی نو** نئی دہلی

جلد ۸ ☆ فروری ۱۹۸۸ء جمادی الثانی، رجب ۱۴۰۸ھ ☆ شمارہ ۲

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
مدیر "زندگی نو" پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے:
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون - /۵۵ روپے ● (بیرون ہند) - /۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = /5 روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۴۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقویٰ اور اس کی حقیقت

(۲)

سید جلال الدین عمری

تقویٰ کی اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا صاف ستھرا اور بے آمیز تصور ذہنوں میں زندہ اور تازہ رہے۔ لیکن مختلف اسباب کی بنا پر یہ تصور اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیے۔ اس پر ایک طرح کی دھند سی چھائی ہوئی ہے اور اس کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تقویٰ کے نام پر بہت سے منافیٔ تقویٰ اعمال رواج پا گئے ہیں اور تقویٰ سے بے خبر اصحاب تقویٰ، ان ہی پر جان دے رہے ہیں۔

بعض لوگ تقویٰ کو رہبانیت اور گوشہ گیری کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اس سے ترک دنیا، بے عملی، تجرد، بیوی بچوں سے دوری اور بے تعلقی، دوسروں کے حقوق اور اپنی ذمہ داریوں سے غفلت جیسے امراض راہ پاتے ہیں۔ حالانکہ تقویٰ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تقویٰ زندگی سے فرار کا نہیں، عین کارزارِ حیات میں خدا کی مرضی پوری کرنے کا نام ہے۔ یہ معاشرہ سے انسان کو کاٹتا نہیں، جوڑتا ہے، یہ حقوق سے فرار کا نہیں، ان کی ادائیگی کا طریقہ سکھاتا ہے، یہ ذمہ داریوں سے دامن کشی کی نہیں، حدود شریعت کی پوری پابندی کے ساتھ ان کی بجا آوری کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رہبانیت کی تردید میں فرماتے ہیں:

اما واللہ انی لاخشاکم
للہ واتقاکم لہ ولکنی اصوم
وافطر واصلی وارقد واتزوج
النساء فمن رغب عن سنتی فلیس
منی (متفق علیہ)

سن رکھو! قسم خدا کی میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور میرے اندر تم میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے لیکن میں (نفل) روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا (نفل) نمازیں رات میں پڑھتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جو شخص میرے طریقہ سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تقویٰ کے تصور کے ساتھ بعض علامتیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ ان ہی علامتوں سے 'متقی' آدمی پہچانا جاتا ہے۔ جہاں یہ علامتیں نہ ہوں وہاں تقویٰ کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان علامات میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی گندہ ہو، بال بکھرے ہوئے ہوں اور لباس سے بدبو پھیل رہی ہو۔ حالانکہ تقویٰ کے تصور کے ساتھ یہ گندگی کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

تقویٰ روح کی پاکیزگی کے ساتھ جسم کی پاکیزگی بھی پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ اگر خدا کی محبت کا نام ہے تو آدمی کو اپنے گناہوں سے توبہ کی بھی توفیق ملے گی اور وہ ظاہری آلائشوں سے بھی پاک ہوگا۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ (البقرہ: ۲۲۲) (بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توبہ کرنے والوں سے اور محبت کرتا ہے پاک صاف رہنے والوں سے)

بعض حضرات کا تصور تقویٰ اس طرح کی گندگی اور خرافات سے تو پاک ہے لیکن ان کے نزدیک بھی خاص قسم کی وضع قطع، پوشاک اور ظاہری ہیئت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر یہ ساری چیزیں سنت کے مطابق ہوں تو یقیناً باعث اجر و ثواب ہیں اور انھیں تقوی کے اثرات ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ یہاں سنت کے تقاضے پورے کرنے سے زیادہ اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ بعض اوقات جوش انفرادیت میں سنت کو بھی قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہ تقویٰ کے نام پر تقویٰ سے کھلا ہوا انحراف ہے۔

اس تصور تقویٰ کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ ظاہر پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے باطن سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور اس کی کمزوریاں دور نہیں ہو پاتیں۔ ظاہر تو 'تابناک' ہوتا چلا جاتا ہے لیکن باطن کی 'تاریکی' دور نہیں ہو پاتی۔ اسے قرآن مجید کے اسلوب میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ لباس دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جسم کی ستر پوشی اور زیب و زینت کے لیے اور دوسرا روح کو عریانی اور بے حیائی سے بچانے اور اس کی آرائش و زینت کے لیے۔ قرآن اسے 'لباس تقویٰ' کہتا ہے۔ اصل اہمیت اسی کی ہے۔ جسم کے لباس کو بھی اسی کے تابع ہونا چاہیے اور اسی کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے۔ جو لباس روح کے تقاضوں کو پورا نہ کرے، چاہے اس کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں، لیکن دل کی دنیا روشن نہیں ہو سکتی۔ انسان کی یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جو لباس صرف اس خاکی تن کی زینت بن سکے اسے لباسِ تقوی سمجھ بیٹھے۔ یہ حقیقت قرآن کی اس آیت کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَ لِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (الاعراف: ۲۶)

اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے جسم کے چھپانے کے قابل حصوں کو چھپاتا بھی ہے اور تمہارے جسم کی حفاظت اور زیب و زینت کا ذریعہ بھی ہے (ایک لباس تقویٰ کا بھی ہے) تقویٰ کا یہ لباس اس ظاہری لباس سے بہتر ہے۔ (اس کی زیادہ فکر ہونی چاہیے) یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت انسان کے ظاہر سے زیادہ اس کے اخلاص اور حسن عمل کی ہے۔ اگر زندگی ان دونوں خوبیوں سے خالی ہے تو اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ آدمی حسن و جمال کا پیکر ہے اور اس نے اپنے

ظاہر کو خوبصورت اور دلکش سا بنا دیتا ہے۔ جسم کے لئے جو جامہ چست آجائے، ضروری نہیں کہ روح کے لیے بھی وہی موزوں ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان اللہ لاینظر الی اجسادکم ولا الی صورکم وفی روایۃ واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم
(مسلم، کتاب البر والصلۃ)

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو تمہارے جسم کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری شکل و صورت کو۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ وہ تمہارے مال و دولت کو بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

بعض حضرات کا تقویٰ زندگی کے چھوٹے سے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا تعلق عبادات اور خاص طرح کی اخلاقیات سے تو ہے لیکن اس سے ہٹ کر زندگی کے اور شعبوں میں اس کے آثار کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عبادات اور اخلاق کے بغیر دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اس اہمیت کے باوجود وہ بہر حال کل دین نہیں ہیں۔ دین ہماری پوری زندگی سے متعلق ہے اور تقویٰ کو زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہونا چاہئے۔ تقویٰ جب صحیح معنی میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا ظہور جس طرح ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل اور عبادات و اخلاق میں ہوتا ہے اسی طرح وہ دعوت و تبلیغ، معیشت و معاشرت اور تہذیب و سیاست میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔

تقویٰ کے اس تصور سے ایک اور خرابی بھی ابھری ہے۔ وہ یہ کہ اس تصور نے بعض چھوٹے چھوٹے اعمال کو بڑے اعمال کا مقام دے رکھا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جہاں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ نوافل اور مستحبات اور اوراد و وظائف کی پابندی کی جاتی ہے، کھانے پینے، سونے جاگنے، وضع قطع اور روزمرہ کی زندگی میں اسلامی تعلیمات اور اس کے آداب کا اہتمام ہونے لگتا ہے وہیں اس بات پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ جو تقویٰ اتنا باریک بین ہے وہ دین کی مظلومیت پر آدمی کو بے چین نہیں کرتا۔ دین کے غلبہ کی فکر اس سے نہیں پیدا ہوتی، دین کو عام کرنے اور اس راہ میں تکلیفیں برداشت کرنے کا جذبہ نہیں ابھرتا بلکہ اس پر غور و فکر اور بحث و گفتگو سے بھی شاید یہ آدمی کو دور رکھتا ہے حالانکہ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ خدا کے دین نے جس عمل کو جو اہمیت دی ہے وہ اسی اہمیت کے ساتھ زندگی میں جگہ پائے۔

قرآن مجید نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اعمال سب ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ بعض اعمال کی اہمیت کم ہے اور بعض کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ مشرکین مکہ بیت اللہ کے متولی تھے، اس کا انتظام و انصرام اور حاجیوں کی خدمت کرتے تھے۔ یہ سب اچھی اور نیک خدمات تھیں۔ اپنی ان خدمات پر وہ نازاں بھی تھے۔ لیکن قرآن مجید نے کہا۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ

مشرکین کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جب کہ وہ خود اپنے کفر کا اقرار کر رہے ہیں، ان کے تمام

بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ۝ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۝ أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

اعمال اکارت گئے اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کھائیں۔ توقع ہے کہ یہ ہدایت یاب ہوں گے۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بہت بڑا ہے اور یہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی رحمت اور رضا مندی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ابدی نعمتیں ہوں گی۔ ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

(التوبہ : ۱۷-۲۲)

ان آیات میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ مسجدیں اللہ واحد کی عبادت کے لیے ہیں۔ اس لیے ان کی تعمیر اور آبادکاری کا حق ان لوگوں کو نہیں ہے جو شرک کی گندگی میں ملوث ہوں۔ اس کا حق صرف اہل ایمان کو ہے۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ مشرکین مکہ کو اللہ کے گھر کی جن خدمات پر ناز ہے ان خدمات کو ان کارناموں سے کوئی مناسبت نہیں ہے جو دین حق کے سلسلہ میں اہل ایمان انجام دے رہے ہیں۔ خدا اور آخرت پر ایمان رکھنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، دل کا خدا کے خوف کے علاوہ ہر خوف سے پاک ہونا، اللہ کے دین کی خاطر گھر بار کا چھوڑ دینا، اللہ کی راہ میں جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنا وہ اعمال ہیں جن کا مقابلہ مساجد کی دیکھ بھال، ان کی آبادکاری اور حاجیوں کی خدمت سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

ان آیات میں گو مشرکین اور اہل ایمان کے اعمال کا موازنہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اتنی بات واضح ہے کہ سب اعمال ایک حیثیت کے نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان فرق ہے۔ اس فرق کو کوئی بھی صاحب ایمان فراموش نہیں کر سکتا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بحثیں کبھی کبھی اہل ایمان کے درمیان بھی اٹھتی تھیں۔ ان آیات میں ان کی بھی تردید ہے۔ یہاں ایک روایت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں منبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک شخص نے کہا اسلام لانے کے بعد حاجیوں کی خدمت کر سکوں تو کافی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور عمل نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ دوسرے نے کہا مسجد حرام کو آباد کرنا کافی ہے۔ مجھے اس کی توفیق مل جائے تو کسی دوسرے عمل کی پرواہ نہ ہوگی۔ کسی نے جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف کی اور اسے سب سے افضل قرار دیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو منبر رسول کے پاس بحث کرنے سے منع کیا (اس سے نمازیوں کا حرج ہو رہا ہوگا) جمعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں دریافت کیا تو سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔ أجعلتم سقاية الحاج۔ (مسلم۔ کتاب الجہاد، باب فضل الشہادۃ فی سبیل اللہ)

اس موقع پر آیت نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس بحث میں بھی اس آیت سے ہدایت اور راہنمائی ملتی ہے۔ مساجد کی تعمیر اور ان کی خدمت کے ذیل میں یہاں جو صفات بیان ہوئی ہیں تقویٰ کا لفظ ان سب کا جامع ہے۔ جن مساجد کی تعمیر اس تقویٰ کے جذبہ کے تحت ہو وہ اسلام کے لیے باعث خیر ہیں۔ وہاں سے رشد و ہدایت کی روشنی پھیلے گی اور دین کی خدمت اور اس کی سربلندی کی کوشش ہوگی۔ اہل ایمان کو ان ہی سے دلچسپی ہو سکتی ہے ورنہ خدا کا گھر بھی اس کے دین کی بربادی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مسجد ضرار کے سلسلہ میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے بعض منافقین نے یہ مسجد اس لیے بنائی تھی کہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنے اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے ایک مرکز کا کام دے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں نماز ادا فرما کر اسے سند قبولیت عطا کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے منع فرمایا۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ	.. اور کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی
كُفْرًا وَّ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ	ہے تاکہ اسلام کو نقصان پہونچائیں، کفر کی باتیں کریں
وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	اور اہل ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالیں اور اسے اس
مِن قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ	شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ٥ لَا	رسول کے خلاف برسرپیکار رہ چکا ہے۔ یہ ضرور قسمیں
تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى	کھا کھا کر کہیں گے کہ ہماری نیت سوائے بھلائی کے اور کچھ

التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ (التوبہ: ۱۰۷ - ۱۰۸)	نہیں ہے۔ اللہ گواہ ہے یہ سراسر جھوٹے ہیں۔ آپ اس میں ہرگز کھڑے نہ ہوں۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (مسجد قبا)، وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو خوب پاک رہنا چاہتے ہیں اور اللہ اس طرح پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ نیکی اور تقویٰ کا مقام بہت بلند ہے۔ بعض مراسم اور بے روح اعمال کے ذریعہ انسان وہاں تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس کے لیے اپنے اندر اعلیٰ اوصاف کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ ۱۷۷)	نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلیے یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ، یوم آخرت، ملائکہ، اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، سوال کرنے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو پورا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی متقی ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں اور آدمی سچا اور راست باز کب کہلاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی غیب کی حقیقتوں پر سچے دل سے ایمان رکھے، معاشرہ کے کمزور افراد کا ہمدرد اور بہی خواہ ہو اور ان کے حقوق پہچانے، نماز کا پابند ہو، زکوٰۃ کا اہتمام کرے، وعدہ اور عہد و پیمان پر قائم رہے، مشکلات اور آزمائشوں میں صبر و استقامت کا ثبوت دے اور رزم حق و باطل میں پہاڑ کی طرح جما رہے۔

ان آیات کے ذریعہ تقویٰ کے تقاضے اجمال کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر انھیں کھول کر بھی بیان کیا ہے۔ بعض اہم تقاضوں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ دین کو اس کی کامل شکل میں قبول کیا جائے، اس میں کوئی قطع و برید نہ ہو اور اسے

ذوق و رجحان اور مفادات کے تابع نہ کر دیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دین کی جو باتیں ذوق کے مطابق ہوں لپک کر انھیں لے لیا جائے اور جو باتیں ذوق سے ہم آہنگ نہ ہوں ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ جہاں اپنے کسی مفاد کو ٹھیس نہ پہونچے وہاں دین کا لبادہ اوڑھ لیا جائے اور جہاں مفادات ٹکرا رہے ہوں وہاں اسے چوم کر الگ رکھ دیا جائے بلکہ زندگی کے جس معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو ہدایت بھی ملے اسے دین و دنیا کی سعادت سمجھ کر قبول کیا جائے اور جس کام کی بھی ممانعت ہو، سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اس سے احتراز کیا جائے۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر ۷)

رسول تمہیں جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے بھی تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ (اپنی نافرمانی پر) سخت سزا دینے والا ہے

تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی خدا کی بندگی اور اطاعت کی راہ اختیار کرے، اس کے بندوں کا ہمدرد و بہی خواہ ہو، ہر حال میں حق پر قائم رہے اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرے۔ اس کی زندگی کفر و شرک سے، فسق و فجور سے اور ظلم و زیادتی سے پاک ہو۔ چنانچہ قرآن مجید جب احکام الٰہی کی اطاعت اور معاصی سے اجتناب کا حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ عموماً تقویٰ کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ ہو تو احکام الٰہی کی پابندی بھی ہوگی اور انسان معصیت سے بھی بچے گا۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

ایک جگہ اس وضاحت کے بعد کہ توحید فطرت کے عین مطابق ہے ارشاد فرمایا۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الروم: ۳۱)

(اس دین فطرت پر عمل کرو) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اس کا تقویٰ اختیار کرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

مطلب یہ کہ جس شخص کو توحید کا صحیح تصور مل جائے اور جس کی زندگی شرک سے پاک ہو، اس کے اندر انابت اور تقویٰ کی کیفیت پائی جانی چاہئے اور اسے نماز کا پابند ہونا چاہئے۔ اس کی جبین خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنی نہیں چاہئے۔

ایک اور جگہ شرک کی تردید کرتے ہوئے یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ

ان سے کہہ دو کہ صحیح راستہ تو اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم رب العالمین کے مطیع و فرماں بردار ہو جائیں اور یہ کہ نماز قائم کریں اور اس کا تقویٰ اختیار کریں۔ وہی ہے جس کے پاس تم

(الانعام: ۷۱-۷۲) سب جمع کئے جاؤ گے۔

حج کے احکام کے ذیل میں ارشاد ہوا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (البقرہ: ۱۹۶)
اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

حج میں جھگڑے اور فساد سے دور رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ: ۱۹۷)
سفر حج کے لیے زادراہ ساتھ رکھو اور سب سے بہتر زادراہ تو تقویٰ ہے۔ لہذا اے عقل مندو مجھ سے ڈرتے رہو۔

نکاح اور طلاق کے احکام کے ذیل میں عورتوں پر زیادتی سے منع کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر رویہ اختیار کرنے اور ان کے معاملہ میں عفو و درگذر سے کام لینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں بار بار تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ: ۲۳۱)
اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (البقرہ: ۲۳۳)
اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ بے شک اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھ رہا ہے

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرہ: ۲۳۷)
(طلاق کی صورت میں) تمہارا اپنے حق کو معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ آپس میں احسان کے رویہ کو نہ بھولو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھ رہا ہے۔

تقویٰ کی یہ تاکید اس لیے ہے کہ تقویٰ ہی آدمی کو ان ہدایات کا پابند بنا سکتا ہے۔ تقویٰ نہ ہو تو عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی اور حق تلفی کی وہ ہزار راہیں نکال لے گا۔

سود کی حرمت بیان کرتے ہوئے حکم دیا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرہ: ۲۷۸)
اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔

آگے ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (البقرہ: ۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جس دن کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔

ایک اور جگہ اس سلسلہ کی ہدایت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (آل عمران ۱۳۰-۱۳۱)

اے ایمان والو! سود مت کھاؤ، کئی حصے بڑھا کر۔ اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ امید ہے تم فلاح پاؤ گے اور جہنم کی آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

قرض کی کتابت کا حکم دیا گیا تو اس کے ساتھ تقویٰ کی ہدایت کی گئی۔ (البقرہ۔ ۲۸۲) سفر میں لین دین کے احکام بیان کرتے ہوئے اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی۔ (البقرہ: ۲۸۳)

ایمان والوں کو حکم ہے کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے وہ اس کے دین پر قائم رہیں اور عدل و انصاف کے شاہد بن جائیں۔ کسی قوم کی دشمنی انھیں عدل و انصاف سے نہ ہٹا دے۔

اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (المائدہ ۸)

(ہر حال میں) عدل کرو اس لیے کہ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

کسی کے ساتھ زیادتی ہو تو اسے حق ہے کہ جتنی زیادتی ہوئی ہے اتنا انتقام لے۔ اس سے زیادہ انتقام لینے کا اسے کوئی حق نہیں ہے زیادتی کے مقابلہ میں صبر کا رویہ اختیار کرنا اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ اس کے بہترین نتائج نکل سکتے ہیں اس تفصیل کے بعد ارشاد ہوا۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ (النحل: ۱۲۸)

بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ والے ہیں اور جو احسان کی روش اختیار کرتے ہیں۔

یہ مثالیں اس حقیقت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ تقویٰ ہی سے احکام الٰہی کی اطاعت کی راہ آسان ہوتی ہے اور آدمی معصیت سے بچ سکتا ہے۔ تقویٰ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے سامنے آدمی زبان نہ کھولے، اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے اور جو قدم اٹھ گیا ہو اسے واپس لے لے۔ ایمان والوں سے اسی تقویٰ کا مطالبہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

اللّٰہ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (الحجرات : ۱)	بے شک اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

جو تقویٰ انسان کو خدا اور رسول کے احکام کا اس طرح پابند بنا دیتا ہے وہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہیں اس کے لیے کھول دیتا ہے۔ سورۂ نور میں یہ حقیقت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْآ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَہُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَ اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ (النور ۵۱-۵۲)	ایمان والوں کی بات تو یہ ہے کہ جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، اللہ سے ڈریں اور اس کا تقویٰ اختیار کریں وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

تقویٰ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی سچے لوگوں کا ساتھ دے۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○ (التوبہ : ۱۱۹)	اے ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

اس آیت میں تقویٰ کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ آدمی ان لوگوں کی صف میں شامل ہو جائے جنھوں نے اللہ کے دین کو سچے دل سے قبول کیا ہے اور جو پورے اخلاص کے ساتھ اس کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ اور نیکوں کی رفاقت میں گہرا تعلق ہے۔ جس شخص کے دل میں تقویٰ ہوگا وہ اس رفاقت کو دوسرے تمام تعلقات پر ترجیح دے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص تقویٰ سے جس قدر دور ہوگا اسی قدر اس رفاقت کو ناپسند کرے گا۔

سچے اور راست باز انسانوں میں آدمی کا شمار اس وقت ہوگا جب کہ اس کے اندر وہی اعلیٰ جذبات اور کیفیات موجزن ہوں جو ان کے اندر پائے جاتے ہیں، اس کی سیرت میں ان کی سیرت کا عکس جلوہ ریز ہو، اس کے شب و روز، ان کے شب و روز کی طرح خدا کی یاد میں بسر ہوں اور وہ خدا سے ڈر کر ان کی سی پاکیزہ زندگی گزارے، دین کی خدمت اور اس کی نصرت و حمایت میں ان کا ساتھ دے اور اس کے لیے ان کی طرح قربانیاں پیش کرے۔

یہ آیت جہاد کے سلسلہ میں آئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ سچے اہل ایمان دین کی خاطر جان و مال کی بازی لگا رہے ہیں، تمھیں ان کی صف میں آنا چاہیے۔ یہی تمہارے تقویٰ اور خدا ترسی کا تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نیک اور سچے بندوں کے ساتھ رفاقت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے نافرمانوں اور باغیوں، اس کے دین کے دشمنوں اور منافقوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ جو شخص خدا سے قریب ہونا چاہتا ہو وہ ان لوگوں کا ساتھ کبھی نہیں دے سکتا جو اسے خدا سے دور کرنے کی فکر میں ہوں۔ اس کی کوشش تو یہ ہوگی کہ ان کی

سازشوں کا پردہ چاک کردے اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنادے۔ وہ اپنی پوری قوت ان کے خلاف جدوجہد اور جہاد میں لگادے گا۔ باطل کی ظلمتوں میں تقویٰ ہی سے یہ قوت حاصل ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ اِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (الاحزاب : ۱)

اے نبی اللہ سے ڈرتے رہئے اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجیے۔ بے شک اللہ علم والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور آپ کے ذریعہ پوری امت کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کرے اور کافروں اور منافقوں کی راہ نہ چلے اور ان کی اطاعت نہ کرے۔ قرآن مجید اللہ کے باغیوں اور سرکشوں کو 'مسرفین' کہتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنی حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور بے قید زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان کی قیادت و راہنمائی قبول کرنے، ان کے پیچھے چلنے اور ان کی سی روش اختیار کرنے سے شدت سے منع کرتا ہے۔ اس نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ان مسرفین سے اجتناب کیوں ضروری ہے؟ حضرت صالحؑ اپنی قوم سے فرماتے ہیں۔

فَاتَّقُوا اللهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۵۰-۱۵۲)

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو اور ان مسرفین کی بات نہ مانو جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے

یہاں پہلے اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم ہے۔ پھر مسرفین اور مفسدین سے بچے رہنے کی ہدایت ہے۔ تقویٰ ہی سے آدمی ان کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ورنہ ان کے حملے اتنے سخت اور ان کی سازشیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ قدم قدم پر آدمی کے مات کھانے اور ان کا شکار ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس شر سے بچائے رکھے۔

مقالات

دین میں مداہنت جائز نہیں

عبید اللہ فہد فلاحی

اسلام امن وسلامتی اور رحمت وعافیت کا علمبردار ہے۔ توحید کی تعلیمات انسانی معاشرے میں محبت ویگانگت اور اخوت ومساوات قائم کرتی ہیں۔ قرآن بار بار نوع انسانی کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور دنیا وآخرت کی کامیابی کی کلید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت کو قرار دیتا ہے مسلمان ایک امت وسط بناکر بھیجے گئے ہیں جن کا بنیادی فریضہ ایمان کی دعوت دینا، معروف کا حکم کرنا اور منکر سے روکنا ہے۔ دعوت واشاعت دین کے اس فریضہ کی انجام دہی میں حکمت وموعظت کی تلقین کی گئی ہے۔ مخاطب سے احسن طریقہ پر مجادلہ اور گفتگو کرنے کا حکم دیا گیا ہے مبادا کسی شیطانی اکساہٹ کے نتیجے میں وہ منکر یا مخالف حق بن جائے اور دعوت کی تکذیب وتردید اپنا شیوہ بنالے۔ لیکن دین کی دعوت واقامت میں ہر قسم کی مصالحت ومداہنت سے روک دیا گیا ہے۔ قرآن بار بار اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ دین کے کسی قاعدے، کسی اصول، کسی عقیدے اور حکم کے اندر ادنیٰ سا رد وبدل بھی نہیں ہو سکتا۔ جو اسلام کو تسلیم کرتا ہے وہ پورے کا پورا دین تسلیم کرتا ہے اور جو نہیں ماننا چاہتا اس پر کوئی زور دھونس یا جبر نہیں ہے، اس کی اپنی دنیا اور آخرت بگڑے گی یہاں کسی سودے بازی اور لین دین پر سمجھوتے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (القلم: ۸-۱۰)

پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے اور تم بات نہ سنو کسی جھوٹی قسم کھانے والے ذلیل شخص کی)

یہ سورہ مکی ہے۔ جس میں قرآن نے سرداران قریش کی فاسد ذہنیت پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اللہ نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ تحریک اسلامی کے مخالفین جب اوچھے ہتھکنڈوں اور سطحی پروپیگنڈوں سے بات بنتی نہیں دیکھتے تو نفسیاتی دباؤ ڈالتے ہیں، لین دین کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ مفاہمت اور مداہنت کی کوئی راہ نکالنے کی فکر کرتے

ل قرآن پاک کی ان ہدایات کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ مفید ہوگا: نحل: ۱۲۵، بنی اسرائیل: ۵۳، ۵۴، انعام: ۱۰۶، ۱۰۷، اعلیٰ: ۸، ۹، عبس: ۳ تا ۱۲، عنکبوت: ۴۶، مومنون: ۹۶، اعراف: ۱۹۹ تا ۲۰۲، حم السجدہ: ۳۳ تا ۳۶، ۵۲

ہیں لیکن صراحت سے اعلان کر دیا کہ حشر و نشر کی تکذیب کرنے والے ان بد قسمت انسانوں کی ہفوات پر کان نہ دھرو یہ تو چاہتے ہی ہیں کہ تم پر دباؤ ڈال کر تمہیں کچھ نرم کریں تاکہ تم کچھ باتیں ان کی مان لو اور وہ کچھ باتیں تمہاری مان لیں۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ (یونس۔ ۱۵)

(جب انھیں ہماری صاف صاف آیتیں سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمدؐ۔ ان سے کہو، میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔

مخالفین دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر لیتی ہے اور یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ قرآن کی کچھ دوسری تعلیمات پیش کرو جن سے ہماری مرغوب دنیا بھی بنی رہی اور آخرت بھی یا کم از کم اتنی لچک پیدا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ تمہاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے بھی گنجائش نکل آئے۔[۱] اور تمہاری خدا پرستی اور ہماری نفس پرستی میں کچھ تال میل قائم ہو جائے لیکن مخالفتوں کے اس طوفان بدتمیزی میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ باہمی رضامندی اور مفاہمت سے کچھ مطالبات دین طے کر لئے جائیں۔ اس کے برخلاف پوری زندگی کو اور سارے معاملات کو قید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطے میں کس دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔

کسی لچک کو اختیار کرنے سے اجتناب

: مزید برآں قرآن نے حکم دیا کہ اپنے کسی رویہ اور سلوک کی وجہ سے مخالفین کو اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا موقع نہ دو کہ تمہارے دلوں میں ان کے لیے کوئی نرم گوشہ ہے۔ جو لوگ قرآن کو وحی الہٰی ماننے سے منکر ہیں، رسول اکرمؐ کی اتباع و اطاعت کو اپنی فلاح و سعادت کے لیے کافی نہیں سمجھتے اور دنیا کی رنگینیوں میں مست ہو کر آخرت فراموشی، دین بیزاری اور بغاوت خداوندی پر تلے ہوئے ہیں ان کے لیے کسی لچک اور نرمی کا خیال تک دل میں نہ لاؤ۔

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝

اور ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے۔ اور کہیں سے تم کو مدد

[۱] مولانا مودودیؒ، تفہیم القرآن جلد دوم، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۴ء ص ۲۷۱ - ۲۷۲

نہ پہونچے گی (ہود: ۱۱۳)

مخالفین کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ داعی دین کو توحید کی جامع و مکمل دعوت سے ہٹادیں اور شرک و رسوم جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مصالحت پر مجبور کردیں اس غرض کے لیے فریب، لالچ، دھمکی، جھوٹا پروپیگنڈہ، ظلم وستم، معاشرتی مقاطعہ، معاشی ناکہ بندی، نفسیاتی حربے سبھی کچھ آزمائے جاتے ہیں اور اگر اللہ کی تائید و نصرت شامل حال نہ ہو تو ان فتنوں سے انسان کا محفوظ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔[۱]

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۳، ۷۴)

اے محمدؐ، ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمھیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمھاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمھیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمھیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔

مخالفین سے اعلان برأت: دین کی دعوت پہونچانے اور خدا و رسول کی اطاعت کی تعلیم دینے کے بعد بھی اگر مخاطب، اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہے اسلام کے استیصال کے لیے سازشیں اور منصوبے بناتا رہے اور اہل اسلام کی جان و مال کو نقصان پہونچانے اور ان کے دینی و تہذیبی تشخص کو مٹانے کے درپے رہے تو پھر اس سے دعوت اور افہام و تفہیم کا رشتہ منقطع کر لینا چاہئے۔ اس وقت اس سے برأت اور قطع تعلق کا اعلان کرنا ضروری ہے ورنہ غیر ضروری خوشامد اور تملقانہ رویہ کی وجہ سے کار دعوت کو نقصان پہونچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اعوان و انصار اسلام تحریک کے سلسلہ میں غلط فہمیوں کا شکار ہونے لگتے ہیں اور مشرکین و کفار کی ذہنیت اور روش کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر نیم تربیت یافتہ افراد پر پڑنے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ذرا سی کوتاہی پورے قافلہ کی راہ مار سکتی ہے۔ رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل آغاز دعوت میں حکم دیا جاتا ہے کہ اگر لوگ تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیں تو تم ان سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دینا۔

---

[۱] اس سلسلہ میں رسول پاکؐ کی سیرت ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ مخالفین نے ابتدائے دعوت ہی میں مصالحت کی کوششیں کیں مختلف وفود آپؐ کی خدمت میں پہنچے اور جس کم از کم شرط پر سمجھوتے کی پیش کش کی وہ یہ تھی کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں یعنی مثبت طریقے پر اپنی دعوت کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن منفی پہلو چھوڑ دیں ہمارے نظریات و افکار اور عقائد پر تنقید نہ کریں۔ یعنی لا الٰہ کے بنیادی کام سے صرف نظر کر کے صرف الا اللہ کی تبلیغ و تلقین کریں لیکن رسول اللہؐ نے اس ساری تدبیروں کو ٹھکرا دیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ توحید کی بے لاگ دعوت پر میں کوئی لین دین یا مداہنت نہیں کر سکتا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (شعراء: ۲۱۴-۲۱۷)

اور اپنے قرابت داروں کو ڈراؤ اور جن مومنین نے تمھاری پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو پس اگر وہ (کفار) تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے اعمال سے بری ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (یونس: ۴۱)

اگر وہ تمہیں جھٹلا دیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل۔ تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (انبیاء ۱۰۹)

اگر وہ رخ موڑلیں تو کہہ دو میں نے تمہیں عام طور پر خبردار کر دیا اور میں نہیں جانتا کہ جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ قریب ہے یا دور ہے۔

یہی وہ قطع تعلق ہے جس کا اعلان سورہ کافرون میں کیا گیا جس کا نام منابذہ، اخلاص اور مقشقشہ بھی رکھا گیا۔ کیونکہ منابذہ کا مطلب ہے کسی سے تمام تعلقات کاٹ لینا۔ اخلاص کے معنیٰ ہیں مومنین کو مشرکین سے چھانٹ کر الگ کر دینا اور قشقشہ اس صورت حال کو کہتے ہیں جو چیچک اور زخم وغیرہ کے اچھے ہو جانے کے بعد جلد سوکھ جانے سے پیدا ہوتی ہے یعنی وہ سورہ جو قرب صحت اور نجاست شرک سے علیحدگی کی خبر دے رہی ہو۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اسے برأت اور جنگ کی سورہ قرار دیا ہے[1]۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ (کافرون)

(کہہ دو اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں۔ تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین۔

صلح حدیبیہ کی مثال:

اس سیاق میں بہترین مثال صلح حدیبیہ کی دی جاسکتی ہے۔ یہ معاہدہ ۶ھ میں رسول اللہ اور مشرکین مکہ کے درمیان طے پایا۔ جس کی چار شرطیں بڑی اہم تھیں:

۱۔ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بندی رہے گی۔ اس دوران کوئی فریق بھی ایک دوسرے کے خلاف خفیہ یا علانیہ کارروائی نہ کرے گا۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر سورہ الکافرون ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ طبع دوم

۲۔ اس دوران قریش کا کوئی آدمی اگر بھاگ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کردیں گے اور اگر کوئی مسلمان قریش کے پاس جائے گا تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔

۳۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی چاہے فریقین میں سے کسی کا حلیف بن کر اس معاہدہ میں شامل ہو سکتا ہے۔

۴۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال وہ عمرہ کے لیے آئیں۔ تین دن تک وہ مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں اسلحہ میں سے ہر شخص ایک تلوار لا سکتا ہے۔ لیکن وہ نیام میں رہے گی۔ ان تین دنوں میں اہل مکہ ان کے لیے شہر خالی کردیں گے تاکہ باہمی تصادم کا اندیشہ نہ رہے [1]

ان میں سے دو شرطیں مسلمانوں کو انتہائی ناگوار تھیں۔ وہ کسی طرح قریش سے دب کر صلح کرنے کو تیار نہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے جذبات میں آکر وہ بات کہہ دی جس کے لیے انھیں زندگی بھر افسوس رہا لیکن ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی جو آیات نازل ہوئیں ان میں کسی مداہنت یا سمجھوتہ تو کجا غلبۂ دین اور اقامت اسلام کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا اور رسول اکرمؐ کی بعثت کو تمام باطل ادیان پر دین حق کو غالب کرنے کی مہم سے وابستہ کردیا گیا۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى	وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ	ساتھ بھیجا تاکہ سارے دینوں پر اسے غالب کرے اور اللہ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؁ (الفتح: ۲۸)	کی گواہی کافی ہے۔

سورہ توبہ میں یہی مضمون دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ	یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ کی پھونکوں سے
بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ	بجھا دیں لیکن اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ وہ ان کافروں کے علی الرغم
نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ؁ هُوَ الَّذِيٓ	اپنے نور کو کامل کرکے رہے گا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے
اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ	رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ مشرکوں کے علی الرغم
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ؁ (التوبہ، ۳۲-۳۳)	اس کو تمام دینوں پر غالب کرے۔

اس آیت کا جو شاہانہ انداز ہے اسے اہل علم اور باذوق طالبان قرآن ہی سمجھ سکتے ہیں بظاہر دب کر جو معاہدہ ہوا تھا اس کے بعد ہی رسول کی بعثت کا مقصد واضح کرکے یہ اعلان کردیا گیا کہ امامت دین اور غلبۂ اسلام کے نصب العین میں کوئی ترمیم و تنسیخ یا حذف و اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناگوار اور ناسازگار ہوں داعئ دین حکومت الٰہیہ کے قیام اور اسلامی معاشرے کی تشکیل سے کم پر راضی نہیں ہو سکتا۔ مقصد ہمیشہ اس کی نگاہ میں واضح رہے گا اور وہ پوری شدت سے اس

---

[1] مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرت المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد دوم، ادارہ علم و حکمت دیوبند ۱۹۸۱ء ص ۳۵۸ - ۳۶۰

دین میں مداہنت جائز نہیں۔

موقف کا اعادہ و اعلان کرتا رہے گا۔

بعض لوگ اسلام کا ایک قومی یا ہندوستانی ایڈیشن تیار کرنے کی فکر اور کوشش میں ہیں: ایسا اسلام جو ہندوستان کے سیکولر ڈھانچے میں فٹ ہوسکے جس سے اکثریتی فرقہ کی جبینوں پر شکن بھی نہ آئے اور اسلامی سیکولر معاشرہ بھی تشکیل پاجائے[1]۔ یہ لوگ صلح حدیبیہ سے استدلال کرتے ہیں لیکن سورہ فتح کے مضامین اس سورہ کے انداز و اسلوب اور غیر مصالحانہ دو ٹوک رویہ کو نظر انداز کردیتے ہیں[2]۔

اَشِدّاءُ علی الکفّار کا مفہوم:

یہی سورہ ہے جس میں اہل ایمان صحابہ کی امتیازی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کفر کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں نرم دل ہوتے ہیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ — محمد اللہ کے رسول اور جو اُن کے ساتھ ہیں وہ

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح ۲۹) — کفار پر سخت آپس میں رحم دل ہیں۔

یہی مضمون بعینہٖ سورہ مائدہ کی آیت ۵۴ میں اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے جس کا مطلب مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، سہولت پسند، بے تکلف قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے نرم جگہ نہ پاسکیں گے[3]۔

ان آیات میں اہل ایمان کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حالات چاہے نرم ہوں یا سخت، کفر و شرک کے مقابلہ میں ان کا رویہ سخت اور بے لچک ہوتا ہے۔ توحید و آخرت کی دو ٹوک تعلیمات، اقامت دین کا راست نصب العین اور غلبہ اسلام کی مہم میں ان کا اداریاں ہمیشہ واضح اور غیر مبہم ہوتا ہے۔ ان کے ایمان کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست انھیں اس پر چارہ نہیں دیتا کہ کافر آسانی سے چبا جائیں۔ کفر کبھی ایمان کو نہ خرید سکتا ہے نہ دھمکی اور دھونس سے دبا سکتا ہے۔

---

[1] اس میں نمایاں نام مولانا وحید الدین خاں کا ہے جن کی کتاب تعبیر کی غلطی اس مسخ شدہ تصویر کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

[2] دیکھیے مولانا امین احسن اصلاحی۔ تدبر قرآن جلد دوم ص ۳۱۸، جلد ششم ص ۴۷۰ تا ۴۷۲

کمسنی کی شادی اور اسلام

(۲)

مولانا سلطان احمد اصلاحی

کمسنی کی شادی کے نقصانات: ان حدود و قیود کا لحاظ کئے بغیر اگر کمسنی کی شادی کے دروازے کو چوپٹ کھول دیا جائے اور بلا روک ٹوک سماج میں اسے رواج عام حاصل ہو جائے تو یہ چیز فرد اور معاشرے کے لئے چند در چند نقصانات کی موجب ہو گی۔ اور اس کے خسارے کی تلافی آسانی کے ساتھ نہ کی جا سکے گی۔

جسمانی اور طبی نقصانات: سب سے زیادہ تو اس کا نقصان کمسن لڑکی کے لئے جسمانی اور طبی لحاظ سے ہے۔ اس لئے کہ جدید طبی تحقیقات سے ثابت ہے کہ لڑکی کے بدن کا نشو و نما اٹھارہ برس کی عمر تک ہوتا رہتا ہے۔ وہ پندرہ سولہ سال کی میں جوان ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور بیضہ دان کی نشو و نما اٹھارہ برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لڑکی اگر اٹھارہ برس سے کم عمر میں ماں بن جائے تو اس کو درج ذیل نقصانات پہنچتے ہیں۔

۱۔ لڑکی کے بدن کی نشو و نما رک جاتی ہے۔

۲۔ چونکہ اٹھارہ برس کی عمر میں رحم اور بیضہ دان جیسے بچہ جننے کے کچھ اعضاء کی نشو و نما مکمل نہیں ہوتی اس لیے حمل اکثر گر جاتا ہے۔ ماں بننے میں دقتیں بھی پیش آتی ہیں۔

۳۔ پیڑو کی نشو و نما اٹھارہ سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس لیے بچے کا سر ٹرا اڑ سکتا ہے۔ بچہ جننے میں رکاوٹ سے اندرونی اعضاء کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جس سے مثانے اور اوجھڑی میں کمزوری آ جاتی ہے۔

۴۔ کم عمری میں مجامعت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں میں یہ کینسر کی بڑی وجہ ہے۔[۱]

---

[۱] ماہنامہ خاتون مشرق دہلی۔ اگست ۱۹۸۲ء ص ۴۳۔ اشتہار جاری کردہ حکومت ہند پوسٹ بکس نمبر ۲۰۴۳ ۔ ۵۔ نئی دہلی

۵۔ اس طرح کی شادی کی صورت میں عام طور پر حمل بہت جلد ٹھہر جاتا ہے، جس سے عورت کی صحت برباد ہو جاتی ہے اور وقت سے پہلے اس پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے[1]

۶۔ مزید براں اٹھارہ برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ ایسی کمزور اور کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے[2]

---

[1] شادی کے لئے مناسب عمر کیا ہے؟ کتابچہ شائع کردہ وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند۔ اپریل ۱۹۸۷ء

[2] خاتون مشرق، جولائی سابق۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بچوں کی اموات کے بڑھتے ہوئے اوسط کا تعلق کمسنی کی شادی کی پھیلی ہوئی صورت حال سے ہے۔ ایک حالیہ مطالعہ کے مطابق ایک ہزار میں ۱۰۵ کے قومی اوسط کے برعکس بچوں کی اموات کا اوسط مدھیہ پردیش میں ۱۱۹ اور اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں ۱۳۲ ہے مطالعہ کی ابتدائی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ اموات کی شرح ان بچوں میں بہت بڑھی ہوئی ہے جو ۱۸ سال سے کم عمر کی عورتوں کو ہوتے ہیں۔ نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح ان عورتوں کی نسبت سے دوگنا اور تگنا بڑھی ہوئی ہو نامناسب غذا (MALNUTRITION) کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ یہ مطالعہ جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، کرناٹک اور مہاراشٹرا کے ۳۴ اضلاع کے ۸۰۰ گاؤں میں کیا گیا، اس کا انتظام ادارہ فیملی پلاننگ فاؤنڈیشن (FAMILY PLANNING FOUNDATION) کی طرف سے کیا گیا تھا۔

اعداد و شمار کے مطابق ۷۹ سے ۸۵ فی صدی تک غریب اور کمزور طبقات کی لڑکیوں کی شادی ۱۸ سال سے کم عمر میں ہو جاتی ہے اور وہ حاملہ بھی ہو جاتی ہیں۔ اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں ۹۰ فیصدی سے زیادہ لڑکیوں کی شادی مذکورہ عمر سے پہلے ہو جاتی ہے اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں، کرناٹک کی دیہی آبادی اور ممبئی کی جھونپڑپٹیوں میں تعداد کا یہ تناسب بالترتیب ۷۷ء۱، ۷۶ء۲ ہے۔ ۱۸ سال سے پہلے حاملہ ہونے کا اوسط مدھیہ پردیش میں ۵۰ سے ۸۵ فی صدی، اتر پردیش میں ۲۶ سے ۳۸ فیصدی کرناٹک اور ممبئی میں تقریباً ۳۸ اور اڑیسہ اور کرناٹک (کے بعض دوسرے علاقوں) میں ۹ سے ۳۳ فیصدی ہے۔ دوسرے متعدد اداروں نے فاؤنڈیشن کے ساتھ اس مطالعہ میں تعاون کیا۔ جس کے نتیجے میں ایک لاکھ دس ہزار ۱۰۰۰۰ گھرانوں، ۲۵ ہزار ماؤں جن کے یہاں گذشتہ دو سالوں میں بچہ ہوا، سرکاری فلاح و بہبود سے متعلق کارندوں سے رابطہ ہوا۔

اس مطالعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ کم آمدنی اور کم وزن بچوں کی پیدائش میں قریبی تعلق ہے۔ بچوں کی اموات کی شرح غریب خاندانوں میں دگنا بڑھی ہوئی ہے جن کی (ماہانہ) آمدنی ۵۰۰ روپئے سے کم ہے۔ غربت کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ شادیاں جلد کر دی جاتی ہیں اور بعد میں جنین کی مناسب پرورش و پرداخت نہیں ہو پاتی ہے۔ پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد صحیح نگرانی نہ ہونے کے باعث بچہ شدید بیماری و خطرات کا شکار رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ مزید بچے پیدا کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ مطالعہ اس چل رہے بُرائی کے چکر (VICIOUS CIRCLE) کو کافی ابھار کر پیش کرتا ہے۔ یہ اعداد و شمار ملک کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۸۔ اس عمر سے پہلے پستانوں کی نشو و نما چونکہ مکمل نہیں ہوتی اس لیے ماں بننے کی صورت میں ماں کا دودھ ناکافی پڑ سکتا ہے[1]

ذہنی اور نفسیاتی نقصان :- صحت ساتھ نہ دے اور بیماری مستقل طور پر لگ جائے تو استثنائی صورتوں کے علاوہ آدمی کا ذہن بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اکثر و بیشتر قبل از وقت شادی اور اس کے بعد اس سے متعلق ذمہ داریوں کے ناقابل برداشت بوجھ کے نتیجے میں لڑکی کی شخصیت دھل کے رہ جاتی ہے۔ اور اس کی صلاحیتیں پورے طور پر ظاہر نہیں ہو پاتیں۔ اگر لڑکی تعلیم میں لگی ہوئی ہو یا کوئی ہنر سیکھ رہی ہو تو اس میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

کمسنی کی شادی لڑکے کے لیے بھی نقصان دہ ہے :

خاص طور پر ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے کمسنی کی شادی لڑکے کے لیے بھی کم نقصان دہ نہیں ہے۔ نوجوانی کے آغاز اور اس کے بعد کا فوری زمانہ آدمی کے لیے بڑا قیمتی اور نزاکت کا حامل ہے۔ اس زمانہ میں آدمی جس چیز کو اپنا مطمح نظر قرار دے لے اور اس کے لیے جی جان سے لگ جائے تو اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں جس چیز سے بے توجہی ہو جائے اور جس سے انسان چوک جائے تو غالب ترین صورتوں میں اس سے ہمیشہ کے لیے چوک ہو جاتی ہے۔ نشاط اور قوت کار کی جو فراوانی نوجوانی کی عمر میں ہوتی ہے، عمر میں اضافے کے ساتھ اس کی کمی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ دنیا ہی نہیں دین کا بھی مطالبہ ہے کہ آدمی علم و فن میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ اس کمال کے حصول کا زمانہ کمسنی اور نوجوانی ہی کا زمانہ ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ :

طلب الحديث في الصغر كالنقش في الحجر[2]	کمسنی میں 'حدیث' کی طلب ہو تو یہ ذہن و دماغ میں ایسے ہی نقش ہو جاتی ہے جیسے پتھر کی لکیر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مضمون کی ایک روایت بھی ہے۔

من تعلم العلم وهو شاب كان كوشم في حجر ومن تعلم العلم	جو کوئی 'علم' سیکھے جبکہ وہ جوان سال ہو تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ پتھر میں نقش ہو جائے۔ اور جو کوئی علم

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) متعدد اور متنوع سماجی اور معاشی اکائیوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ان کے تفصیلی تجزیہ و تحلیل کا کام ہنوز جاری ہے۔ ملاحظہ ہو روزنامہ انڈین اکسپریس، نئی دہلی، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶ء خبر (Early marriage cause of child mortality۔ (کمسنی کی شادی بچے کی موت کا سبب ہے) [1] شادی کی مناسب عمر کتابچہ مذکور۔

[2] جامع بیان العلم : ۱/۸۲ - ادارۃ الطباعۃ المنیریہ (مصر) ۱۹۷۸ء

بعد ما یدخل فی السن کان کالکاتب علی ظهر الماء[۵]
سیکھے جبکہ وہ عمر رسیدہ ہو چکا ہو تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ پانی کے اوپر لکیر کھینچی جائے۔

اس عمر میں کمال کے حصول بڑا ذریعہ ہے کہ آدمی شادی بیاہ کے جھمیلوں سے دور رہ کر پہلے کچھ بن جائے۔ پہلے اپنے لئے کوئی بنیاد فراہم کرلے پھر ازدواجی زندگی مسائل میں الجھے۔ سمجھداری اور پختگی کی عمر میں بھی عورت لیبا اوقات علم و فن کی راہ کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بعض اکابر کی طرف سے جو مقولہ مشہور ہے:۔

ضاع العلم بین افخاذ النساء[۶]
عورتوں کی رانوں میں پڑ کر علم کا ستیاناس ہوگیا۔

تو یقیناً اس کی بنیاد طویل تجربے اور حالات کے گہرے مشاہدے پر ہے۔ خاص طور پر آج کے مسابقت (comp-etition) اور اختصاص (specialisation) کے دور میں نوجوانی کی عمر میں علم و فن کے لئے یکسوئی اور انہماک کی جو اہمیت ہے اس کے سلسلے میں کچھ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ غالب ترین احوال میں معاشی حالات کا بھی تقاضا ہے کہ آدمی کو اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے اور اپنے لئے کوئی مستقل معاشی بنیاد فراہم کر لینے کے بعد ہی شادی کے بندھن میں اپنے کو باندھنا مناسب ہے کہ اسی صورت میں وہ خانگی اور ازدواجی ذمہ داریوں کو بہتر طریقے پر ادا کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ چیز اور بھی زیادہ مطلوب و مستحسن اور ضروری ہے جو شادی کے بعد بیوی کے نان نفقہ اور اولاد کی کفالت اور پرورش کی ذمہ داری تنہا شوہر اور باپ کی قرار دیتا ہے[۷]۔

قرآن و سنت کے اشارات جن سے بلوغت اور سمجھداری کی عمر میں شادی کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے:

لڑکوں اور مردوں کے لیے شادی کی مناسب عمر کیا ہے اور عمر کا کون سا مرحلہ ہے جس میں انھیں جلد سے جلد اپنے کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر لینا چاہئے؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ذیل براہ راست اس مسئلہ کو حل کرتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع

اے گروہ نوجوانان! تم میں سے جو کوئی شادی کا بوجھ اٹھانے (باءہ) کی طاقت رکھے تو چاہئے کہ وہ شادی کرلے۔ اس لئے کہ نگاہ کو نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا یہ

---

[۵] حوالہ سابق [۶] موضوعات کبیر لملا علی قاری / ۵۳ مطبعہ عامرہ (مصر) ۱۲۸۹ھ نیز: المقاصد الحسنہ للسخاوی، مکتبۃ الخانجی، مصر ۱۹۵۶ء

[۷] ہدایہ: ۲/۴۱۷، ۴۲۵۔ رشیدیہ، دہلی۔

فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء[1] بہترین ذریعہ ہے۔ اور جس کے اندر طاقت نہ ہو تو وہ (نفلی) روزے رکھے۔ اس لئے کہ یہ اس کے لیے شہوانی قوت کو توڑنے والا ہے۔

۱۔ لفظ 'شباب' کا تقاضا: اس حدیث پاک میں کئی چیزیں غور طلب ہیں، جو اس مسئلہ کے حل میں مدد دیتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز 'شباب' کا لفظ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کا خطاب نوجوانوں کی جماعت 'معشر الشباب' سے کیا ہے۔ 'معشر' اس گروہ یا جماعت کو کہتے ہیں جس کے ہاں کوئی وصف ہو جو ان سب کے درمیان قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہو۔ اس طرح نوجوان (شباب) ایک جماعت (معشر) ہیں اور بوڑھے ایک جماعت۔ اسی طرح انبیاء ایک جماعت (معشر) ہیں اور عورتیں ایک جماعت۔ وغیرہ۔ 'شباب' 'شاب' کی جمع ہے۔ جس کے معنیٰ نوجوان معلوم ہیں۔ اس کی دوسری جمع 'شبان' اور 'شبتہ' بھی آتی ہے[2]۔ شادی کے اس حکم کے لئے نوجوانوں کی جماعت 'معشر الشباب' سے خطاب کا صاف مطلب ہے کہ دراصل یہی طبقہ ہے جو اس فرمان کا اصل محل ہے اور یہی جماعت ہے جو صحیح معنوں میں اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ اگرچہ بعض مصالح کے تحت استثنائی طور پر کمسنی کی شادی جائز ہو، اصلاً اس حکم کا مخاطب 'نوجوانوں' سے ہے۔ کمسنوں اور نابالغوں کو اسلام وقت سے پہلے اس جھمیلے میں پھنسانا نہیں چاہتا۔

۲۔ نوجوانی کی عمر: اب غور طلب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ 'نوجوانی' کی عمر کیا ہے؟ اور 'شباب' 'نوجوانوں' کا اطلاق کس عمر سے کس عمر تک کے لوگوں کے لیے ہوگا؟ امام نوویؒ حضرت امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک اس سلسلے میں یہ نقل کرتے ہیں:

والشاب ۔ ھو من بلغ ولم یجاوز ثلاثین سنۃ[3] نوجوان وہ ہے جو بالغ ہو چکا ہو اور اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ ہو۔

نوجوانی کی عمر کی تعیین میں علماء کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والشباب..... ھو اسم لمن بلغ الی ان یکمل ثلاثین ھکذا اطلق جوان 'شباب' وہ ہے جو بالغ ہو جائے یہاں تک کہ وہ تیس سال کی عمر پوری کرلے شوافع نے علی الاطلاق

---

[1] بخاری جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم۔ مسلم جلد ۱۔ کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت الیہ نفسہ و وجد مونۃ الخ ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب النکاح، باب التحریض علی النکاح۔ ترمذی جلد ۱۔ ابواب النکاح۔ نسائی جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب الحث علی النکاح۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب فضل النکاح۔ [2] شرح نووی للمسلم بر مسلم ۱/۴۴۸۔ نیز ابن حجر: فتح الباری ۹/۸۵۔ [3] شرح نووی، حوالہ سابق۔

الشافعیۃ وقال القرطبی فی المفہم فقال لہ حدث الی ستۃ عشر سنۃ ثم شاب الی اثنین وثلاثین ثم کہل وکذا ذکر الزمخشری فی الشباب انہ من لدن البلوغ الی اثنین وثلاثین وقال ابن شاس المالکی فی الجواہر الی اربعین وقال النووی الاصح المختار ان الشاب من بلغ ولم یجاوز الثلاثین ثم ہو کہل الی ان یجاوز الاربعین ثم ہو شیخ وقال الرویانی وطائفۃ من جاوز الثلاثین سمی شیخا زاد ابن قتیبۃ الی ان یبلغ خمسین وقال ابو اسحق الاسفراینی عن الاصحاب المرجع فی ذلک الی اللغۃ واما بیاض الشعر فیختلف باختلاف الامزجۃ۔

یہی بات کہی ہے۔ قرطبی نے 'مفہم' میں کہا کہ اسے نوجوان 'حدث' کہا جائے گا سولہ سال تک، پھر وہ 'جوان' 'شاب' کہلائے گا۔ یہی بات زمخشری نے کہی ہے کہ 'جوانی' (شباب) بالغ ہونے سے تیس سال کی عمر تک ہے۔ ابن شاس مالکی 'جواہر' میں کہتا ہے کہ یہ چالیس سال تک ہے۔ نووی نے کہا سب سے زیادہ صحیح اور راجح یہ ہے کہ 'جوان' 'شاب' وہ ہے جو بالغ ہو جائے اور اس کی عمر تیس سے اوپر نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ادھیڑ 'کہل' ہے یہاں تک کہ وہ چالیس سال کا ہو جائے۔ پھر وہ بوڑھا 'شیخ' ہے۔ رویانی اور کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جو تیس سال سے اوپر ہو جائے اسے بوڑھا 'شیخ' کہا جائے گا۔ ابن قتیبہ نے اس پر اضافہ کیا یہاں تک کہ وہ پچاس سال کا ہو جائے۔ ابو اسحاق اسفراینی اپنے اصحاب سے نقل کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن چیز زبان ہے۔ جہاں تک بال کی سفیدی کا سوال ہے تو اس کا تعلق مزاجوں کے اختلاف سے ہے۔

اس تفصیل میں 'نوجوانی' کی آخری عمر کم سے کم تیس سال قرار دی گئی ہے۔ امام نوویؒ نے اسی کو سب سے زیادہ صحیح اور پسندیدہ قرار دیا ہے۔ یہی بات سب سے زیادہ راجح اور صحیح تر معلوم بھی ہوتی ہے۔ نوجوانی (شباب) کی عمر حدیث پر بحث کی رو سے جس کے بعد آدمی شادی کے لیے صحیح معنوں میں اہل قرار پاتا ہے، اس کا آغاز پندرہ سال کی عمر سے ہوتا ہے۔ اس عمر میں عام طور پر لڑکے کو احتلام آنے لگتا ہے، جس کے بعد وہ شادی کی عمر میں داخل ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی آیت کریمہ

حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (الآیہ النساء: ۶)

یہاں تک کہ جب وہ (یعنی یتیم بچے) شادی کی عمر کو پہونچ جائیں

سنن ... ۸۵/۰

کے تحت صاحب جلالین نے اس کی صراحت کی ہے۔ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک بتایا ہے۔

(حتیٰ اذا بلغوا النکاح) ای صاروا اھلا لہ بالاحتلام او السن وھو استکمال خمسۃ عشر سنۃ عند الشافعی[۱]

(یہاں تک کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں) یعنی کہ اس کے لائق ہو جائیں۔ احتلام کے ذریعہ یا عمر کے ذریعہ۔ اور وہ یہ کہ امام شافعی کے نزدیک لڑکا پندرہ سال کی عمر پوری کرلے۔

امام شافعیؒ کے اس قول کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رفع القلم عن ثلاثۃ الصبی حتی یحتلم أو یستکمل خمس عشرۃ سنۃ وعن النائم حتی یستیقظ وعن المجنون حتی یفیق[۲]

تین طرح کے لوگ محاسبہ سے بچے ہوئے ہیں۔ بچہ یہاں تک کہ اسے احتلام آنے لگے یا یہ کہ وہ پندرہ سال کی عمر پوری کرلے۔ سونے والا یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے۔ اور بیہوش یہاں تک کہ اسے ہوش ہو جائے۔

نوجوانی کی عمر کا آغاز سولہ سال کی عمر سے ہوتا ہے اور اس کی آخری حد تیس سال ہے۔ اس طرح بیچ کا وقفہ چودہ سال کا بنتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث:

خیر الامور اوساطھا[۳]

معاملات میں سب سے بہتر وہ ہے جو بیچ کا ہو۔

کو بنیاد بنالیا جائے تو چودہ کا نصف سات، ۱۶+۷=۲۳، شادی کی آئیڈیل عمر مرد کے لیے تیئس ۲۳ سال بنتی ہے۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو پیش نظر رکھا جائے تو دو سال کے اضافے سے شادی کی آئیڈیل عمر پچیس سال ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شادی حضرت خدیجہؓ سے اسی عمر میں ہوئی تھی[۴]۔ یہ صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل نبوت سے پہلے کا ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام منصب نبوت پر سرفراز کئے جانے سے قبل بھی فطرت سلیم کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اور نبوت سے پہلے کی بھی ان کی زندگیاں اپنے اندر اسوہ اور نمونہ کا بڑا

---

[۱] تفسیر الجلالین / ۹۸۔ دار المعرفۃ، بیروت، طبع اولی ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء۔ [۲] بحوالہ تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۲۴۔ [۳] ابن السمعانی عن علی مرفوعا بہ، والدیلمی بلا سند عن ابن عباس مرفوعا بہ ولابی یعلی لبند رجالہ ثقات عن وہب بن منبہ بخاہ۔ المقاصد الحسنۃ للسخاوی / ۲۰۵، مکتبۃ الخانجی، مصر ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء۔ نیز ملاحظہ ہو: مجمع بحار الانوار، ۳ / ۳۵۴ بحوالہ طیبی فی شرحہ للمشکوٰۃ مطبع نول کشور۔ النہایہ فی غریب الحدیث: ۴ / ۲۱۰ المطبعۃ العثمانیۃ، مصر ۱۳۱۱ھ [۴] سید سلیمان ندوی، سیرۃ عائشہؓ / ۱۲ دار المصنفین۔ طبع چہارم ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء

سامان رکھتی ہے. پھر آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا کہنا جو تمام نبیوں کے سردار اور اسی نسبت سے اسوہ اور
مونہ کے پہلو سے سب کے سرخیل اور سب کے امام اور پیشوا ہیں۔

۳۔ لفظ 'باءۃ' کی تحقیق اور اس کا مقتضا: حدیث پاک میں تیسرا توجہ طلب لفظ 'باءۃ' ہے۔ نوجوانوں کی جماعت کو خطاب کرکے کہا گیا ہے کہ جو
لوگ اس کی قدرت اور استطاعت رکھتے ہوں انھیں شادی میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس سے نگاہ کو
پست رکھنے میں مدد ملتی ہے اور شرم گاہ کی حفاظت کا سامان ہوتا ہے۔ لفظ 'باءۃ' کی تحقیق میں علماء کے
دو قول ہیں۔ جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے امام نوویؒ فرماتے ہیں،

واختلف العلماء فی المراد بالباءۃ هنا علی قولین یرجعان الی معنی واحد اصحهما ان المراد معناها اللغوی وهو الجماع فتقدیره من استطاع منکم الجماع لقدرته علی مؤنه وهی مؤن النکاح فلیتزوج ومن لم یستطع الجماع لعجزه عن مؤنه فعلیه بالصوم لیدفع شهوته ویقطع شره کما یقطعه الوجاء

حدیث میں 'باءۃ' سے کیا مراد ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں دو قول ہیں جو لوٹ کر ایک ہی بات تک پہنچتے ہیں۔ ان دونوں میں صحیح تر بات یہ ہے کہ یہاں اس لغوی معنی مراد ہیں یعنی عورت سے مباشرت۔ پس پوری بات گویا یوں ہے کہ تم میں سے جو نکاح کے لوازم پر قدرت رکھنے کی وجہ سے مباشرت کی طاقت رکھتا ہو تو وہ شادی کرے۔ اور نکاح کے لوازم سے درماندگی کے باعث جس کے اندر مباشرت کی طاقت نہ ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ (نفلی) روزے رکھے تاکہ وہ اپنی شہوانی خواہش کو دور کرسکے اور اپنے مادۂ منویہ کی برائی کو ختم کرسکے جس طرح کہ بدھیا ہونا اس چیز کو ختم کردیتا ہے۔

دوسرے قول کی تفصیل وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

والقول الثانی أن المراد هنا بالباءۃ مؤن النکاح وسمیت باسم ما یلازمها وتقدیره من استطاع

۲۔ دوسرا قول یہ کہ یہاں 'باءۃ' سے مراد نکاح کے لوازم ہیں۔ اور اس کا نام گویا اس چیز کے نام پر رکھا گیا ہے جو لازمی طور پر اس کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ پوری بات

۱؎ نووی برمسلم ۱/ ۴۴۸

منکم مُون النکاح فلیتزوج ومن لم یستطعہا فلیصم لیدفع شہوتہ[1]

یوں ہے کہ تم میں سے جو کوئی نکاح کے لوازم کی طاقت رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ شادی کرلے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ (نفلی) روزے رکھے تاکہ اپنی شہوانی خواہش کو دور کرسکے۔

اس تفصیل میں اگرچہ لفظ 'بارۃ' کے اندر جماع کی قدرت اور نکاح کے لوازم کی استطاعت دونوں ہی چیزوں کو شامل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس لفظ کا غالب رجحان نکاح کے دوسرے لوازم ہی کی طرف ہے۔ جب خطاب' نوجوانوں کی جماعت' سے ہے تو جماع کی قدرت سے محرومی ان کے درمیان استثنائی طور پر ہی ہوسکتی ہے۔ اور معلوم ہے کہ عام گفتگو میں استثنائی صورتوں کا اعتبار نہیں ہوتا۔ حدیث کے دوسرے نظائر سے اسی مفہوم کو تقویت ملتی ہے، جس میں شادی کی راہ کی اصل رکاوٹ اور اس کو موخر کرنے کا غالب سبب مالی دشواریوں ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی صورت میں نفل روزوں کے ذریعہ شہوانی قوت کو توڑنے کی تدبیر اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

من کان منکم ذا طول فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لا فالصوم لہ وجاء[2]

تم میں سے جس کسی کے مالی گنجائش ہو تو وہ شادی کرلے اس لیے کہ یہ نگاہ کو نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور جو ایسا نہ کرسکے تو روزہ اس کی شہوانی خواہش کو توڑنے کا جائز وسیلہ ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی وتزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ومن کان ذا طول فلینکح ومن لم یجد فعلیہ بالصیام فان الصوم لہ وجاء[3]

نکاح میرا طریقہ ہے۔ اور جو میرے طریقے پر عمل نہ کرے تو اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ اور شادی کرو اس لیے کہ میں (قیامت کے دن) دوسری امتوں کے مقابلہ میں اپنی عددی برتری کا مظاہرہ کروں گا۔ اور تم میں سے جس کسی کے مالی گنجائش ہو وہ نکاح کرلے۔ اور جو اس سے قاصر ہو تو اس کے لئے (نفلی) روزوں کا اہتمام لازم ہے۔ اس لئے کہ روزہ اس کی شہوانی خواہش کو توڑنے کا جائز وسیلہ ہے۔

---

[1] حوالہ سابق [2] نسائی جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب الحث علی النکاح۔ [3] ابن ماجہ ابواب النکاح، باب فضل النکاح

'طول' کے معنی 'مالی صلاحیت' اور 'مالی گنجائش'[1] کے معروف ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں ایک طرح سے حدیث زیر بحث کی تشریح ہیں۔ ایک دوسری حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شادی کی راہ اصل رکاوٹ مالی دشواری ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے ارشاد فرمایا:

ثلاثة حق علی الله عونهم المجاهد فی سبيل الله والمكاتب الذی يريد الاداء والناكح الذی يريد العفاف[2]

تین طرح کے لوگ ہیں کہ اللہ ان کی مدد ضرور کرتا ہے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا، مکاتب[3] غلام جو (اپنی آزادی کے لئے واجب رقم کو) ادا کرنا چاہتا ہو، تیسرے شادی کا خواہش مند جو اس کے ذریعہ پاکبازی کا طالب ہو۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن تین طرح کے لوگوں کی مدد کا تذکرہ ہے، ان سب کا تعلق مالی کمزوری اور مالی احتیاج سے ہے۔ حدیث کے آخری ٹکڑے میں جو بات کہی گئی ہے، قرآن حکیم میں اسے مزید کھول کر بیان کیا گیا ہے:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (نور: ۳۳)

اور چاہئے کہ پاکبازی اختیار کریں وہ لوگ جنھیں نکاح کی گنجائش نہیں ہے یہاں تک کہ اللہ انھیں اپنے فضل سے بے نیاز کردے۔

آیت کریمہ میں 'استعفاف' اور پاکبازی کا جو حکم دیا گیا ہے، حدیث زیر بحث میں اس کی تفصیل کردی گئی ہے کہ اس کی بہترین تدبیر کثرت سے نفلی روزوں کا اہتمام ہے۔ جس سے شہوانی قوت کو توڑنے میں مدد ملتی ہے۔ آگے 'حتی یغنیہم اللہ من فضلہ' (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے بے نیاز کردے، یعنی کہ مالی کشادگی سے ہمکنار کردے) کے ٹکڑے سے واضح کردیا گیا ہے کہ 'شادی کی راہ کی اصل رکاوٹ مالی دشواری ہے' اس طرح قرآن وحدیث

---

[1] اس سلسلہ میں آیت کریمہ کا حوالہ کافی ہے جس میں مالی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں آزاد عورتوں سے ہٹ کر نوجوان باندیوں سے نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔ وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ۔ الآیہ۔ (نساء: ۲۵) (اور تم میں سے جس کے پاس مالی گنجائش نہ ہو کہ وہ آزاد اہل ایمان عورتوں سے شادی کر سکے تو وہ جو تمہارے ہاتھ کی ملکیت میں ہیں (یعنی باندیاں) ان میں سے جو تمہاری صاحب ایمان نوجوان لڑکیاں ہیں ان کو نکاح میں لائے)۔ صاحب جلالین نے 'طول' کے معنی 'غنی' (مالداری) ہی کے لکھے ہیں۔ تفسیر الجلالین ۷۴۔ [2] ترمذی جلد ۱۔ ابواب فضائل الجہاد، باب ما جاء فی المجاہد والمکاتب والناکح وعون اللہ ایاہم۔ نسائی جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب معونۃ اللہ الناکح الذی یرید العفاف۔ نیز ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح جلد ۲۔ کتاب النکاح فصل ثانی۔

دونوں ہی جگہ مسلمان مردوں اور نوجوانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب تک ان کے مالی حالات سازگار نہ ہو جائیں، انھیں شادی میں جلدی نہ کرنا چاہیے۔ اور بیچ کے وقفہ کو کمال پاکبازی و عفت مآبی کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں خاص طور پر کثرت سے نفلی روزوں کا سہارا پکڑنا چاہیے۔ مسلمان مرد اور مسلمان نوجوان کے لیے شادی کی موزوں اور مناسب عمر کی نسبت سے قرآن و حدیث کی یہ تعلیم اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے۔ اس سے صاف طریقے پر یہ بات نکلتی ہے کہ مسلمان نوجوان کی زندگی میں ایک ایسا وقفہ بھی گزرنا چاہیے جبکہ وہ شدید طور پر شادی کی ضرورت کو محسوس کرتا ہو لیکن حالات کی ناسازگاری سے اس کے لئے اپنے ارادہ کی تکمیل ممکن نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان نوجوان کو بہت زیادہ حسابی نہ ہونا چاہیے اور زندگی کے مصنوعی معیارات کا اسے اسیر بھی نہ ہونا چاہیے کہ جب تک کہ ایک خاص طرز کی معاشرت کے وسائل اسے حاصل نہ ہو جائیں۔ حدود اللہ کی قربانی پر بھی وہ شادی کو موخر پر موخر کرتا چلا جائے۔ لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حالات اگر ساتھ نہ دیں تو شادی میں عجلت سے بھی کام نہ لیا جائے۔ آج کے حالات میں کام چلاؤ مالی اطمینان کے لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی کا کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو۔ کاروبار، تجارت اور ملازمت یا زراعت جو بھی اس کا ذریعہ آمدنی ہو، بڑی حد تک مستحکم ہو اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہو۔ موجودہ دور میں غالب ترین آبادی کا ذریعہ معیشت کاروبار یا ملازمت ہے، ملازمت کے لیے تعلیم ضروری ہے جو دس بارہ سال کی عمر میں مکمل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اس عمر میں کسی کاروبار کے استحکام کی بابت بھی سوچا نہیں جا سکتا۔ حدیث زیر بحث کا تقاضا ہے کہ عام حالات میں اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہو اور لڑکا تعلیم میں مشغول ہو، کوئی ہنر سیکھ رہا ہو یا کاروبار کو جمانے میں لگا ہوا ہو اور اس کی تکمیل سے پہلے شادی مصالح کے خلاف ہو تو نوجوانی کی آخری عمر تیس سال کا فائدہ اٹھا کر بیس بائیس سال کے بعد بھی اس مدت میں سال دو سال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ رضا الٰہی کے پاک جذبے سے دین و دنیا کے اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر نوجوان کے لئے شادی میں تاخیر کے لیے حدیث زیر بحث سے پوری گنجائش ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر حالات میں یہ چیز زیادہ سے زیادہ پسندیدہ اور مستحسن ہوگی۔ البتہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو دوسری ہر چیز کی قربانی دے کر اس کے لیے فوری طور پر شادی کر لینا واجب ہوگا۔

بعض دوسری احادیث جن سے پختگی کی عمر میں شادی کی پسندیدگی کا اشارہ نکلتا ہے:

شادی کے مسائل سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری احادیث کا بھی صاف اقتضا معلوم ہوتا ہے کہ اسے نابالغی اور کمسنی میں نہیں بلکہ سمجھداری اور پختگی کی عمر میں ہونا چاہیے۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ تنکح المرأة لاربع لمالها ولحسبها — عورت سے شادی چار چیزوں کی وجہ سے کی جاتی ہے

ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك[۱]

اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب نسب کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کی دینداری کی وجہ سے۔ تو تم دیندار عورت کا انتخاب کرو۔ اور خوش رہو۔

انہی کی دوسری روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۲۔ اذا خطب اليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه الا تفعلوه تكن فتنة في الارض وفساد عريض[۲]

جب تمہارے پاس شادی کا پیغام ایسا شخص بھیجے جس کا دین اور اخلاق تمہارے لیے قابل اطمینان ہو تو اس سے شادی کردو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ پھیلے گا اور بڑا فساد برپا ہوگا۔

اسی طرح مثال کے طور پر ایک حدیث میں آپ صلی اللہ فرماتے ہیں:

تزوجوا الولود الودود فانی مکاثر بکم[۳]

شادی کرو اس عورت سے جو زیادہ بچے دینے والی اور پیار بھری ہو۔ اس لیے کہ (قیامت کے دن) تمہارے ذریعہ میں (دوسری امتوں کے بالمقابل) اپنی عددی برتری کا کا مظاہرہ کرنے والا ہوں گا۔

اسی سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بھی ہے

اذا خطب احدكم المرأة فان استطاع ان ينظر الى ما يدعوه الى نكاحها فليفعل[۴]

جب تم میں کا کوئی شخص عورت کے ہاں شادی کا پیغام بھیجے تو اگر وہ ایسا کر سکے کہ (اس کے سراپا سے) وہ چیز دیکھ سکے جس سے کہ اسے اس سے نکاح میں رغبت ہو تو وہ ایسا کرلے۔

دوسرے موقعہ پر اس کی علت بیان فرمائی کہ

---

[۱] بخاری جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب الاکفاء فی الدین۔ مسلم جلد ۱۔ کتاب الرضاع باب استحباب نکاح ذات الدین۔ نیز ابوداؤد کتاب النکاح، باب مایومر بہ من تزویج ذات الدین۔ ترمذی جلد ۱۔ ابواب النکاح، باب ما جاء فی ان المرأۃ تنکح علی ثلاث خصال۔ نسائی جلد ۲ کتاب النکاح باب علی ما تنکح المرأۃ، نیز باب کراہیۃ تزویج الزناۃ۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب تزویج ذات الدین۔ [۲] ترمذی جلد ۱۔ ابواب النکاح، باب ما جاء فی من ترضون دینہ فزوجوہ۔ و فی الحدیث مقال۔ ترمذی، حوالہ سابق۔ [۳] ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب النکاح، باب فی تزویج الابکار۔ نسائی جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب کراہیۃ تزویج العقیم۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، تزویج الحرائر والولود۔ [۴] ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب النکاح باب الرجل ینظر الی المرأۃ وھو یرید تزویجہا۔

فانہ احری أن یودم بینکما[1] اس لئے کہ یہ چیز ان دونوں کے درمیان سازگاری پیدا کرنے میں بہترین معاون ہوگی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام تعلیمات کی معنویت اسی صورت میں باقی رہتی ہے جبکہ شادی سمجھداری اور پختگی کی عمر میں ہو، جس میں کہ آدمی ان تعلیمات کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو سکے۔ مزید براں بیوی کے ساتھ معاشرت اور عورت کے حقوق کے سلسلے میں آپؐ کی جو ہدایات ہیں ان کا بھی یہی صریحی تقاضا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا تعلق زندگی کے پورے وقفہ سے ہے اور دوسری، تیسری اور چوتھی شادیوں پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے لیکن اولین اور متبادر اطلاق اور اس کا محل پہلی شادی ہی ہے۔ اس لئے اصلاً اور بنیادی طور پر انھیں اسی سے متعلق ہونا چاہئے۔

آخری بات:۔ ہندوستان کی حکومت نے غالباً اسی طرح کے مصالح کے پیش نظر جن کی تفصیل اوپر گزری لڑکی کی شادی کی عمر کم سے کم اٹھارہ سال اور لڑکے کی اکیس سال مقرر کردی ہے[2] نابالغی اور کمسنی کی شادی عام حالات میں اسلام کے نقطۂ نظر سے بھی ناپسندیدہ ہے۔ البتہ یہ جو حکومت نے اس کی خلاف ورزی کو علی الاطلاق جرم اور قابل دراندازی پولیس قرار دیدیا ہے[3]، تو اسلام کے ماننے والوں کے لیے یہ چیز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اسلام کو پسند یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی شادی عام حالات میں بالغ ہونے کے بعد بھی سمجھ بوجھ آ جانے کے بعد ہو، لیکن بسا اوقات، جیسا کہ تفصیل گزری خاندان اور معاشرے کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کو کمسنی اور نابالغی میں شادی کے رشتہ میں منسلک کر دیا جائے۔ ان حدود کی رعایت کے ساتھ، جن کی تفصیل اوپر بیان ہوئی، کمسن لڑکی کی رخصتی بھی ہو سکتی ہے اور استثنائی طور پر اس سے خاص تعلق بھی قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن عام حالات میں پسندیدہ یہی ہے کہ شادی بالغ ہونے کے بعد سمجھداری اور پختگی کی عمر میں ہو اور دین و دنیا کے نقصانات سے بچنے کے لئے کمسنی کی شادی پر زیادہ سے زیادہ روک لگائی جائے[4] (ختم شد)

---

[1] ترمذی جلد ۱۔ ابواب النکاح، باب ماجاء فی النظر الی المخطوبۃ۔ نسائی جلد ۲۔ کتاب النکاح، باب اباحۃ النظر قبل التزویج۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب النظر الی المرأۃ اذا اراد أن یتزوجہا۔ [2] شادی کے لیے مناسب عمر (ہندی) محولہ بالا۔ [3] حوالہ سابق۔ [4] اس دور کے علماء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی اسی خیال کے قائل ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر اسلام کے نقطۂ نظر سے نکاح بحالت بلوغ کو مستحسن قرار دینے کے ساتھ آگے یہاں تک فرماتے ہیں کہ "اگر مسلمانوں کی حالت کا اقتضاء ہو کہ عدم بلوغ کے غیر مستحسن نکاح سے لوگوں کو روکا جائے تو مسلمانوں کا امام ایسا کر سکتا ہے۔ البتہ غیر مسلم حکومت میں ایسا نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ مسلمان قاضیوں کا تقرر ہو اور وہ اسلامی مصالح کی بنیاد پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کریں۔ آگے انھیں اس سلسلے میں تعزیرات جاری کرنے کا بھی اختیار رہے۔ لیکن اس طرح کی تمام صورتوں میں نکاح اور اس کے لوازم ناجائز نہ ہوں گے، مکتوبات سلیمان: ۱/ ۲۵۲ صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ ۱۹۶۴ء

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حالات زندگی

مولانا محمد مسعود عالم قاسمی

ہندوستان کے غالب حصہ میں اسلام کی اشاعت دوسرے اور تیسرے ادوار میں ہوئی، اور جن حضرات کی مساعی سے ہوئی وہ اصحاب رسولؐ یا ان کے براہ راست جانشین نہ تھے بلکہ وہ عرب ترک، ایران اور ماوراءالنہر کے ملے جلے مسلمان تھے ان میں علماء اور صوفیا بھی تھے اور تجار و اہل حرفہ بھی۔ ان حضرات کی جد وجہد کے نتیجہ میں مختلف مرحلوں میں سرزمین ہند پر آہستہ آہستہ اسلام کی اشاعت ہوئی مگر اس اشاعت کے ساتھ بالعموم تہذیب نفس اور تربیت ذات پر توجہ نہ دی گئی جس کے بغیر اسلام کا اصلی رنگ انسانوں پر نہیں چڑھتا۔ اس لیے نو واردان اسلام میں فکر وعمل کی بہت سی کمزوریاں باقی رہ گئیں جو بعض حالات میں اپنے اثرات کے اعتبار سے کفر و شرک سے کچھ کم نہ تھیں پھر جو لوگ بعد کے ادوار میں ایران اور اس کی سرحدوں سے ہندوستان آئے وہ اپنے ساتھ وہاں کے مخصوص تصورات و رسوم کی سوغات بھی لے کر آئے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا، نیز ہندوستان میں غیر مسلموں سے اختلاط اور سماجی موالات کی بناء پر بہت سے نظریات و رسوم ان میں رائج ہوگئے۔ دوسری طرف مسلم سلاطین کا اسلام کے تئیں رویہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ بہت سے سلاطین اپنی ذاتی زندگی میں بلاشبہ صوم و صلوۃ کے پابند تھے مگر سیاسی اور اجتماعی امور میں وہ اپنی رہنمائی کے لئے قرآن وسنت پر آئین نوشیروانی اور تورہ چنگیزی کو ترجیح دیتے تھے۔ دوسرے بعض سلاطین اگرچہ ان دونوں پہلوؤں سے اسلام کی پابندی کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ان کی مثال آٹے میں نمک جیسی تھی، ایک بڑی تعداد ان سلاطین کی ہے جو نہ تو ذاتی زندگی میں اسلام کے پابند تھے اور نہ سیاسی اور اجتماعی امور میں اسلام کو اہمیت دیتے تھے، ایسے سلاطین نے اسلام کو فائدہ پہونچانے کے بجائے ناقابل تلافی نقصان پہونچایا۔

مغلیہ دور حکومت ان تمام خرابیوں کا نقطہ عروج ([illegible]) بن گیا تھا۔ ایک طرف خود ہند و مسلم اختلاط سے برآمد ہونے والی قباحتیں تھیں جو عقیدہ وعمل اور رسوم ورواج کے وسیع وعریض حصہ پر پھیلی ہوئی تھیں اور دوسری طرف ایران سے درآمد کی جانے والی جاہلی چیزیں تھیں جو علم وفن سے لے کر آداب طرز معاشرت اور سیاست

سے لے کر اخلاق تک کو متاثر کر چکی تھیں اور تیسری طرف اکبر کی پھیلائی ہوئی فتنہ انگیزی تھی جس نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا ظاہر کیا تھا کہ جاہلیت اب اسلام سے بھرپور انتقام لے کر رہے گی اور دین اسلام کی جگہ خود ساختہ مذہب "دین الٰہی" لے لےگا[1] غلبہ کفار، شعائر اسلام کا انہدام اور مذہبی صورت حال کی ناسازگاری کا شدید تقاضا تھا کہ کوئی مسیحا آئے جو مسلمانوں کے درد و غم کا مداوا کرے، امت کے اندر دین حنیف کی روح تازہ پھونکے اور علم دین کی مشعلیں جلائے۔ ان حالات میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (۱۰۳۴ھ) آگے بڑھے اور اپنی مقدور کے مطابق اصلاحی اور دعوتی جدوجہد کا آغاز کیا، امرا و سلاطین کو جھنجھوڑا، عوام کی اصلاح و تربیت پر توجہ دی، صالح عناصر پر مشتمل ایک جماعت تیار کی اور دین حنیف کی اشاعت کی[2] مگر چونکہ تاریکی ہمہ گیر تھی، بگاڑ ہر شعبہ زندگی میں پھیل چکا تھا، اس لیے شیخ صاحب کی اصلاحی جدوجہد اس کا قلع قمع نہ کرسکی مکمل اور ماحول پر پھر سناٹا چھا گیا، جاہلیت کا زور توڑنے کے لیے شاہی خاندان ہی سے اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) بھی اٹھے جنھوں نے زمام اقتدار سنبھالا تو اسلام اور مسلمانوں کی عزت افزائی کا حوصلہ لے کر، مگر "مسلمانان ہند و مزاج" نے ان کی راہ میں بھی دشواریاں حائل کیں۔ اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر وہ ساری خرابیاں ایک ایک کرکے ابھرنے لگیں جو اس جیسے مردانِ حق آگاہ کی وجہ سے دب گئی تھیں۔ اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین کمزور، بزدل، عیاش، نااہل اور بے کردار واقع ہوئے تھے نہ تو انھوں نے سماجی بدحالی کا مقابلہ کیا اور نہ سیاسی افراتفری پر قابو پایا اور نہ ہی مذہبی بگاڑ کی طرف کوئی توجہ دی بلکہ حالات کی سنگینی کو دیکھا تو شتر مرغ کی طرح خواہشات کے ریگستان میں سر چھپا کر بیٹھ گئے اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کا تماشہ دیکھتے اور دکھاتے رہے۔ اس زمانہ میں نہ علماء کی کمی تھی اور نہ صوفیا کی اگرچہ ان حضرات اپنی بساط بھر حالات کی اصلاح کی کوشش کی ہوگی مگر ایسا لگتا ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ اور ہندوستان کا مسلم معاشرہ شکست و ریخت سے بدستور دوچار رہا۔ اسی ماحول اور انہی حالات میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے آنکھیں کھولیں اور اپنے سفر حق کا آغاز کیا واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے بعد ہی ہندی مسلمان ایک نئی زندگی سے لذت آشنا ہوئے، معاصر مورخ عزیز احمد کے بقول شاہ صاحب نے ہندوستان میں عہد وسطی اور عہد جدید کے اسلام میں ایک پل یا رابطہ پیدا کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔[3]

شاہ صاحب کے آبا و اجداد: شاہ صاحب کا شجرہ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔[4] اسی لیے آپ کی بعض تصانیف میں شاہ صاحب کا نام ولی اللہ العمری اور فاروقی لکھا ہے۔[5]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ جلد دوم　[2] ملاحظہ ہو مکتوبات امام ربانی دفتر اول دوم وسوم

[3] Studies in Islamic culture in Indian Environment p 201

[4] انفاس العارفین ص ۱۵۲　[5] ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الرحمٰن، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ

شاہ صاحب کے مورث اعلیٰ شیخ شمس الدین مفتی تقریباً ساتویں صدی ہجری کے وسط میں عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور موجودہ صوبہ ہریانہ کے ضلع روہتک میں اقامت پذیر ہوئے جیسا کہ شاہ صاحب کا بیان ہے "ہمارے اجداد عظام میں سب سے پہلے حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے اور قصبہ روہتک میں سکونت اختیار کی[1] مفتی صاحب ممتاز عالم و عابد تھے ان کی وجہ سے روہتک میں کفر و شرک کا غلبہ کم ہوا اور اسلامی شعائر نے رواج پایا[2] مفتی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے شیخ کمال الدین جانشین ہوئے، وہ بھی اپنے وقت کے ممتاز عالم تھے شیخ کمال الدین کے بعد ان کے صاحب زادے شیخ قطب الدین نے ان کی جگہ لی، اور ان کے بعد بڑے صاحب زادے عبد الملک جانشین مقرر ہوئے، شیخ عبد الملک کو کلام اللہ سے بڑا لگاؤ تھا وہ اکثر اوقات تلاوت قرآن میں مشغول رہتے اور اپنے مواعظ میں عقیدہ توحید اور ارکان اسلام پر زیادہ زور دیتے، انہی کے عہد میں احتساب اور افتاء و قضا کے عہدے اس خاندان کے لیے مخصوص کر دیے گئے[3] ان کی وفات کے بعد قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے جو ایک صاحب دل اور محرم راز شریعت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے وصال پر قاضی قاسم ان کے خلیفہ مقرر ہوئے اور ان کے بعد قاضی قادن[4] نے ولد اکبر ہونے کی بنا پر جانشینی کی، قاضی قادن کے بعد شیخ محمود قاضی مقرر ہوئے مگر انھوں نے اس منصب کو چھوڑ کر حکومت کا دوسرا منصب سنبھال لیا[5] شیخ محمود کے صاحبزادہ شیخ احمد نے ان کے بعد روہتک کو چھوڑ دیا اور اپنے ننہال، سونی پت میں شیخ عبد الغنی بن عبد الحکیم کے ساتھ قیام پذیر ہوئے، شیخ عبد الغنی کی دربار اکبری میں بڑی قدر و منزلت تھی مگر بعد میں یہ تعلقات اکبر کی بے راہ روی کی وجہ سے برقرار نہ رہ سکے، انہی کی صاحبزادی سے شیخ احمد کا نکاح ہوا۔ ایک عرصہ تک شیخ عبد الغنی کے سایۂ تربیت میں رہنے کے بعد شیخ احمد اپنے آبائی وطن روہتک واپس آ گئے[6] ان کے دو صاحبزادے شیخ منصور اور شیخ حسین ہوئے، شیخ منصور کی چار اولاد ہوئیں جن میں سب سے بڑے شیخ معظم تھے اور ان کی بھی تین اولاد تھیں شیخ جمال الدین، شیخ فیروز اور وجیہ الدین۔ شیخ وجیہ الدین کو بھی اللہ نے تین اولاد عطا کیں ابو الرضا محمد، شیخ عبد الرحیم اور شیخ عبد الحکیم شیخ عبد الرحیم ۱۱۳۱ھ علوم عقلیہ و نقلیہ میں جامع ہونے کے ساتھ صاحب نسبت بزرگ تھے، مسلکاً حنفی اور نسبتاً نقشبندی تھے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے معاصر اور ان کی تدوین فقہ کے منصوبہ میں معاون بھی تھے[7] شاہ عبد الرحیم نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سے ایک صاحب زادہ صلاح الدین پیدا ہوئے، دوسری شادی بڑی عمر میں شیخ محمد پھلتی صدیقی کی صاحب زادی سے کی ان سے دو صاحب زادے پیدا

---

[1] انفاس العارفین ص ۱۵۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۵۳ [5] ان کا اصل نام عبد القادر یا قوام الدین تھا، غالباً ہندوؤں نے قادن کے نام سے یاد کرنا شروع کیا انفاس العارفین ص ۱۵۳ [6] ایضاً [7] ایضاً

[8] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۱ حیات ولی ص ۲۷۷، ۲۷۸

ہوئے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ، شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں تفصیل سے آپ نے والد بزرگوار کے اور خاندان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔[1]

شاہ صاحب کی ولادت اور نام:- شاہ صاحب کی ولادت بدھ کے دن ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو صبح کے وقت قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔[2] ولادت کے وقت ان کے والد ماجد کی عمر ساٹھ سال تھی، شاہ صاحب کا تاریخی نام ان کے بعض دوستوں نے "عظیم الدین" نکالا ہے۔ مگر اس سے جو تاریخ نکلتی ہے وہ ۱۱۱۴ھ کے بجائے ۱۱۱۵ھ ہوتی ہے، سنہ ولادت کی اس قمری تاریخ یعنی ۱۱۱۴ھ کو شمسی تاریخ سے تطبیق دی جائے تو دس فروری ۱۷۰۳ء برآمد ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کا مشہور نام ولی اللہ بن عبدالرحیم ہے، اور اسی نام سے اپنے آپ کو انھوں نے اپنی بیشتر کتابوں میں موسوم کیا ہے مگر ان کا دوسرا نام قطب الدین بھی ملتا ہے جس کا تذکرہ انھوں نے خود نوشت سوانح حیات میں کیا ہے، مگر اس نام سے وہ معروف نہیں ہوئے، قطب الدین کی وجہ تسمیہ کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ شاہ عبدالرحیم ایک مرتبہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر گئے، وہاں خواجہ کی روح نے، شاہ عبدالرحیم کے لڑکا تولد ہونے کی بشارت دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کا نام قطب الدین رکھنا مگر ولادت کے وقت یہ بات ذہن سے اتر گئی پھر جب یاد آیا تو دوسرا نام قطب الدین احمد تجویز کیا گیا۔[3] اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعی غلط ہوگا کہ شاہ صاحب پیدائشی طور پر عظیم تھے بلکہ کسی بھی شخص کی عظمت اس کے ذاتی علم و عمل اور دینی وابستگی سے ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت: شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت کا ان کے والد نے خود ہی انتظام کیا تھا، اور اپنی شفقت و محبت اور دینی حمیت کے زیر سایہ ان کی نشوونما کی تھی، مگر جیسا کہ دستور ہے شاہ صاحب پانچ برس کے تھے تو ان کو مکتب میں داخل کیا گیا۔[4] سات سال کی عمر میں ختنہ ہوا اسی سال سے نماز کی عادت ڈالی گئی اسی سال قرآن کریم کے حفظ سے فارغ ہوئے اور عربی و فارسی کی مختصر کتابیں شروع کیں، دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی، چودہ سال کی عمر میں بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا اور پندرہ سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فراغت حاصل کرلی۔[5] اسی سال نقش بندیہ سلسلہ کے مطابق والد ماجد سے بیعت کی اور تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوئے۔[6] شاہ صاحب کی اس رفتار تعلیم سے اندازہ لگایا

---

[1] یہ کتاب انفاس العارفین میں شامل ہے۔ [2] انفاس العارفین ص۱۹۳ [3] نزہتہ الخواطر ۲/۳۹۸

[4] انفاس العارفین ص۱۹۲ [5] ایضاً۔ [6] ایضاً۔

جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر ذہین اور ذکی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی صلاحیت اور طبعی فطانت سے نوازا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ کمسنی میں زیادہ علم حاصل کر لینے کے قابل ہو گئے تھے[1] شاہ صاحب نے درسیات کی جو کتابیں پڑھی تھیں وہ حسب ذیل ہیں، تفسیر میں مدارک التنزیل اور تفسیر بیضاوی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، بخاری اور شمائل ترمذی۔ فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (بجز چند ابواب)، اصول فقہ میں حسامی اور توضیح و تلویح کا بڑا حصہ، منطق میں شرح شمسیہ اور ایک حصہ شرح مطالع کا، علم کلام میں شرح عقائد حاشیہ خیالی کے ایک حصہ کے ساتھ اور کچھ حصہ شرح مواقف کا، سلوک میں عوارف المعارف اور رسائل نقشبندیہ کا ایک حصہ، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح اللمعات، مقدمہ نقد النصوص خواص اسما وآیات میں الفوائد الماۃ وغیرہ طب میں موجز القانون اور حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ۔ معانی میں مطول کا بڑا حصہ اور مختصر المعانی ہیئت اور حساب میں بعض مروجہ رسائل[2]

شاہ صاحب نے والد ماجد کے علاوہ شیخ افضل سیالکوٹی سے بھی حدیث میں استفادہ کیا اور والد کی وفات کے بعد ۱۲ سال تک دینی اور عقلی علوم کا ہندوستان میں درس دیا، اور ان علوم میں غور و خوض کرتے رہے۔

زیارت حرمین اور اکتساب حدیث: شاہ صاحب نے ہندوستان میں مروجہ علوم کی تکمیل کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا قصد کیا، اور سفر پر روانہ ہو گئے مگر ساحل سورت پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ حجاج کے جہاز روانہ ہو چکے ہیں اس لئے آپ نے چند روز شہر کھمبایت میں قیام کیا اور دہلی واپس آ گئے[3] اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی دس سال آپ نے مزید درس و تدریس اور مطالعہ میں صرف کئے، ۱۱۴۳ھ میں اپنے ماموں شیخ عبداللہ بارہوی اور ماموں زاد بھائی محمد عاشق وغیرہما کے ساتھ گجرات کے راستے حجاز پہونچے۔ ذی الحجہ ۱۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہوئے اور مدینہ منورہ کی زیارۃ کی وہاں حاکم محدث وقت شیخ ابوطاہر مدنی سے بخاری شریف مکمل اور مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ، موطا امام مالک مسند احمد اور جامع کبیر غیر مکمل پڑھی، مسجد نبوی میں محراب عثمانی کے سامنے، مسند دارمی کی سماعت کی، امام شافعی کا رسالہ، الادب المفرد اور قاضی عیاض کی شفا کے کچھ حصے پڑھے اور شیخ ابوطاہر سے کتب حدیث کی اجازت لی۔ پھر مکہ آئے اور دوبارہ ۱۱۴۴ھ میں حج کعبہ کی سعادت حاصل کی شیخ وفد اللہ مالکی سے موطا امام مالک پڑھی۔ اور تاج الدین قلعی

---

[1] شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد جیسا قوی الحفظ نہیں دیکھا سننے کا تو انکار نہیں کر سکتا لیکن آنکھ سے نہیں دیکھا، ملفوظات ص ۱۱ [2] انفاس العارفین ص ۱۹۵-۱۹۴ [3] ایضاً

کے درس بخاری میں شریک ہوئے[1]۔ شاہ صاحب نے حرمین کے جن دیگر علماء سے استفادہ کیا ان میں شیخ حسن عجیمی اور احمد نخلی، عبداللہ بصری وغیرہ قابل ذکر ہیں[2] اس طرح حج کعبہ اور علم حدیث کی تحصیل کے بعد شاہ صاحب نے وطن لوٹنے کا فیصلہ کیا چلتے وقت اپنے شیخ ابوطاہر مدنی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا

نسیت کل طریق کنت عرفہ الا طریقا یودینی الی ربعکم[3]

۱۱۴۵ھ کے اوائل میں عازم سفر ہوئے اور ۱۰ رجب ۱۱۴۵ھ کو بحسن و خوبی دہلی پہنچ گئے۔ ہندوستان پہنچ کر انھوں نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور اصلاح وارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا۔

شاہ صاحب کے اخلاق وعادات:-

شاہ صاحب بچپن ہی سے ذہین اور محنتی ہونے کے ساتھ سنجیدہ باوقار اور رنیک طینت تھے، شاہ صاحب کی زندگی پر ان کے والد عابد کا گہرا اثر تھا، اور انہی کی تربیت نے شاہ صاحب کو ایک خاص طریقہ پر زندگی گذارنے کا عادی بنا دیا تھا۔ شاہ صاحب، اپنا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ میں ہم نشینوں کے ساتھ باغ کی سیر کو چلا گیا واپس آیا تو والد نے پوچھا تم نے اس دن رات میں کیا حاصل کیا۔ جو باقی رہے؟ ہم نے اس مدت میں تو اتنا درود پڑھا، یہ سن کر میرا دل سیر و تفریح سے بے نیاز ہو گیا[4] شاہ صاحب تہذیب وشائستگی اور والدین کی اطاعت میں بھی ممتاز تھے اور سادگی و نفاست پسند ہونے کے ساتھ نازک طبع اور منکسر المزاج بھی تھے، فضول خرچی وغیرہ سے دور رہتے، ان کے بیشتر اوقات کتب بینی، تعلیم و تربیت اور مجاہدہ میں بسر ہوتے۔ شاہ صاحب اپنے فرائض منصبی سے غافل نہیں ہوئے، علوم و کمالات میں اشتغال کے علاوہ بلندئ وقت میں بے نظیر تھے۔ اشراق کے بعد بیٹھتے تو دوپہر تک مسلسل بیٹھے رہتے اور علمی کام میں مشغول رہتے، صوفیانہ اشعار بہت کم پڑھتے تھے[5] گویا شاہ صاحب کی زندگی ایک منظم اور مستعد شخصیت کا نمونہ تھی۔

ازدواج واولاد:

شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی اس وقت ہوئی جب ان کی عمر صرف ۱۴ چودہ سال تھی، اس عمر میں شادی کرنے کی وجہ شیخ عبدالرحیم کی خواہش اور اصرار تھا، حالانکہ شاہ صاحب کے سسرال کے لوگ عذر کر رہے تھے اور اتنی جلد شادی کرنا نہیں چاہتے تھے، مگر شاہ عبدالرحیم نے اسے خلاف مصلحت قرار دیکر فوری طور پر نکاح کر دینے کا مشورہ دیا جسے بالآخر ان حضرات کو تسلیم کرنا پڑا[6]۔ چونکہ شیخ عبدالرحیم کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اس لیے ہر باپ کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کے بیٹے کی شادی ہو جائے

---

[1] انفاس العارفین صہ ۱۹۵ [2] شاہ صاحب نے انسان العین فی مشائخ الحرمین میں ان اساتذہ کے حالات تحریر کئے ہیں یہ رسالہ بھی انفاس العارفین میں شامل ہے [3] مکتوب بنام ابراہیم مدنی، مشمولہ حیات ولی صہ ۵۱۰ [4] ملفوظات صہ ۳۲ [5] انفاس العارفین صہ ۱۹۳

شاہ صاحب کی یہ شادی ان کی ماموں زاد بہن یعنی شیخ عبید اللہ صدیقی کی صاحب زادی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے ایک صاحب زادہ شیخ محمد پیدا ہوئے جن کے نام پر شاہ صاحب اپنی کنیت ابو محمد کرتے تھے، شاہ صاحب نے خود ہی ان کی تعلیم و تربیت کی۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد وہ قصبہ بڑھانا منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی۔

شاہ صاحب کی دوسری شادی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ہوئی۔ یہ دوسری بیوی سید ثناء اللہ سونی پتی کی صاحب زادی بی بی ارادت تھیں، ان کے بطن سے چار صاحب زادے، عبدالعزیزؒ[1]، رفیع الدینؒ[2]، عبدالقادرؒ[3] اور عبدالغنیؒ[4]۔ اور ایک صاحب زادی امۃ العزیز پیدا ہوئیں، امۃ العزیز کا نکاح مولوی محمد فائق بن مولانا محمد عاشق پھلتی سے ہوا، شاہ صاحب کے چاروں صاحب زادے ان کے سچے جانشین اور ان کی تحریک کے داعی اور مبلغ ثابت ہوئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہندوستان کی نشاۃ جدیدہ کے علمبردار ہوئے۔

شاہ صاحب کی وفات:- شاہ عبدالعزیزؒ کے بیان کے مطابق شاہ صاحب کی وفات ۲۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ کو ظہر کے وقت ہوئی، تاریخ وفات اس جملہ سے نکلتی ہے "او بود امام اعظم دیں"۔ ۱۱۷۶ھ

اور اس شعر سے بھی " ہائے دل روزگار رفت ہاو بست نہم محرم وقت ظہر"[5]

شاہ صاحب نے کل باسٹھ سال کی عمر پائی، شاہ صاحب کے جسد خاکی کی تدفین مہندیان میں ہوئی جہاں ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم کی قبر ہے اور بعد میں شاہ صاحب کے صاحب زادگان بھی وہیں مدفون ہوئے۔ یہ قبرستان دہلی کے منتخبہ علماء صلحاء، ادباء اور شعراء کی آرام گاہ ہے، یہاں آج ایک مدرسہ بھی رحیمیہ کے نام سے قائم ہے۔ جو شاہ صاحب کے خواب گاہ کی حفاظت کے ساتھ ان کی علمی وراثت تقسیم کر رہا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:- یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غلط فہمی کی نشاندہی کی جائے جو بعض اہل علم کو شاہ صاحب کے متعلق ہوئی ہے وہ یہ کہ ولی اللہ کے نام سے ایک اور عالم دین گذرے ہیں جن کو تفسیر قرآن، تصوف اور شاعری میں بڑا درک حاصل تھا انھوں نے بھی قرآن کریم کی

---

[1] ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے تاریخی نام غلام حلیم ہے سراج الہند ان کا لقب ہے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی علمی ورثہ میں تحفہ اثنا عشریہ، فتح العزیز، عجالہ نافعہ جیسی متعدد کتابیں چھوڑیں۔ [2] بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ ترجمہ قرآن (اردو) دمغ الباطل، کتاب التکمیل وغیرہ ان کی علمی یادگار ہیں۔ ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی۔ [3] مشہور مترجم قرآن (اردو) موضح القرآن اکبرآبادی کی مسجد میں مدۃ العمر درس و تدریس میں مشغول رہے ۱۲۳۲ھ میں وفات پائی۔ [4] ان کا انتقال سب بھائیوں سے پہلے ہوا اس لئے ان کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکے۔ نزہتہ الخواطر ۷/ ۲۶۸، ۳۰، ۲۷، ۳۸۰ و نیز تذکرہ علماء ہند ص ۱۲۲، ۱۲۹، ۶۶۔ [5] ملفوظات ص ۱۲

یہ رکھی تھی، اس لیے بعض حضرات کو نام سے دھوکہ ہوا اور دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا گیا۔ —————

————— حالانکہ یہ ولی اللہ اپنا تخلص اشتیاق رکھتے تھے، شیخ عبدالاحد
اولاد میں سے تھے اور فیروز شاہ کوٹلہ میں رہتے تھے ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ اور شاہ صاحب اپنا تخلص امین
تے تھے۔ اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔[1]

قرآن کریم سے شغف:۔ شاہ صاحب کو قرآن کریم سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وراثت میں ملا تھا، کیونکہ ان کے والد شیخ عبدالرحیم کو بھی قرآن کریم سے بے حد شغف تھا،
ہ صاحب اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ "آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقہ میں ہر روز قرآن مجید کے
یا تین رکوع پڑھتے اور اس پر نہایت تدبر کرتے اور ان کے معانی پر غور و خوض فرماتے۔"[2] وہ قرآن کریم کے علمی نکات اور
رد معد کو بڑے تبحر علمی کے ساتھ بیان کرتے جسے سن کر ماہرین فن حیرت زدہ رہ جاتے۔[3] شاہ صاحب کو اپنے والد ماجد
بحبت و تربیت سے قرآن کریم کا ذوق پیدا ہوا اور اس سے استفادہ کی وجہ سے شاہ صاحب پر قرآن فہمی کی راہیں کھلیں،
شاہ صاحب کا بیان ہے کہ "خدا تعالیٰ نے مجھ ضعیف پر جو بڑے بڑے الطاف کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ
ے چند بار والد بزرگوار سے تدبر معانی، شان نزول کے بیان اور تفاسیر میں مطالب کی تحقیق کے ساتھ قرآن عظیم
پڑھنے کا موقع ملا، اس کی وجہ سے مجھ پر علم و عرفان کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا۔[4] شاہ صاحب کو قرآن سے
لگاؤ پیدا ہوا تھا اس کو وہ اللہ کی نعمت سمجھتے تھے اور اس قدر اسے اہمیت دیتے تھے کہ گویا وہ ان کی زندگی کا حاصل
صود تھا اسی لئے بار بار انھوں نے اس نعمت کا اظہار ضروری سمجھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں " اس بندہ ضعیف پر اللہ تعالیٰ کی بے
ر نعمتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی، اور حضرت
سالت پناہؐ کے احسانات اس کمترین امت پر بہت ہیں جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے آنحضرت صلی اللہ
ہ وسلم نے قرآن کریم کی تلقین قرن اول کو فرمائی اور انھوں نے قرن ثانی تک پہونچائی اس طرح درجہ بدرجہ اس خاکسار کو بھی
ں کی روایت اور درایت سے حصہ ملا۔[5]

دوسری جگہ اس طور پر اس نعمت کا اظہار کرتے ہیں

" اس فقیر کو الحمد للہ ان تمام فنون (تفسیر) میں خاص مناسبت حاصل ہے اور علوم تفسیر کے اکثر اصول اور ایک معقول
نمار اس کے فروع کی معلوم ہے اور اس کے ہر فن میں اجتہاد فی المذہب کے قریب قریب تحقیق و استقلال حاصل ہو گیا ہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ۶/ ۹۸-۲۹۷ [3] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۵ [4] حیات ولی ص۲۶۷

[5] انفاس العارفین ص۱۹۴ [6] الفوز الکبیر، مقدمہ

ان کے علاوہ فنون تفسیر کے دو تین اور فن بھی فیض الٰہی کے بحر بیکراں سے القا ہوئے ہیں اگر سچ پوچھنا ہے تو میں قرآن مجید کا بلا واسطہ ایسا ہی شاگرد ہوں جیسا کہ روح پر فتوح حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا، اویسی ہوں اسی طرح کعبہ حسنیٰ سے بے وسیلہ مستفید اور صلوٰۃ ظلی سے اثر پذیر ہوں۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرۃ لسانا

لما استوفیت واجب حمدہ[1]

شعری ذوق:۔ شاہ صاحب کو اللہ نے ذوق لطیف بھی عطا کیا تھا، اور شعر گوئی پر قدرت عطا کی تھی شاہ صاحب عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور جیسا کہ دستور ہے کہ شعراء اپنا تخلص بھی رکھتے ہیں اس لئے شاہ صاحب نے بھی اپنا تخلص امین رکھا تھا، ان کی شاعری کا ایک دیوان شاہ عبد العزیز[2] نے جمع کیا اور شاہ رفیع الدین نے اسے ترتیب و تہذیب عطا کی[3] شاہ صاحب کی شاعری کا ایک دوسرا مجموعہ جو نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے۔ اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم کے نام سے موجود ہے[4] شاہ صاحب کا شعری ذوق صاف ستھرا ہے، الفاظ کے انتخاب کے ساتھ معنی آفرینی اور حسن خیال بھی پایا جاتا ہے۔ عربی اشعار کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

کان نجوما اومضت فی الغیاھب	عیون الافاعی اوروس العقارب
اذا عان قلب المرأفی الامرضائرا	فاضیق من تسعین رحب السباسب
وتعلی عی دعن کل راحتی	مصائب تقفومثلھا فی المصائب
اذا ما اتتنی ازمۃ مدلھمۃ	تحیط بنفسی من جمیع جوانب
طلبت ھل من ناصر اومساعد	الوربہ من خوف سوء العواقب

فارسی اشعار کے کچھ نمونے حسب ذیل ہیں۔

زلف پیچ در پیچ کے گم گردہ ام خودرا	خروش در دل شبہائی کردم چہ می کردم
دلے پر درد جان افگار یارتنہ خودارم	جہاں را پر زیا ربہائی کردم چہ می کردم
غم تحصیل و اشغل و ورد غزل بیتم	جنون ترک منصبہائی کردم چہ می کردم
پئے تحقیق را از خم سر بہا برون دیدم	خروج از قید مشربہائی کردم چہ می کردم
محاب وصل مطلوب است دل بستن طلبہا	امین گر ترک مطلبہائی کردم چہ می کردم[5]

---

[1] السور الکبیر، ص ۲ [2] اس مجموعہ کا ایک مخطوطہ دار العلوم ندوۃ العلما کی لائبریری میں موجود ہے

[3] یہ مجموعہ مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا تھا۔

[4] حیات ولی، ص ۵

دستور ہند اور اقلیتی تعلیم

جناب محمد حبیب الدین احمد، جامعہ دارالہدیٰ حیدرآباد

ملت اسلامیہ کا مستقبل اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور کسی ملت کے مستقبل کے معمار اس کے طلبا ہوا کرتے ہیں اس لیے ان کی ذہنی تربیت اور صلاحیتوں کی نشو ونما، ان میں اپنے نصب العین کے شعور کی بیداری اور انھیں ملک کے باوقار شہری بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں اس نظام تعلیم کے مضر اثرات سے بچایا جائے جس کی بنیادیں مادہ پرستی اور ملحدانہ نظریات پر رکھی گئی ہیں اور اس کے برعکس ایک ایسا نظام تعلیم و تربیت تشکیل دیا جائے جو خدا اور رسول پر ایمان اور ان کے دین پر استوار ہو لیکن سرکاری تعلیم گاہوں کے خدا فراموش اور مادہ پرستانہ ماحول اور اس غلط نظام تعلیم و تربیت کے نتیجے میں عقیدہ اور مقصد کی حرارت سے خالی ایسے بے حمیت اور پست حوصلہ نوجوان تیار ہو رہے ہیں جو کسی بلند مقصد حیات کے خادم نہیں بن سکتے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی اہم اور سنگین مسئلہ ہے تو بس یہ کہ موجودہ تعلیم و تربیت کے نظام میں وہ کون سی اصلاحات کی جائیں اور ذرائع اختیار کئے جائیں کہ ہماری آنے والی نسلیں اسلامی عقیدے پر قائم رہیں اور اسلامی روایات کی حامل بنیں اور ان کو ایسی تعلیم ملے جس کی بنا پر وہ زندگی کی دوڑ میں تیری وصحت مندانہ مسابقت کر سکیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہو تو دوسرے ہاتھ میں عصری علوم وفنون ہوں تاکہ وہ متوازن طرز فکر اور استقلال عمل کے ساتھ صراط مستقیم پر اپنے سفر کو جاری رکھ سکیں اور دنیا کو ایک نئے انقلابی نظام تعلیم و تربیت سے روشناس کر سکیں۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور ہماری آنے والی نسلیں عقیدہ اور فکر وعمل کے اعتبار سے مسلمان رہ سکتی ہیں۔ اگر اس مسئلہ پر توجہ نہ دی گئی اور اس کا بروقت تحفظ نہیں کیا گیا تو ہماری آنے والی نسلوں کو الحاد اور لادینی افکار ونظریات کی یورش سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔

ہم جس ملک کے شہری ہیں وہ ایک سیکولر ملک ہے۔ اس کے دستور میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا یعنی حکومت کسی فرقے کی مذہبی تعلیم کا انتظام اپنی سرپرستی میں نہیں کرے گی۔ دستور ہند کی دفعہ (۱) میں تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آرٹیکل ۳۰ (۲) میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ امداد دینے

کے معاملے میں حکومت اقلیتی تعلیمی اداروں کے خلاف کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔ اس آئینی اعلان کے بعد کسی فرقے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے خیالات، عقاید اور افکار کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے حکومت کے ذرایع ووسائل یا حکومت کی مشنری کو کام میں لائیں۔ دستور میں اس بات کی کھلی آزادی ہے کہ ہر فرقے اور مذہب کے لوگ اپنے بچوں کو اپنے پسندیدہ عقاید کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ مذکورہ لادینی ماحول اور حکومت کے سیکولر ہونے کی اس صورت حال نے ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے تاکہ وہ اپنی نسلوں کو اسلام پر قائم رکھنے اور ان کو اسلامی تعلیم وتربیت دینے کے لیے خود اپنے مدارس قائم کریں۔ لیکن اقلیتوں کو دستور ہند کے عطا کردہ یہ بنیادی حقوق بھی بعض طبقوں کو کھٹکنے لگے ہیں۔ وقتاً فوقتاً حکومت کے بعض حلقوں اور گوشوں کی طرف سے اس دفعہ میں ترمیم یا تجدید کے ذریعہ اقلیتوں کو ان کے اس بنیادی حق سے بھی محروم کرنے کی مذموم کوششیں کی جارہی ہیں۔ چنانچہ اس تعلق سے حکمراں طبقے کے بیانات اور ان کے اختیار کردہ رویہ اور رجحانات سے بھی ان شبہات کو تقویت ملتی ہے۔

آرٹیکل ۳۰ (۱) کی توضیح وتشریح میں سپریم کورٹ کے لائق ججوں نے اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں فرمایا:

"ظاہر ہے کہ اقلیتیں یہ چاہتی ہیں کہ ان کے فرقے کے بچوں کو تعلیم ایسے ماحول میں دی جائے جو ان کی اپنی مخصوص تہذیب کی ترقی کے لیے ساز گار ہو۔ دستور بنانے والوں نے اقلیتوں کے اس حق کو تسلیم کیا اور اس کے خطرات کو دور کرنے کے لیے آرٹیکل ۲۹ اور ۳۰ میں ان کو بنیادی حقوق دیئے"

اور سپریم کورٹ کی بنچ کے اپنے فیصلہ شائع شدہ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۶۳ء میں اس سلسلے میں اپنا فیصلہ حسب ذیل میں دیا (اردو ترجمہ)

"آرٹیکل ۳۰ (۱) میں جو بنیادی حق دیا گیا ہے وہ قطعی ہے۔ آرٹیکل ۱۹ میں حق آزادی کے بنیادی حق پر خلاف آرٹیکل ۳۰ (۱) میں دیئے ہوئے حق پر معقول پابندیاں نہیں عائد کی جاسکیں۔ اس بنیادی حق کا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا حق ہے۔ یہ حق موثر ہونا چاہئے اور کسی ایسے قانون یا ضابطے کے ذریعہ جو اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے مفاد میں نہیں بلکہ عوام اور ملک کے مفاد کے لیے بنایا گیا ہو ختم ہونا چاہئے"

ان فیصلوں کے بعد یہ توقع کی جاتی تھی کہ تعلیمی پالیسی متعین کرنے والے حضرات حقیقت پسندی سے کام لیں گے۔ دستور ہند میں دیئے ہوئے بنیادی حق اور اس سلسلے میں ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ کے دیئے فیصلوں کا احترام کریں گے مگر جب ہم مندرجہ بالا نظائر کی روشنی میں حکومت کی قائم کردہ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ دیکھتے ہیں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ ہو یا پڑوسی اسکولوں کا یا پرائیوٹ تعلیمی اداروں کا ان سب میں اقلیتوں کے حقوق کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ذریعۂ تعلیم:۔ پہلے ذریعۂ تعلیم ہی کے مسئلے کو لے لیجئے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ کے پیراگراف ۵ صفحہ ۱۲ میں ہندوستان کی تمام جدید زبانوں کی اہمیت اور ترقی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ سائنٹفک اور ٹکنیکل معلومات عوام کی زبان میں ان تک آسانی سے پہنچائی جا سکتی ہیں۔ پیراگراف ۱۵ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ذریعۂ تعلیم طلبا کی مادری زبان ہونا چاہئے تاکہ طلبا کو حصول علم میں اور اس کے اظہار میں سہولت ہو۔ اس سلسلے میں رپورٹ میں رابندر ناتھ ٹیگور کے اس خطبے کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس میں موصوف نے فرمایا تھا: (اردو ترجمہ)

"پوری دنیا میں ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جس میں ذریعۂ طلبا کی مادری زبان نہیں ہے۔"

اس حوالے کا مقصد مادری زبان میں ذریعۂ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرانا ہی ہو سکتا ہے۔ مگر پیراگراف کے آخر میں ذریعۂ تعلیم کے بارے میں سفارش کرتے وقت الفاظ" مادری زبان" کے بجائے علاقائی زبان استعمال کئے گئے اور یہ سفارش کی گئی کہ تعلیم کی اعلیٰ سطحوں تک ذریعۂ تعلیم علاقائی زبانوں میں ہو۔ آپ نے دیکھا کہ کس ہوشیاری سے اردو کا پتہ کاٹ دیا گیا۔ اگر الفاظ مادری زبان رہے ہوتے تو بہت سے اسکول اور کالجوں میں اردو ذریعۂ تعلیم ہو جاتی علاقائی زبان کی تعریف میں اردو نہیں آتی۔ دستورِ ہند کے شیڈول (۸) میں جتنی زبانیں دی ہوئی ہیں ان سب کو کسی نہ کسی علاقہ میں علاقائی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے مگر اردو کو ملک کے کسی حصہ میں حتیٰ کہ یوپی اور بہار میں بھی علاقائی زبان تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس طرح ریاستوں کے وزرائے تعلیم کی کانفرنس منعقدہ اگست ۱۹۴۹ء میں ذریعۂ تعلیم کے بارے میں جو فارمولہ طے ہوا تھا اور جس کی رو سے ہر اس ثانوی اسکول میں جس میں اردو کے طلبا کی تعداد ⅓ یا زیادہ ہو اردو ذریعۂ تعلیم ہو سکتی تھی اسے مسترد کر دیا گیا۔

پڑوسی اسکول یا مشترک اسکول:۔ اس اسکیم کے پس پردہ مخصوص غرض و غایت معلوم ہوتی ہے۔ دستورِ ہند کی آرٹیکل ۲۹ (۲) میں واضح ہدایت موجود ہے کہ کسی شہری کو مذہب، نسل، برادری زبان یا ان میں سے کسی ایک وجہ کی بنا پر کسی سرکاری تعلیمی ادارے اور ایسے نقلی ادارے میں جسے سرکار سے امداد ملتی ہو داخلے سے روکا نہیں جا سکتا۔ پورے ملک میں اس پر عملاً آمد بھی ہے۔ اس کے بعد پڑوسی اسکولوں کے قیام کی سفارش اور پیراگراف ۱۰/۱۸ صفحہ ۲۵۷ میں حسب ذیل تشریح:

"ہر پڑوسی اسکول میں اس حلقہ کے تمام طلبا کا داخلہ ضروری ہوگا خواہ ان کا تعلق کسی مذہب، نسل برادری یا فرقے سے ہو۔"

کے معنی صرف ایک ہی ہوسکتے ہیں کہ تمام پرائیوٹ تعلیمی ادارے جن میں بڑی تعداد اقلیتی تعلیمی اداروں کی ہوگی ختم ہو جائیں. جہاں تک اقلیتی تعلیمی اداروں کا تعلق ہے دستور نے اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے کا حق دیا ہے لہٰذا اس کو براہ راست ختم کرنے کا قانون نہیں بنایا جا سکتا لہٰذا پڑوسی اسکول کی اسکیم کے ذریعہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو ختم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے.

پرائیوٹ تعلیمی اداروں کا رجسٹریشن :- پرائیوٹ تعلیمی اداروں کا کردار بدلنے اور ان کو حکومت کی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے کمیشن نے پیراگراف ۱۰/۸۰ صفحہ ۲۷۲ میں بڑی خطرناک سفارشات کی ہیں. طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پیراگراف ۱۰/۷۷ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ دستور ہند کی آرٹیکل ۳۰ کے تحت اقلیتوں کو حق ہے کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں. پیراگراف ۱۰/۸۰ میں ان اسکولوں کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہوئے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ .

" دستور کی رو سے ان کے قیام کو روکا نہیں جا سکتا ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو حکومت سے نہ تو امداد چاہتے ہیں اور نہ منظور کرانا چاہتے ہیں لہٰذا ریاستی حکومت کا شعبہ تعلیم ایسے تعلیمی اداروں کو کنٹرول نہیں کر سکتا لیکن غالباً اب وقت آگیا ہے کہ فائنل ضابطہ کے لیے پہلا قدم اٹھایا جائے. یہ مناسب ہوگا کہ تمام تعلیمی اداروں کے لازمی رجسٹریشن کے لیے قانون بنایا جائے اور غیر رجسٹرڈ تعلیمی اداروں کا چلانا جرم قرار دیا جائے."

آپ نے دیکھا کہ کس طرح دستور ہند کی آرٹیکل ۳۰ میں دئے ہوئے بنیادی حق کو پامال کرنے کے لیے سفارش کی گئی ہے. اسے ہی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ ریاستی حکومتوں کو رجسٹریشن منسوخ کرنے کے لیے جو سفارش کی گئی ہے. اس میں دئے ہوئے وجوہات انتہائی مضحکہ خیز ہیں.

کمیشن کی سفارشات کے بموجب حسب ذیل وجوہات یا ان میں سے کسی وجہ کی بنا پر ریاستی حکومت کو رجسٹریشن منسوخ کرنے کا اختیار ہوگا

(۱) اسکول کی عمارت یا اس کا کوئی حصہ اسکول کے لیے مناسب نہیں ہے. (۲) طلباء کی تعداد، عمر اور جنس کو دیکھتے ہوئے عمارت میں گنجائش کم ہے. (۳) مناسب اور معقول تعلیم کا بندوبست، طلبا کی عمر، تعداد اور جنس کو دیکھتے ہوئے نہیں ہے (۴) اسکول کا مالک یا اس کا کوئی ٹیچر ایک آزاد اسکول کے لیے مناسب نہیں ہے.

اندازہ لگائیے ان وسیع اختیارات کا جن کی بنا پر ریاستی حکومت کسی بھی تعلیمی ادارے کا رجسٹریشن منسوخ کر سکتی ہے خصوصاً دفعہ ۴ پر غور کیجئے. اسکول کے مالک کے مناسب ہونے کی شرط کتنی نامعقول ہے. اس طرح اساتذہ کی صلاحیت کا معیار مقرر کرنا تو کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے حالانکہ ان اقلیتی تعلیمی اداروں میں جو حکومت سے امداد نہیں چاہتے اور نہ اسکول کو منظور کرانا چاہتے ہیں حکومت کے لیے کوئی جواز اساتذہ کا معیار مقرر کرنے کا نہیں ہے مگر

یہاں الفاظ بجائے "صلاحیت" کے " مناسب استعمال کیے گئے ہیں۔

اگر کوٹھاری کمیشن کی مندرجہ سفارشات پر عمل درآمد ہوا تو پھر کوئی تعلیمی ادارہ خواہ وہ خالص دینی تعلیم کا ادارہ ہو تو پھر کوئی تعلیمی ادارہ خواہ وہ خالص دینی تعلیم کا ادارہ ہو حکومت کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سارے تعلیمی اداروں کو حکومت کی مرضی کے مطابق چلنا ہوگا۔ یہ سفارشات نہ صرف دستور ہند میں دیئے ہوئے حقوق کے منافی بلکہ سپریم کورٹ کے فیصلوں کے سراسر خلاف ہیں۔ اب اقلیتوں کو یہ سوچنا ہے کہ وہ دستور ہند کی آرٹیکل ۳۰ میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کا تحفظ کس طرح کریں۔ ۱۸

جمہوریت کا ڈھونگ رچانے والوں کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ جو کچھ حقوق، مراعات یا تحفظات وہ اقلیتوں کو دستور کے ذریعہ دیتے ہیں پھر انھیں وہ قانون یا عاملانہ احکامات کے ذریعہ واپس بھی لیتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے شعور کو اس تعلق سے بیدار کیا جائے اور انھیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ وہ اس وقت اس دفعہ میں ترمیم یا تجدید کی صورت میں کتنے عظیم خطرہ سے دوچار ہیں، ہندوستان کے ایک وفادار شہری ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ اس ملک کے دستور کو رسوا ہونے سے بچائیں۔ ہم حکومت پر بھی صاف الفاظ میں یہ ضرور واضح کردیں کہ مسلمان اپنے بنیادی حقوق میں کسی قسم کی مداخلت اور حق تلفی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم ایک طرف اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا بند وبست بھی کرتے رہیں اور دوسری برادران وطن کو معقولیت اور سنجیدگی کے ساتھ اس امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے اس بنیادی حق سے محروم کرنے کی کوشش کس قدر نامنصفانہ اور دستور ہند کے منافی اور خود ملک کے لیے نقصان دہ ہے، اور جو ہم اپنا تعلیمی نظام چلا رہے ہیں وہ نہ کسی فرقہ کی مخالفت ہے نہ وطن دشمنی بلکہ اس سے حقیقتاً تمام فرقوں میں اعتماد پیدا ہوگا اور ملک کی جمہوریت اور سیکولر کردار کو طاقت ملے گی۔

ان نازک حالات میں ہماری ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی جدوجہد کو تیز تر کردیں۔ ہماری اس جدوجہد کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک منفی دوسرا مثبت۔

جدوجہد کا منفی پہلو یہ ہے کہ سرکاری نصاب تعلیم میں جو اسباق و مضامین اسلام کے بنیادی عقاید کے خلاف ہیں ان کی اصلاح کے لیے حکومت سے مطالبہ کیا جائے اور دستور ہند کے فیصلے کے مطابق نصاب تعلیم کو سیکولر بنانے کی ہر ممکن آئینی کوشش کی جائے۔ جہاں مسلمان طلبا مطلوبہ تعداد پوری کرتے ہوں ان کی مادری زبان میں تعلیم دلانے کی کوشش کی جائے۔ مسلم طلبا و طالبات کو ایسی غیر نصابی مشغولیتوں میں حصہ لینے سے روکیں جو اسلامی اقدار کے منافی ہوں۔ یہ کوششیں سب ضمنی قسم کی ہیں اور ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اصل ضرورت تو مثبت کوششوں کی ہے۔ اس سلسلے میں پہلا کام جو کرنا ہے وہ مسلمانوں کے آزاد تعلیمی اداروں کا قیام ہے یعنی ملک

میں نہ صرف آزاد پرائمری مکاتب کا جال بچھا دیا جائے بلکہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں قائم کی جائیں۔ ان نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے ساتھ ہمیں اس بات پر توجہ دینا چاہئے کہ اس وقت مسلمانوں کے جو تعلیمی ادارے پہلے سے موجود ہیں ان کی حالت بہتر ہو اور وہ مسلمانوں کی بے توجہی کا شکار ہو کر ٹھٹھرنے نہ لگیں۔

سرکاری تعلیم گاہوں میں پڑھنے والے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے صباحی و شبینہ مدارس قائم کئے جائیں جہاں مسلمان بچوں کو قرآن شریف پڑھایا جائے، بنیادی عقاید اور دین کے بارے میں ضروری معلومات ان کو دی جائیں اور ان مکاتب میں اردو ضرور پڑھائی جائے لیکن حقیقت کے اعتبار سے ایسے مکاتب سیلاب کے مقابلے میں ریت کی دیوار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اس لیے کہ تمام دن بچے اسکولوں میں اسلام کے منافی اسباق پڑھیں گے، ان کو حفظ کریں گے اور جب وہ ان صباحی اور شبینہ مدرسوں میں دین کی کتابیں پڑھیں گے تو خام ذہنی کی وجہ سے یہ متضاد تعلیم ان کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر سکتی ہے۔

ان حالات میں جو تجویز سب سے زیادہ ٹھوس اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے وہ یہی کہ ملک میں نہ صرف ثانوی بلکہ اعلیٰ تعلیمی درسگاہیں قائم کی جائیں جو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو کتاب و سنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم، سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم بھی دے سکیں تاکہ وہ معاد کے ساتھ ساتھ معاش کے معاملے میں بھی عام تعلیم یافتہ لوگوں سے پیچھے نہ رہیں۔

اس جامعات یا اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں کا اپنے نصاب تعلیم کی بنیاد پر سرکاری جامعات جیسے جامعہ ملیہ یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں سے الحاق کیا جا سکتا ہے۔ دینی تعلیم کے تعلق سے مسلمانوں کا جو حال ہے وہ نہایت درجہ افسوس ناک ہے۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی مہنگی تعلیم کو وہ نہایت خوشی سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن ان دینی درس گاہوں میں مفت تعلیم کا انتظام کیجیے جب بھی اپنے بچوں کو نہ بھیجیں گے جو لوگ دینی طرز کی درسگاہیں چلا رہے ہیں ان کو اس سلسلے میں نہایت تلخ تجربات پیش آ رہے ہیں۔ اولاً اس قسم کی درس گاہوں کے لیے طلبا نہیں ملتے اور جو ملتے ہیں وہ آخر تک نہیں ٹھہرتے۔ یہ مدارس اپنے غیر سرکاری نصاب کی وجہ مسلمہ سرکار نہیں اس لیے ان درس گاہوں کی سندیں ان کو سرکاری ملازمت کے حصول میں کام نہیں دیتیں۔ بقول اکبر الہ آبادی:

ایک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند اُس علم میں ماہر کون کرے

چنانچہ جو لوگ اپنے بچوں کو ان درسگاہوں میں بھیجتے ہیں وہ ابتدائی درجات کے بعد انھیں وہاں سے نکال کر سرکاری اسکولوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ وہ اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کا بچہ پڑھ لکھ کر بے قیمت رہے۔ وہ تعلیم کی قیمت چاہتے ہیں چاہے وہ قیمت انھیں اپنا دین و ایمان بیچ کر ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

اس مسئلے کی دوسری شکل یہ ہے کہ ان درسگاہوں کے لیے بہترین اساتذہ نہیں ملتے کیونکہ دنیا کے بازار میں صلاحیتوں کی جتنی قیمت مل رہی ہے اتنی قیمت یہ دینی درسگاہیں نہیں دے سکتیں اس لیے مجبوراً کم تر درجے کے اساتذہ کو قبول کرنا

پڑتا ہے جو طلبا کو بالعموم اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت دینے سے قاصر ہیں۔
تیسری مشکل یہ ہے کہ مالی اعتبار سے یہ ادارے بالکل ہی کمزور اور غیر مستحکم ہیں۔ چنانچہ ان درسگاہوں کو چلانے والے مخلص کارکنوں کو نہایت مجبوری اور بے کسی کی حالت میں اہل ثروت اور عوام کے سامنے بھی دست سوال دراز کرنا پڑ رہا ہے اور اکثر صدقات نافلہ اور واجبہ تک کو بھی طلب کرنا پڑ رہا ہے جس سے ملت، دین اور علم دین کا ذوق مجروح ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس وقت دین و ملت کے لیے جو حالات درپیش ہیں ان حالات میں وہ اس طرح سوچنا چھوڑ دیں کہ اگر انھوں نے سرکاری تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کی تو وہ حکومت کے عہدوں سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ ملک میں موجود اس تعلیم یافتہ بے روزگاری کے پس منظر میں اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ اگر وہ سرکاری مدارس اور کالجوں کی ڈگریاں حاصل کرلیں تو انھیں سرکاری ملازمت لازماً مل کر رہے گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان حکومت کی نوکریوں کا سہارا لینے کے بجائے آزادانہ معیشت کو اختیار کریں۔ موجودہ ہندوستان میں آزاد معیشت کی سہولتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور اگر توجہ کی جائے تو مسلمان اس میدان میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر اس تعلق سے مسلمانوں کے دین و ایمان کی بھی آزمائش ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں سے کس کو ترجیح دیتے ہیں۔ آج ملت اسلامیہ کو اسلام کی خاطر غیر اسلام سے بائیکاٹ کرنا ہے اور اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ اپنی زبان سے وہ جس چیز کو غلط کہتی ہے وہ فی الواقع دل سے بھی اس کو غلط سمجھتی ہے۔ اور اگر وہ اپنے دین پر قائم رہنے کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے کو تیار ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (عنکبوت: ۶۹)

جو لوگ ہمارے لیے مشقت اٹھائیں گے ہم ان کے لیے اپنی راہیں کھول دیں گے اور اللہ یقیناً بہترین عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس وقت ملک میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور ان بدلتے ہوئے حالات میں ہماری نسلوں کا اپنے نصب العین سے وابستہ رہنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ وقت کی نزاکت اور بگڑتے ہوئے حالات کا تیز دھارا ہمیں دعوت دے رہا ہے کہ ہم اپنی نئی نسلوں کے ذہن و دماغ کو غلط تصورات اور باطل افکار و نظریات سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں اور نہ صرف پرائمری بلکہ ثانوی و اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں کا ایک جال بچھا دیں۔ مسلمان ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود اپنی اقتصادی پس ماندگی کے باعث اس وسیع پیمانے پر دینی تعلیم کے مراکز کا قیام اور ان کا مالی بوجھ برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔ لیکن سنگ آمد و سخت آمد کے مصداق ان کو اپنی نسلوں کے دین و ایمان کے حفاظت کی خاطر یہ بوجھ اٹھانا ہی پڑے گا۔

اس سلسلے میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی مساعی اور خدمات لائق تحسین ہیں اور قابل مبارکباد بھی کہ اس نے آزاد پرائمری مکاتب کے قیام کے ذریعہ اس خصوص میں بڑے پیمانے پر جدوجہد شروع کر دی ہے لیکن چونکہ اس مسئلہ کی

نوعیت کل ہند ہے اور کیفیت وکمیت کے لحاظ سے وسیع پیمانے پر اعلیٰ تعلیمی معیار کی درس گاہوں کے قیام کا متقاضی ہے۔ اس لیے جزوی طور پر اور محدود پیمانے پر کسی ایک صوبہ یا ریاست میں اس قسم کی کوششیں مسئلہ کا حل نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ ملک گیر پیمانے پر جامعاتی سطح کی تعلیم گاہوں کا انتظام واہتمام کرے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام کچھ آسان نہیں ہے۔ ابتدا میں دشواریاں ضرور پیش آئیں گی۔ نصاب تعلیم ہو یا معلم کوئی چیز بھی ہمیں بنی بنائی نہیں مل جائے گی بلکہ یہ سب کچھ تیار کرنا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری ابتدائی کوششیں معیاری نہ ہوں اور بہت ساری ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ناکامیاں ہمت اور حوصلہ مند قوموں کے عزم پر ایک تازیانہ بن کر لگتی ہیں اور آگے چل کر یہی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

ریاست کیرالا اور میسور میں بھی میری معلومات کی حد تک چند ادارے جیسے مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کیرالا، کیناڈور مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن، الامین ایجوکیشنل سوسائٹی بنگلور، ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ مدارس وغیرہ قائم ہیں جو اپنے وسائل وذرائع کی حد تک چند مخصوص علاقوں میں مسلم طلبا کے لیے کالجس اور ہاسٹل چلاتے ہیں۔ لیکن ان کے تحت چلائے جانے والے کالجوں اور اقامتی اداروں کی نوعیت وہ نہیں ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے اور نہ یہ سرکاری و نیم سرکاری کالجس اور اداروں سے جو ملک میں چل رہے ہیں کچھ زیادہ مختلف ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اتنا کہ ان کالجوں کو مسلم تنظیمیں اور ادارے چلاتے ہیں، اس وقت ملک میں موجودہ تعلیمی انجمنوں یا تنظیموں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی ہی ایسی تنظیم ہے جو کل ہند اساس پر کام کرتی ہے لیکن متذکرہ نقشہ کے مطابق ملت کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے میری رائے میں مسلمانوں کی ایک ایسی کل ہند تنظیم جو معتمد علیہ ہو جیسے جماعت اسلامی ہند، کل ہند مجلس مشاورت یا مرکزی وقف بورڈ کے زیر اہتمام ایک ایسی تعلیمی تنظیم قائم کی جائے جو کم وبیش بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز کے خطوط پر ایک تنظیم بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن ہو۔ اس بورڈ کو کل ہند اساس پر مسلمانوں کا ایک ملی تعلیمی بورڈ ہونا چاہئے جسے تمام مسلم تنظیموں، مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، مرکزی وقف بورڈ اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل جیسے اداروں کا تعاون حاصل ہونا چاہئے۔ اگر ہندوستان کی ملت اسلامی اس مقصد کے لیے اپنے وسائل وذرائع مجتمع کرکے مخلص قائدین ملت کی رہنمائی میں اس کام کو انجام دینے کا عزم کرتے تو انشاء اللہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا حل ضرور نکل آئے گا۔

صبا بر ہے شب تاریک طاری — نگہ میں دھند ہے وہم گماں کی
دعاؤں سے سحر پیدا نہ ہوگی — ضرورت ہے مجاہد کی اذاں کی

انور اعظمیؒ

تراجم و اقتباسات

یورپ میں اسلامی سرگرمیاں

عیسائیوں کے اندیشے اور احساسات

ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی

نوٹ: اس مقالہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ میں مشکلات اور دشواریوں کے باوجود جو کچھ اسلامی سرگرمیاں انجام پاتی ہیں ان کو غیر مسلمین بالخصوص عیسائی حضرات کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جون بارکوسن کا یہ مقالہ THE BATTLE FOR BRITAIN کے نام سے مجلہ THE FLAME میں شائع ہوا جس کا عربی ترجمہ وزارت اوقاف کویت کی جانب سے ہوا، اور اب اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

برطانیہ میں مسلمانوں کی طرف سے، قرآنی تعلیمات کے مطابق شریعت اسلامی کے نفاذ کے مطالبے تیز سے تیز تر ہونے لگے ہیں اور تمام یورپی ممالک میں اسلام کو دوسرے مذہب اور اُردو کو دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

آج جبکہ اہل یورپ دینی شعائر پر عمل کرنے میں تنگی اور پریشانی محسوس کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کا گمان ہے کہ دینی شعائر پر عمل کرنے والے مسلمان زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل جائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے مہاجر مسلمان دینی طور طریقوں کو سختی سے اختیار کئے ہوئے ہیں اور اپنے وجود اور تشخص کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں۔

بعض ماہرین تعلیم کا کہنا ہے اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ جو بچے دس پندرہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑتے ہیں ان میں اسلام کے خلاف قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام محض ایمان کا نام نہیں بلکہ وہ ایک طریقۂ زندگی ہے جو کسی بھی صورت میں کسی دوسری درآمد تہذیب و ثقافت کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

چونکہ مکمل اسلام پر صحیح طور سے عمل کسی اسلامی ملک ہی میں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے یورپ کے مسلمان اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ اپنے اسلام کی حفاظت کے لیے تنظیمیں اور انجمنیں بنائیں۔ اس کی وجہ سے مشکلات پیش آتی ہیں۔

اور ملکی قوانین اور ضابطوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔

یورپ میں جو تنظیم مسلم داعیوں کو تبلیغ کے لیے مختلف ممالک میں بھیجتی ہے اس نے اپنا صدر دفتر لندن میں بنایا ہے۔ اسی لیے لندن کو مغربی دنیا کا مرکز کہا جاتا ہے۔ برطانیہ اور خاص کر لندن کو مرکز بنانے کی ایک اہم وجہ انگریزی زبان ہے۔ اس لیے کہ انگریزی زبان پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عصر حاضر میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۷۰ کروڑ (یعنی پوری دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ) ہے۔

برطانیہ کا محل وقوع اور وہاں اسلام کی تبلیغ واشاعت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر پورا یورپ ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس کے بعد جنوبی امریکا بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔

انگلینڈ میں اشاعت اسلام کی کیا علامات ظاہر ہو رہی ہیں اس کا اندازہ درج ذیل باتوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

(۱) عربی نشریات کی ابتدا روزانہ قرآن کی تلاوت سے ہوتی ہے۔ جبکہ مسیحی نشریات سال میں صرف ایک یا دو مرتبہ ہی بائبل سے شروع ہوتی ہیں۔

(۲) برطانیہ کے مسلمان حکومت پر زور دیتے ہیں کہ وہ ان کے درمیان برطانوی قوانین کے بجائے اسلامی قوانین کے ذریعے فیصلہ کرے۔ اسی طرح وہ اپنے مردوں کو تابوت کے بجائے کفن میں دفن کرتے ہیں ان کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ کارخانوں میں ادائیگی نماز کے لیے انھیں چھٹی دی جائے اور اسپتالوں اور اسکولوں میں ان کے لیے مخصوص طور پر کھانا تیار کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ " برطانیہ میں ہم قابل ذکر اور اہم اقلیت میں ہیں اس لیے ہمارے مخصوص رسم و رواج کو قانونی حیثیت دی جانی چاہیے۔"

(۳) تیس سال قبل برطانیہ میں صرف تین مساجد تھیں۔ لیکن آج پانچسو سے زائد مساجد اور قرآن کی تعلیم کے لیے سینکڑوں مدرسے ہیں (اسلامک فاؤنڈیشن کے بیان کے مطابق برطانیہ میں ڈیڑھ ہزار مساجد ہیں)

(۴) براڈ فورڈ۔ یورک شایر (جسے پاکستانیوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے پاکستان کا دارالحکومت کہا جاتا ہے) میں مسلم داعیوں کی ٹریننگ کے لیے متعدد ادارے قائم ہیں اور بولٹن لانکاشائر میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے ایک بڑی قطعۂ زمین خریدی گئی ہے۔

(۵) انگریزی یونیورسٹی میں اسلامیہ کالج قائم ہیں اور متعدد اسلامی لائبریریاں بھی قائم ہو گئی ہیں۔

(۶) پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر اسلامی کتابوں کی نشر و اشاعت جاری ہے۔ خود یہاں برطانیہ میں اسلامی موضوعات پر کم از کم تین ہزار کتابیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کتاب " انجیل قرآن میں" ہے اس میں اناجیل اربعہ سے عبارتیں لے کر انھیں قرآنی شواہد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ایک دوسری کتاب " اسلام کی دعوت" ہے جس میں قبول اسلام کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔

(۷) یہاں اداروں، کالجوں اور لائبریریوں میں استفادہ کے لیے قرآن کو ۳۲ کیسٹوں پر منتقل کر لیا گیا ہے۔

(۸) برطانیہ میں دار المنارۃ ایک سرگرم اشاعتی ادارہ ہے۔ ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ احمدی فرقہ تمام تحریکوں میں دعوت کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہتمام کرتا ہے۔ وہ لوگ انگلینڈ میں دعوت کے لیے اپنی آمدنیوں کا سولہ فیصد چندہ دیتے ہیں۔

(۹) اندنوں یہ خبر گرم ہے کہ یورپ کی سب سے بڑی مسجد لندن میں بننے والی ہے۔

(۱۰) آج جبکہ انگلینڈ زوال پذیر ہے (جیساکہ اخبار ٹیلیگراف نے کہا ہے) اسلام دعویٰ کرتا ہے کہ وہ بہترین طریقۂ زندگی کا حامل ہے۔ وہ اسراف ابا حیت جوا اور نشہ آور چیزوں کا استعمال حرام قرار دیتا ہے اور آدارہ اور غیر صالح ادب، فواحش اور زناکاری کا قلع قمع کرتا ہے۔

(۱۱) اسلام قرضوں پر سود حرام قرار دیتا ہے اسی لیے مسلمانوں نے یہاں برطانیہ میں ایک غیر سودی بینک بھی قائم کر رکھا ہے۔

(۱۲) برطانوی عدالتوں میں اسلامی شریعت کے مطابق طلاق کو نافذ کرنے کا زبانی اعلان کر دیا گیا ہے۔

(۱۳) گزشتہ سالوں میں ہزاروں انگریزوں نے اسلام قبول کیا۔ ایک اندازے کے مطابق انگلینڈ میں مسلمانوں کی کم از کم پانچ فیصد تعداد پہلے عیسائی انگریز تھی۔ ہر سال یورپ سے جو مسلمان ادائیگی حج کے لیے مکہ جاتے ہیں ان میں سے نصف انگریز ہوتے ہیں؛

اسلام بہت تیزی سے طوفانِ بلا خیز کی طرح برطانیہ میں پھیلتا جا رہا ہے۔ آج جبکہ انگلینڈ میں مسیحیت کی تلوار کند ہو چکی ہے اسلام کی تلوار پیہم تیزی دکھا رہی ہے۔ اور اس کی تاثیر ظاہر ہو رہی ہے۔ کیا اللہ نے اسے بطور سزا عیسائیوں پر مسلط کر دیا ہے؟ یا انھیں متنبہ ہونے اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کا ایک بے بدل موقع ملا ہے تاکہ وہ بھی مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم تیز کر دیں؛ کیا برطانیہ کے عیسائی چاہتے ہیں کہ آج یا کل میں روبہ زوال ہو جائیں؟ اب انھیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؛ آسمان کی طرف خشوع کے ساتھ سر اٹھانا یا مکہ میں نماز کے لیے سر جھکانا؟

آج برطانیہ ایک دوراہے پر ہے۔ جو اس کے لیے دونوں عالمی جنگوں سے زیادہ خطرناک ہے کچھ عرصہ قبل انگلینڈ میں عیسائیوں کو معرکۂ برطانیہ میں کامیابی ملی تھی۔ موجودہ معرکہ میں ہوا کا رخ نتیجہ متعین کرے گا۔

کسی مومن کو جو خدا اور رسول کے بتائے ہوئے ایمانیات پر اعتقاد رکھتا ہو، کافر کہہ دینا درحقیقت ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے یہ جسارت بندوں کے مقابلہ میں نہیں خدا کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ یہ خدا سے معارضہ ہے کہ جس کے حق میں خدا ایمان کا فیصلہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک بندۂ خدا کفر کا فیصلہ صادر کرتا ہے (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

استدراک

شب برات کی حقیقت

مولانا محمد امین اثری

ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی مجریہ اگست ۱۹۹۱ء مطابق ذی الحجہ محرم ۱۴۱۱/۱۲ھ شمارہ ۲ ایک رفیق کے توسط سے نظر سے گذرا جناب محمد سعود عالم قاسمی (رسالہ کے معاون مدیر) کا مضمون "اسلامی تہذیب اور رسم ورواج زیب زندگی ہے۔ اس مضمون میں ایک ذیلی عنوان "شب برأت" کے تحت موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ "بعض علماء نے شب برات کی اہمیت کا انکار کیا ہے، اگرچہ شب برات کے نام پر کی جانے والی فضولیات کی حرمت اپنی جگہ مسلم ہے مگر شب برات کی فضیلت کا ثبوت موجود ہے ذیل میں بعض روایات کا تذکرہ کیا جاتا ہے"

واضح رہے کہ جن حضرات نے شب برات کی اہمیت کا انکار کیا ہے وہ شب برات کے نام پر کی جانے والی فضولیات کی وجہ سے نہیں کیا ہے بلکہ اس سلسلہ کی مرویات کے موضوع اور من گھڑت یا صد درجہ ناقابل اعتبار ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ ہم ان مرویات کا جائزہ لیتے ہیں جسے مضمون نگار نے پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان روایات کا محدثین کے نزدیک کیا مقام ہے

۱۔ عن ابی موسیٰ الاشعری عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ تعالیٰ یَطّلِع فی لیلۃ النصف من شعبان فیغفر لجمیع خلقہ الا المشرک او مشاحن (رواہ ابن ماجہ ورواہ احمد عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص وفی روایۃ الا اثنین مشاحن وقاتل نفس)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے نقل فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی شب میں طلوع فرماتا ہے اور مشرک یا کینہ پرور کے علاوہ سب کی مغفرت فرماتا ہے۔ روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے اور روایت کیا اس کو احمد نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے اور ایک روایت میں ہے سوائے دو کے ایک کینہ پرور اور دوسرا قاتل۔

نزول الٰہی کا ذکر تو احادیث صحیحہ میں موجود ہے لیکن یہ طلوع الٰہی کیا چیز ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے؟ طلوع وغروب کا تعلق چاند، سورج اور مجسم اشیاء سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات جسم سے پاک ہے۔ اگرچہ شیعوں کے متعدد فرقے مثلاً مجسمہ

مشبہہ اور نصیریہ وغیرہ اللہ تعالیٰ کے مجسم ہونے کے قائل ہیں اور صوفیہ کے نزدیک بھی مشاہدہ حق کے بغیر کوئی بات نہیں بنتی۔ یہ مسلّم حقیقت ہے کہ جو شئے طلوع ہوتی ہے وہ غروب بھی ضرور ہوتی ہے۔ اور جو چیز طلوع و غروب ہوتی ہو وہ یقیناً ایک نہ ایک دن ضرور فنا بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ ستارے کے غروب ہونے کے وقت یہ اعلان کرایا (اِنِّیْ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ہ یقیناً میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ جو اللہ طلوع ہوتا اور صبح صادق کے ظہور کے بعد غروب ہو جاتا ہو، ایسا اللہ وہ اللہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا جس نے قرآن مجید میں اپنا یہ وصف بیان کیا ہو (لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ) اس کے مثل کوئی چیز نہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس روایت میں اس رات کا کوئی نام مذکور نہیں بلکہ نصف شعبان درج ہے۔ اگر مہینہ تیس دن کا ہو تو یہ پندرہویں رات ہوگی، اگر مہینہ انتیس کا ہے تو نصف شعبان کی کوئی رات نہ ہوگی۔ حالانکہ یہ کام ایک متعینہ رات میں انجام پاتے ہیں جس سال شعبان انتیس کا ہوگا۔ اس سال کی عبادت تو اکارت گئی کیونکہ نصف شعبان واقع ہی نہیں ہوئی

اب ذرا اس پر بھی غور فرمائیے اس روایت کی محدثین کی نظر میں کیا حیثیت ہے؟ اس کا ناقل عبداللہ بن لہیعہ ہے اس کا انتقال ۱۷۴ھ میں ہوا ہے۔ بخاری و مسلم نے اس کی کوئی روایت نقل نہیں کی، ترمذی نے اس کی روایت نقل کر کے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ نسائی نے دعویٰ کیا کہ میں نے اپنی کتاب میں اس کی صرف ایک روایت نقل کی ہے۔ مقدسی کہتے ہیں کہ متروک ہے، امام زرعہ رازی فرماتے ہیں کذاب ہے۔ دیگر محدثین کہتے ہیں کہ اگر اس سے عبداللہ بن مبارک اور عبداللہ قوار میری حدیث نقل کریں تو قابل قبول ہے ورنہ قطعاً نہیں کیونکہ آخری عمر میں اس کے دماغ نے جواب دیدیا تھا۔ جس کے باعث الٹی سیدھی روایات بیان کرنے لگا اور اتفاق سے یہ روایت یہ دونوں نقل نہیں کر رہے ہیں۔ ابن عدی اور ذہبی کہتے ہیں کہ ابن لہیعہ کی یہ روایت منکر ہے۔ عبداللہ ابن لہیعہ نے یہ روایت کسی سے نہیں سنی، وہ کبھی تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ روایت زید بن سلیم سے مروی ہے اور کبھی کہتا ہے کہ ضحاک ابن ایمن سے مروی ہے۔ یہ دونوں حضرات کون ہیں امام ابن عدی، ذہبی اور ابن حجر لکھتے ہیں کہ زید بن سلیم ایک مجہول شخص ہے کوئی نہیں جانتا کہ یہ کون ہیں۔ عبداللہ بن لہیعہ کے علاوہ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور اس نے بھی صرف اسی روایت میں ذکر کیا ہے۔ یہی بات محدثین نے ضحاک بن ایمن کے بارے میں بھی کہی ہے۔ یعنی یہ دونوں فرضی ہیں۔ جن کا بظاہر کوئی وجود نہیں گویا یہ صرف ابن لہیعہ کی ذہنی پیداوار ہے۔

عبداللہ بن لہیعہ آگے چل کر دعویٰ کرتا ہے کہ ان دونوں نے یہ روایت ضحاک بن عبدالرحمٰن بن عرذب سے نقل کی ہے اور کبھی کہتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عرذب سے نقل کی ہے اور اتفاق سے یہ دونوں بھی مجہول ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ نے یا تو یہ روایت اپنے دماغ کی بھٹی میں تیار کی ہے یا یہ روایت اس وقت کی ہے جب اس کے دماغ نے جواب دے دیا تھا۔ اس طرح اس کے چار راوی تو قطعاً مجہول ہیں اور ایک شدید ضعیف ہے۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ زید بن سلیم، ضحاک بن ایمن، عبدالرحمن اور عبدالرحمن بن عرزب سے ابن ماجہ کے علاوہ کسی محدث نے کوئی روایت نہیں لی ہے اس روایت کو بھی ابن ماجہ کے علاوہ کسی نے نقل نہیں کیا۔ حافظ مزی فرماتے ہیں جو روایت صرف ابن ماجہ نقل کریں اور وہ کسی دوسری کتاب میں نہ ہو تو یقیناً منکر ہے۔

اس روایت کو حدیث کہنا ہمارے خیال میں کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی بات کو بیان کرنے سے قبل دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ اول یہ کہ وہ بات سچی ہو دوم یہ کہ اسے انسان جانتا بھی ہو۔ ارشاد ہے اِلَّا مَنْ شهد بالحق وهم يعلمون (الزخرف) مگر جو لوگ شہادت دیں وہ علم بھی رکھتے ہوں اور چونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس روایت کے راوی ناقابل اعتبار ہیں اس لیے اس کے حق ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

عن عائشة قالت فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة فاذا هو بالبقيع فقال أكنت تخافين ان يحيف الله عليك ورسوله قلت يا رسول الله انى ظننت انك اتيت بعض نسائك فقال ان الله تعالى ينزل ليلة النصف من شعبان الى السماء الدنيا فيغفر لاكثر من عدد شعر غنم (رواه الترمذى وابن ماجه وزاد رزين ممن استحق النار) وقال الترمذى سمعت محمد البخارى يضعف هذا الحديث۔

امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے اس طرح نقل کیا ہے کہ جب نصف شعبان کی رات ہوئی (یہاں رات کا کوئی نام نہیں لیا گیا) تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بستر پر نہیں پایا کچھ دیر بعد آپ لوٹے اور فرمایا اے عائشہؓ کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ اللہ کا رسول تیرے ساتھ زیادتی کرے گا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا نہیں یارسول اللہ میں یہ سمجھتی تھی آپ اپنی کسی اور زوجہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے عائشہؓ تجھے معلوم ہے کہ آج کون سی رات ہے؟ آج نصف شعبان کی رات ہے اس رات میں اللہ تعالیٰ بنو کلب کی بھیڑوں کے بالوں سے بھی زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔

اس کی سندی حیثیت خود امام ترمذی کی زبانی سنئے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسمٰعیل (بخاری) سے سا وہ اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے اور انھوں نے فرمایا کہ یہ روایت حجاج بن ارطات، یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کر رہا ہے حالانکہ اس نے یحییٰ سے زندگی میں ملاقات تک نہیں کی۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یحییٰ اس روایت کو عروہ سے نقل کر رہا ہے اور یحییٰ نے عروہ سے کبھی ملاقات نہیں کی۔ اس طرح یہ روایت دو مقام سے منقطع ہوئی اور منقطع روایت محدثین کے نزدیک ناقابل قبول ہے اور جو روایت دو جگہ سے منقطع ہو وہ محدثین کے نزدیک معلل کہلاتی ہے۔ جو انتہائی شدید قسم کی ضعیف بلکہ منکر و مردود ہوتی ہے۔ اسی لیے حافظ

بدرالدین عینی حنفی، ابن دحیہ اور ابن العربی مالکی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

اس روایت میں صرف یہی دو عیب نہیں ہیں، بلکہ ان دو عیبوں کے علاوہ مزید دو عیب اور پوشیدہ ہیں۔

۱۔ حجاج اور یحیی دونوں مدلس ہیں۔ یعنی درمیان سند سے عمداً راوی کو حذف کر دیتے ہیں تاکہ روایت کا عیب ظاہر نہ ہو، کیونکہ درمیان سے جو راوی گرایا جاتا ہے وہ اکثر ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ اسی لیے راوی اس کا نام چھپانا چاہتا ہے۔ ممکن ہے جو راوی درمیان سے گرائے گئے ہیں وہ تبرائی ہوں اور پھر جب کسی جگہ سے راوی گرادیا جاتا ہے تو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو راوی گرایا گیا ہے وہ صرف ایک نہیں ہوتا بلکہ متعدد ہوتے ہیں اور حجاج اور یحیی دونوں کی عادت میں یہ داخل ہے کہ وہ درمیان سے راوی گرادیتے ہیں۔ اس لیے امام ترمذی نے کتاب العلل میں یحیی بن سعید القطان کا قول نقل کیا ہے کہ یحیی بن ابی کثیر کی مرسلات کچھ نہیں ہیں۔ جب یحیی کی مرسل کوئی وجہ نہیں رکھتی تو حجاج بن ارطات تو اس سے کہیں زیادہ گیا گزرا ہے۔ اس لیے کہ یحیی کی تو صرف مرسلات ناقابل قبول ہیں لیکن حجاج کی روایت ہی قابل قبول نہیں ہوتی اور یہ روایت عن کے ذریعہ نقل کی ہے۔

بقیع کا قصہ جہاں از روئے عقل و نقل غلط ہے وہیں احادیث صحیحہ اور تاریخ کے بھی سراسر خلاف ہے۔ موطا امام مالک اور سنن نسائی میں صحیح سند کے ساتھ اس واقعہ کی صورت یہ بیان کی گئی ہے۔ ام المومنین فرماتی ہیں:

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ فلبس ثیابہ ثم خرج قالت فامرت جاریتی بریرۃ تتبعہ فتبعتہ حتی جاء البقیع فوقف ادناہ ماشاء اللہ ان یقف ثم انصرف فسبقتہ بریرۃ فاخبرتنی فلم اذکر لہ شیئا حتی اصبح ثم ذکرت ذلک لہ فقال انی بعثت الی اھل البقیع لاصلی علیہم۔ (نسائی جلد ۱ ص ۲۰ وموطا امام مالک ص ۸۵)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات اٹھے پھر اپنے کپڑے پہنے اور باہر تشریف لے گئے۔ ام المومنین کہتی ہیں میں نے اپنی باندی بریرہؓ کو حکم دیا کہ وہ آپ کے پیچھے جائے۔ وہ آپ کے پیچھے گئی حتی کہ آپ بقیع پہنچے اور اس کے قریب کھڑے ہو گئے جب تک اللہ نے چاہا کھڑے رہے پھر واپس لوٹے۔ بریرہ پہلے پہنچ گئی اس نے مجھے اطلاع دی میں نے صبح تک آپ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ صبح کے بعد میں نے آپ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اہل بقیع کی طرف بھیجا گیا تھا تاکہ میں ان کے لئے مغفرت کی دعا کروں۔

یہ حدیث صحیح یہ ثابت کر رہی ہے کہ ام المومنین نے پیچھا کیا تھا اور نہ شب برات کی کوئی خوبی بیان کی گئی تھی اور نہ اس مخصوص رات کی وجہ سے آپ بقیع تشریف لے گئے تھے بلکہ وہاں جانے کی صرف وجہ یہ تھی کہ آپ کو اہل بقیع کے لیے دعائے مغفرت کا حکم دیا گیا تھا۔

ایک اور روایت ابن ماجہ اور ابن حبان میں حضرت علی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نصف شعبان ہو تو رات کو قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شب میں غروب آفتاب کے وقت آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے، ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں، ہے کوئی رزق طلب کرنے والا کہ میں اسے رزق دوں، ہے کوئی مبتلائے مصیبت کہ میں اسے عافیت دوں، اسی طرح صبح صادق تک اعلان ہوتا رہتا ہے۔

اس روایت کا ایک راوی ابوبکر بن عبداللہ بن ابوبرہ المدنی ہے جو از حد ناقابل اعتبار ہے۔ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں محدثین نے اسے واضع حدیث قرار دیا ہے۔ (تقریب التہذیب ص۳۹۶) نسائی لکھتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے (کتاب الضعفاء للنسائی ص۱۱۵) بخاری کہتے ہیں ضعیف ہے (کتاب الضعفاء للبخاری ص۲۴) ابن عدی کامل میں اور ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں یہ روایت منکر ہے۔ امام احمد کا قول ہے کہ ابوبکر بن عبداللہ احادیث گھڑا کرتا تھا، یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں یہ شخص پہلے شیعہ تھا نفس ذکیہ کے ساتھ مل کر اس نے خلیفہ منصور کے خلاف بغاوت کی۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد یہ قید کردیا گیا۔ تقریباً چھ ماہ بعد مدینے کے کچھ غلاموں نے قید خانہ پر حملہ کرکے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ جس میں یہ بھی آزاد ہوا۔ آزاد ہوتے ہی یہ مسجد کے ممبر پر چڑھ گیا اور خلیفہ منصور کی تعریف میں فرضی روایات سنانی شروع کردیں۔ جس پر منصور نے خوش ہو کر اسے قاضی بنا دیا۔ (میزان اعتدال ص۵۰۳ ج۴)

ابوالحسن سندھی اپنی شرح ابن ماجہ میں بیہقی جمع الزوائد میں لکھتے ہیں کہ امام احمد اور امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس لیے یہ احادیث موضوع ہے۔ ابن جوزی نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے اور یہ روایت ابن ماجہ کی موضوعات میں شمار ہوتی ہے۔ ابن ابی سبرہ سے روایت نقل کرنے والا عبدالرزاق ابن ہمام ہے اگرچہ یہ حدیث کا امام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس پر بھی محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ رافضی ہے اور آخر عمر میں اس کے دماغ نے جواب دیدیا تھا۔ جس کی وجہ سے صحیح روایات میں غلط روایات شامل ہو گئیں۔ امام احمد فرماتے ہیں اسے سنی سنائی گپیں زیادہ پسند تھیں (میزان ص۶۰۹ ج۲)

دنیا اور آخرت ایک مسلسل زندگی کے دو مرحلوں کا نام ہے، ایک مرحلہ ہے عمل کا اور دوسرا نتیجہ عمل کا (مولانا مودودیؒ)

جلد ۸ — مارچ ۱۹۸۸ء رجب شعبان ۱۴۰۸ھ — شمارہ ۳

فہرست مضامین

اشارات

مقالات

اخبار و افکار

تراجم و اقتباسات

تنقید و تبصرہ

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ: مدیر زندگی نو پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے: منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون ۵۵/- روپے ● (بیرون ہند) ۲۲۵/- روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر، پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے حال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۲۲۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

اشارات: بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقویٰ اور اس کی حقیقت

(آخری قسط)

سید جلال الدین عمری

۴۔ تقویٰ کے تقاضوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ تقویٰ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی کا سینہ حمیت جاہلیہ سے پاک ہو۔ حمیت جاہلیہ شخصی، گروہی، قومی، ایک دو نہیں ہر طرح کے تعصبات ابھارتی ہے اور آدمی کو حق و صداقت کے قبول کرنے اور اس پر قائم رہنے سے روکتی ہے۔ تقویٰ ہو تو وہ ہر طرح کے تعصبات پر غالب آسکتا ہے۔ یہ بات صلح حدیبیہ کے واقعہ کے ذیل میں سمجھائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت اور عمرہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ قربانی کے جانور ان کے ساتھ تھے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ کسی قسم کی محاذ آرائی یا جنگ پیش نظر نہیں ہے۔ لیکن حمیت جاہلیہ نے قریش مکہ کو ان کے خلاف صف آرا کر دیا۔ انھوں نے اس بات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ آپ اور آپ کے ساتھی مکہ میں داخل ہوں اور بیت اللہ کی زیارت کریں۔ جب کہ دور جاہلیت میں بھی کسی شخص کو حج اور عمرہ سے نہیں روکا جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف جاہلی حمیت تھی کہ اہل عرب ہماری کمزوری پر محمول کریں گے اور یہ سمجھیں گے کہ اب مسلمانوں کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اپنے حریفوں کے سامنے کعبۃ اللہ کی زیارت کر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی جاتی تو انھوں نے ایسی شرطیں رکھیں جن سے ان کی برتری نمایاں ہو اور وہ دنیا پر ظاہر کر سکیں کہ اب بھی ان کی بالادستی قائم ہے۔ ان باتوں سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے صبر و ضبط اور تحمل کا ثبوت دیا۔ بالآخر جنگ سے بچنے کی خاطر جب آپ نے ان سے صلح فرمائی تو اس میں ایسی شرائط تھیں کہ صحابہ کرام کو محسوس ہوا کہ ہم دب کر صلح کر رہے ہیں اور یہ ان کے وقار کے منافی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے اظہار بھی ہوا۔ لیکن جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی یہی ہے تو انھوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور دل سکون و اطمینان سے بھر گئے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ کلمہ تقویٰ پر قائم رہنا ہے۔[1]

[1] [illegible] سے مروی ہے کہ کلمہ تقویٰ سے کلمہ توحید لا الہ الا اللہ مراد ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي
قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ
فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى
الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ
وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ
اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ٥ (الفتح : ۲۶)

جب کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیّت ابھار رکھی تھی، اللہ نے اپنے رسول اور اہل ایمان پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور کلمۂ تقویٰ پر انہیں قائم رکھا۔ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ ہو تو نازک سے نازک مواقع پر بھی حمیّت جاہلیت نہیں ابھر سکتی اور آدمی جذبات میں مشتعل ہو کر خدا اور رسول کے فیصلہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔

۵۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین اور شریعت کے مطابق جو کام انجام پائے اس میں کھلے دل کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اسے قرآن مجید بِرّ و تقویٰ میں تعاون سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ وہ اثم و عدوان میں عدم تعاون کا حکم دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں خدا کی نافرمانی اور اس کے حدود سے تجاوز ہو رہا ہو وہاں کسی قسم کا تعاون نہ کیا جائے کسی کے ساتھ تعاون ہو یا عدم تعاون یہ احساس زندہ رہنا چاہئے کہ ایک روز اپنا نامۂ اعمال لے کر اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونا ہے ہمارے غلط اقدامات اس کے عذاب کے موجب ہو سکتے اور اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ یہی تقویٰ ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ
(المائدہ : ۲)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو اللہ سے ڈرتے رہو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

انسان کی ایک بڑی نفسیاتی کمزوری یہ ہے کہ وہ تعاون یا عدم تعاون کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اس اصول کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اپنوں اور غیروں کا سوال اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ ان افراد کے ساتھ تو تعاون کے لئے آگے بڑھتا ہے جن سے اس کا کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق ہو، چاہے وہ اثم و عدوان ہی کا ارتکاب کر رہے ہوں۔ اس کے برخلاف جن لوگوں کو وہ غیر سمجھتا ہے ان کے ساتھ کسی قسم کے تعاون کا روادار نہیں ہوتا چاہے وہ اچھے سے اچھا کام انجام دے رہے ہوں۔ حالانکہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے اس اصول پر عمل ہو تو نیک

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ایک حدیث بھی اس کی تائید میں آتی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے صحیح ہے کہ توحید کے اقرار ہی سے سارے اعمالِ تقویٰ وجود میں آتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر تقویٰ کے جس رویہ کا اظہار ہوا تھا وہ بھی اسی کلمہ کا نتیجہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کلمۂ توحید کی شہادت دینا تقویٰ کی اصل ہے۔ تفسیر ابن کثیر ۴/۱۹۲

کاموں کو تقویت پہنچے گی وہ فروغ پائیں گے اور لوگوں کو غلط رخ پر جانے سے روکا جا سکے گا۔ اسی کے بعد ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔

تعاون اور عدم تعاون کا یہ اصول چھوٹے سے چھوٹے عمل کے لئے بھی ہے اور ان اعمال کے لئے بھی ہے جو دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ اس کی ضرورت انفرادی سطح پر بھی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی۔ ایک شخص کسی نازک معاملہ میں سچی گواہی دینے کی ہمت کر رہا ہے تو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی ہمت بڑھائی جائے اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان میں اس کی مدد کی جائے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ خدمت خلق کی کوئی اسکیم چلا رہا ہو تو تقویٰ کا تقاضا ہے کہ اسے مادی اور اخلاقی ہر طرح کا تعاون فراہم کیا جائے۔ ملی اور اجتماعی زندگی میں اس تعاون کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی سے امت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ امت کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، اسے باطل افکار سے بچانا اور خیر امت کے مقام تک پہونچانا۔ اس کی دینی و دنیوی تعلیم اور اس کی اخلاقی تربیت کا نظم کرنا اور اس کی معیشت و معاشرت کو سنوارنا یہ سب ایسے بڑے کام ہیں کہ ایک دوسرے کے تعاون ہی سے انجام پا سکتے ہیں۔ اس تعاون میں کسی قسم کے گروہی تعصب اور ذہنی تحفظ کو حائل نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے باہم تعلقات بہتر ہوں، ان کے اندر محبت اور الفت کے جذبات پائے جائیں اور وہ ایک دوسرے کے ہمدرد و بہی خواہ بن جائیں۔ تعلقات بہتر ہوں گے تو فطری طور پر ان کے اختلافات دور ہوں گے، ان کا انتشار ختم ہوگا اور ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوگا۔

ان تعلقات کے درمیان مادی مفادات اور دنیوی اغراض کا حائل ہو جانا تقویٰ کے منافی ہے۔ جنگ بدر میں مال غنیمت حاصل ہوا تو اس کی تقسیم کے بارے میں بحث شروع ہو گئی۔ نوجوان اسے اپنا حق سمجھتے تھے اس لئے کہ فتح و کامرانی ان کے زور بازو کا نتیجہ تھی۔ بزرگوں کا خیال تھا کہ ان کی حکمت و دانائی اور پشت پناہی سے جنگ جیتی گئی۔ اس سے دلوں کے اندر بعض ناپسندیدہ جذبات ابھر سکتے تھے اور تعلقات کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ قرآن مجید نے کہا کہ یہ بحث ان کے شایان شان نہیں ہے۔ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ وہی اس کے بارے میں فیصلہ کریں گے اور یہ فیصلہ تم سب کو تسلیم کرنا چاہئے۔ مال غنیمت کے احکام سے یہاں بحث نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ہ (انفال: ۱)

اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرلو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔

یہاں پہلے ہی قدم پر تقویٰ کی ہدایت اس لئے دی گئی کہ اسی سے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں اور اللہ اور رسول کی

اطاعت اور ان کے ہر حکم کو دل و جان سے قبول کرنے کا جذبہ ابھر سکتا ہے۔

سورۂ حجرات میں فرمایا گیا کہ مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ ان کے درمیان اختلافات ہوں تو انھیں دور کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ اس ذیل میں بھی تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات ۱۰)	مسلمان تو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اگر اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلافات پیدا ہوں تو) صلح کرادو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ امید ہے تم پر اس کی رحمت ہوگی۔

تقویٰ یہ نہیں کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دی جائے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا جائے بلکہ تقویٰ یہ چاہتا ہے کہ ان کے شیرازہ کو مستحکم کیا جائے، ان کے اختلافات کو بھائیوں کے اختلافات سمجھ کر حل کیا جائے اور انھیں خونی رشتہ داروں کی طرح مل جل کر رہنے کی تعلیم دی جائے۔

۷۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ جو صاف ستھرا اور پاکیزہ رویہ اختیار کرنا چاہئے اسے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تحاسدوا ولا تناجشو ولا تباغضوا ولا تدابروا ولا یبع بعضکم علی بیع بعض وکونوا عباد اللہ اخوانا المسلم اخوا المسلم لایظلمہ ولا یخذلہ ولایحقرہ التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ ثلاث مرات بحسب امرأمن الشران یحقر اخاہ المسلم کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم ظلم المسلم الخ)	ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، کاروبار میں محض قیمت بڑھانے کے لئے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بولی نہ بولو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کے سودے کو بگاڑے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ مصیبت میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے اور نہ اسے حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے یہ فرما کر آپ نے تین مرتبہ سینۂ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔ انسان کے لئے یہ شر کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے ایک مسلمان کی سب چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام ہیں۔ اس کا خون اس کا مال اور اس کی عزت و آبرو۔

اس حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے خوشی اور غم، راحت اور تکلیف، لین دین ہر موقع پر اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے اور اس کی جان، مال اور عزت و آبرو کا کس طرح اسے احترام کرنا چاہئے۔ اسی وضاحت کے دوران میں تقویٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔

س کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے کسی بھائی کے بارے میں یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ تقویٰ اور خدا ترسی سے محروم ہے، اس لئے کہ تقویٰ کا تعلق دل سے ہے اور دل کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ خواہ مخواہ بدگمانی رنا اور اس کے ساتھ معاندانہ انسانوں کا سا رویہ اختیار کرنا صحیح نہیں ہے (الا یہ کہ کوئی واضح ثبوت اس کے خلاف موجود ہو)۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں تقویٰ ہو وہ کسی مسلمان کو حقیر نہیں سمجھے گا، س کے خلاف سازشیں نہیں کرے گا۔ اسے نقصان پہونچانے اور بدنام کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ اس کا رویہ محبت و احترام کا ہوگا اور وہ اس کی جان، مال اور عزت و ناموس کا محافظ ہوگا۔

۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ نجویٰ، نیک کاموں میں ہو۔ نجویٰ کے معنی ہیں، سرگوشی کرنا، کسی سے الگ تھلگ اور تنہائی میں بات کرنا۔ انسان کو اپنی شخصی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے کہ جن افراد کو وہ مخلص سمجھتا ہے اور جن کی سوجھ بوجھ اور علم اور تجربہ پر اسے اعتماد ہوتا ہے ان سے مشورہ اور تبادلۂ خیال کرے۔ بعض اوقات حکمت اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ جن امور میں مشورہ کیا جائے ان میں رازداری برتی جائے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ نجویٰ کس مقصد کے تحت ہو رہا ہے؟ قرآن مجید نے دو قسم کے نجویٰ کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ نجویٰ ہے جو مشرکین، یہود اور منافقین کرتے تھے۔ اس کا مقصد ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کے دین کی مخالفت کرنا۔ اس کے بارے میں بے معنی اعتراضات کرنا، شکوک و شبہات پیدا کرنا، لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی تدبیریں کرنا، اہل ایمان کو نقصان اور اذیت پہونچانا اور دین کے خلاف سازشیں کرنا۔ اس قسم کے نجویٰ کا ذکر قرآن مجید کی متعدد آیات میں ہے[1]۔ دوسری قسم نجویٰ کی وہ ہے جس کی اجازت مسلمانوں کو اس ہدایت کے ساتھ دی گئی کہ وہ تقویٰ کے حدود میں ہو۔ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ
(المجادلۃ: ۹)

اے ایمان والو جب تم سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی مت کرو۔ اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اور تقویٰ کے معاملہ میں سرگوشی کرو۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے۔

اس آیت سے پہلے کہا گیا ہے یہود اور ان کے زیر اثر منافقین کا نجویٰ معصیت اور گناہ کے کاموں میں

---

[1] ملاحظہ ہو الاسراء ۴۷، الانبیاء ۳، الزخرف ۸۰، التوبہ ۷۸۔ بعض اور حوالے اسی بحث میں موجود ہیں۔

در اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کی دشمنی اور مخالفت میں ہوتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا کہ اہل ایمان کا نجویٰ ان ناپاک مقاصد کے لئے نہیں بلکہ بِرّ و تقویٰ کے لئے ہونا چاہئے بِرّ و تقویٰ میں وہ تمام باتیں آ جاتی ہیں جن کے کرنے یا جن سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ اہل ایمان کا نجویٰ ہو تو یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کی کس طرح تعمیل ہو اور جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے کیسے اجتناب کیا جائے؟ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

لَاخَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (النساء: ۱۱۴)

لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتا۔ ہاں جو شخص صدقہ و خیرات کی تلقین کرے، نیکی کا حکم دے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرے (تو اس کی پوشیدہ بات چیت خیر کا باعث ہے) اور جو شخص اللہ کی رضا کے لئے یہ کرے تو ہم اسے بڑا اجر عطا کریں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نجویٰ امور خیر میں ہونا چاہئے جس میں صدقات و انفاق اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی بحث ہو، معروفات کو قائم کرنے، نیکیوں کے پھیلانے کا ذکر ہو، لوگوں کی فلاح و بہبود، ان کے درمیان صلح و صفائی اور اتحاد و اتفاق کی بات ہو۔ اللہ کی رضا جوئی کی خاطر اس نوعیت کی جو کوشش بھی کی جائے گی آدمی اجر عظیم کا حق دار ہوگا اس طرح کے پاکیزہ مقاصد سے ہٹ کر جو نجویٰ بھی ہو اس میں کوئی خیر نہیں۔ وہ خدا کی پکڑ کا موجب ہوگا۔

۹۔ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ آدمی حق کا بے باکانہ اظہار کرے۔ اللہ کے رسولوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر حق کی تبلیغ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے بندوں تک پہونچاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر منصب رسالت کی ذمہ داری ادا بھی نہیں ہو سکتی۔

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝ (الاحزاب: ۳۹)

وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہونچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کا سینہ خدا کی خشیت اور تقویٰ سے معمور ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت مرعوب و متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ حق کے معاملہ میں بے خوف ہوگا اور اس کی زبان پر قرآن مجید کے الفاظ میں ہمیشہ قول سدید جاری ہوگا۔ وہ بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہے گا، وقت ضرورت جان کی بازی لگا کر کہے گا اور اسی کو اپنی کامیابی

تصور کرے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ
لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
ذُنُوبَكُمْ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ
فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ (الاحزاب۔ ۷۰-۷۱)

اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور
ٹھیک بات کہا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال کو تمہارے لئے
سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور
جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس
نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ آدمی کو حق کی راہ میں جد و جہد کرنے اور جان لڑانے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ جہاد کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان ہو اور دل تقویٰ کے نور سے روشن ہو تو آدمی جہاد میں عدم شرکت کے لئے بہانے نہیں ڈھونڈے گا اور معذرتیں نہیں پیش کرے گا۔ وہ اپنی جان مال اور سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہے گا۔ ارشاد ہوا۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَن يُجَاهِدُوا
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
بِالْمُتَّقِينَ ۝ (التوبہ۔ ۴۴)

جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے
ہیں وہ آپ سے اجازت نہیں مانگیں گے کہ انھیں اپنے
مال اور جان سے جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔
اللہ تعالیٰ ان متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ جہاد سے وہی لوگ جی چراتے ہیں جن کے دل ایمان کی دولت سے خالی ہیں اور جو ریب و تردد میں مبتلا ہیں

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا
يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ
ارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُونَ ۝ (التوبہ۔ ۴۵)

آپ سے وہی لوگ جہاد میں شریک نہ ہونے
کی اجازت مانگیں گے جو اللہ پر اور قیامت کے دن
پر ایمان نہیں رکھتے۔ جن کے دلوں میں ریب اور شک
ہے اور وہ اپنے شک میں حیران و سرگرداں ہیں۔

یہ بات قرآن مجید نے اچھی طرح واضح کردی ہے کہ جن لوگوں کے اندر صحیح معنی میں تقویٰ اور خدا ترسی پائی جاتی ہے وہی اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں۔ یہود اپنی تمام فکری اور عملی گمراہیوں کے باوجود خود کو اولیاء اللہ سمجھتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ اللہ کے ولی اور دوست ہونے کا ایک خاص پیمانہ ہے کہ اس کے راستے میں جان دینا آسان ہو جاتا ہے۔ جب کہ تم موت کے نام سے گھبراتے ہو۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِن

اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگو جنھوں نے

زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ (الجمعہ ۶-۷)

یہودیت اختیار کر رکھی ہے اگر یہ تمہارا دعویٰ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے دوست ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو۔ وہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے آگے بھیجے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ قیامت آئے گی تو جنت کا پروانہ ان کے ہاتھ میں ہوگا۔ قرآن نے کہا کہ ان خرافات پر خود تمہارا ایمان نہیں ہے ورنہ حیات دنیا پر تم اس قدر فریفتہ نہ ہوتے بلکہ آخرت کی طلب میں اس فانی زندگی سے دست بردار ہونے کے لئے ہر آن تیار رہتے جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں کا ہر فرد ہزاروں سال کی زندگی کی تمنا لیے بیٹھا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرہ: ۹۴-۹۵)

ان سے کہو کہ آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ وہ ہرگز کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے آگے بھیجے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

دنیا پرست افراد اور قومیں ہمیشہ موت سے گھبراتی ہیں۔ وہ نہ تو کسی اعلیٰ مقصد کو اختیار کر سکتی ہیں اور نہ اس کے لئے جان و مال کی قربانی دے سکتی ہیں۔ یہود اسی کمزوری میں مبتلا تھے۔

۱۱۔ تقویٰ کے نور سے جب دل کی دنیا روشن ہوتی ہے تو پوری زندگی پر اس کے خاص اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آدمی کے اندر سے ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے اور بعض اوصاف اور خوبیاں اس کا ایک لازمی جزء بن جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے متقیوں کی صفات کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے تقویٰ کے مزید تقاضے واضح ہوتے ہیں ان کے بغیر تقویٰ کا تصور مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

جس شخص کے دل میں تقویٰ ہو آخرت کی کامیابی اس کا مطلوب بن جاتی ہے۔ آخرت کا حساب کتاب، جنت اور جہنم، وہاں کی جزا و سزا ہر وقت اس کے سامنے اس طرح ہوتے ہیں جیسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ خدا کے عذاب سے بچنے اور اس کی رحمت کا مستحق بن جانے کی فکر اس پر چھا جاتی ہے۔ پوری زندگی نیکیوں میں گذارنے کے باوجود اس کا سینہ خدا کے خوف سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ ہر آن اس سے ڈرتا رہتا ہے اور اس کی امیدوں کا مرکز بھی وہی ہوتا ہے۔ وہ اس کے سوا نہ کسی سے خوف کھاتا ہے اور نہ کسی سے

کوئی توقع وابستہ کرتا ہے۔ امید و بیم کی ایک عجیب ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کے ہاتھ اللہ کے دربار میں پھیلے رہتے ہیں اور وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ کے بعض بندوں کا ذکر ہے اس ذیل میں فرمایا۔

اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَھَبًا ط وَکَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ o (الانبیاء: ۹۰)	یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑتے تھے اور امید و بیم کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے سامنے جھکے ہوئے تھے۔

تقویٰ سے خدا کا خوف انسان کے لئے ایک زندہ حقیقت بن جاتا ہے۔ وہ اس تصور سے کانپ جاتا ہے کہ آخرت میں اسے کسی برے انجام سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ قرآن مجید اللہ کے نیک بندوں کی، جنھیں وہ دانا اور عقل مند کہتا ہے، ایک صفت یہ بیان کرتا ہے۔

وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ o (الرعد: ۲۱)	وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔

خدا کا یہ خوف اگر انسان کے دل و دماغ پر چھا جائے تو وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کی گندگیوں سے محفوظ رہے گا اور خالص مادی اور معاشی جد و جہد میں بھی خدا کو فراموش نہ کر بیٹھے گا۔ یہی تقویٰ ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ o لِیَجْزِیَھُمُ اللہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ وَاللہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ o (النور: ۳۷-۳۸)	ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹ جائیں گے اور دیدے پتھرا جائیں گے۔ تاکہ اللہ ان کو ان کے بہترین اعمال کا بدلہ دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

۱۲۔ متقی انسان کی خوبیوں میں نماز اور راہ خدا میں انفاق بھی شامل ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے۔

ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ o الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ o (البقرہ: ۲-۳)	اس کتاب میں ہدایت ہے متقیوں کے لئے وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق کا بہترین اظہار نماز کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کا اپنے رب سے رشتہ جڑ گیا ہے۔ وہ اسے اپنا ملجا و ماویٰ اور سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا ہے۔ اب اس کا سر کسی اور کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ یہ کیفیت تہجد کی نمازوں میں اپنی معراج کو پہونچ جاتی ہے۔ متقیوں کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ وہ نماز تہجد کا اہتمام کرتے ہیں۔ سورۂ ذاریات میں متقیوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ۝	بے شک تقویٰ والے باغوں اور چشموں میں
آخِذِينَ مَآ ءَاتَىٰهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ	ہوں گے۔ وہ اس سے پہلے (دنیا کی زندگی میں) نکوکار
كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۝ كَانُوا قَلِيلًا	تھے۔ راتوں کو کم سوتے تھے اور صبح کے وقت اپنی
مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝	کوتاہیوں کی معافی مانگتے تھے۔ ان کے مالوں میں
وَفِىٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذریات ۱۵-۱۹)	سائل اور محروم دونوں کا حق تھا۔

مطلب یہ کہ ان کی راتیں غفلت اور بے خبری یا عیش و طرب کی راتیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان کے لئے تنہائی اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ دنیا تو اپنی نرم و گرم خواب گاہوں میں میٹھی نیند سوتی ہے لیکن ان کی نیند خدا کے خوف اور خشیت سے اڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے بستروں سے اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے مناجات اور سرگوشی کرنے اور اس کے سامنے رکوع و سجدہ کرنے میں لگ جاتے ہیں انھیں اپنی اس شب بیداری اور عبادت پر کوئی ناز نہیں ہوتا۔ جب سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور قبولیت دعا کا وقت آتا ہے تو ان کے ہاتھ استغفار کے لئے اٹھ جاتے ہیں اور وہ اپنے مالک و مولیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں۔ یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ	جو اپنی راتیں اپنے رب کے سامنے سجدہ اور
سُجَّدًا وَقِيَامًا ۝ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ	قیام کرتے ہوئے گزارتے ہیں اور جو دعائیں کرتے ہیں
رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ	کہ اے ہمارے رب عذاب جہنم کو ہم سے دور فرما دے۔
عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ (الفرقان ۶۴-۶۵)	بے شک اس کا عذاب تو چپک جانے والا ہے۔

۱۴۔ تقویٰ کی ایک خوبی یہ ہے کہ راہ خدا میں انفاق آسان ہو جاتا ہے۔ آدمی ان تمام مدات میں بخوشی اپنا مال خرچ کرنے لگتا ہے جن میں خرچ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مال کی محبت انفاق کی راہ میں طرح طرح کی ذہنی و نفسیاتی رکاوٹیں کھڑی کر دیتی ہے۔ تقویٰ سے ان سب پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے اور آدمی تنگی و فراخی ہر حال میں انفاق کے جوہر کو باقی رکھتا ہے اور مال کی محبت میں خدا کے دین کے تقاضوں کو فراموش نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۱۳۳﴾ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾ (آل عمران ۱۳۳-۱۳۴)

دوڑو مغفرت کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین جیسی ہے۔ جو ان متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو خرچ کرتے ہیں خوش حالی میں بھی اور تنگی میں بھی، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اللہ ایسے نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے۔

جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرے اور بندوں کے حقوق نہ پہچانے اس کا مال ناپاک ہو جاتا ہے اور ناپاک مال میں جینے والا صاحب تقویٰ نہیں ہو سکتا۔ تقویٰ کا مقام بلند مال کے تزکیہ کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا مستحق ہوتا ہے۔

وَسَیُجَنَّبُہَا الۡاَتۡقَی ﴿ۙ۱۷﴾ الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿ۚ۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی ﴿ۙ۱۹﴾ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی ﴿ۚ۲۰﴾ وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ﴿۲۱﴾ (اللیل ۱۷-۲۱)

جہنم سے وہ شخص دور رکھا جائے گا جو بڑے تقویٰ والا ہے، جو اپنا مال اس غرض سے دیتا ہے کہ پاک ہو جائے اس پر کسی کا احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب اعلیٰ کی رضا جوئی چاہتا ہے اور وہ ضرور اس سے خوش ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ سے نماز اور روزہ کی طرح انفاق میں بھی جان آجاتی ہے، خلوص پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ریاکاری اور ورب سے پاک ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی عمل کی مقبولیت کی یہ سب سے پہلی شرط ہے[۵]

۱۴۔ تقویٰ یہ ہے کہ مواقع حاصل ہونے کے باوجود آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچا رہے۔ معصیت خود آواز دے تو بھی ٹھکرا دے۔ جنسی جذبات پر قابو پانا بہت دشوار ہے۔ جو لوگ کڑی آزمائشوں میں اخلاقی قدروں کو پامال ہونے نہیں دیتے اور ان پر جمے رہتے ہیں وہ بھی اس میدان میں پھسل جاتے ہیں۔ لیکن تقویٰ اس میدان میں بھی آدمی کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ حسن، جوانی، دولت اور جاہ و منصب اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ معصیت کی دعوت دیتے ہیں لیکن حضرت یوسفؑ عین عہد شباب میں خدا کے خوف سے پکار اٹھتے ہیں۔

رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ ۚ وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ

اے میرے رب مجھے یہ عورتیں جس کام کی طرف بلا رہی ہیں، اس سے قید خانہ بہتر ہے۔ اگر تو نے

---

[۵] جو لوگ اقامت دین کے داعی ہیں ان کے اندر نماز اور انفاق دونوں خوبیوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب "اسلام کی دعوت" مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ٥ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥ (یوسف: ۳۳، ۳۴)

ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہیں کیا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ ان کے رب نے ان کی دعا سن لی اور ان سے ان عورتوں کے مکر کو دفع کر دیا۔ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تقویٰ کا یہ وہ مقام بلند ہے جہاں بندہ اس بات کا مستحق قرار پاتا ہے کہ قیامت کے روز جب کہ زمین و آسمان تپ رہے ہوں گے اور کہیں کوئی سایہ نہ ہوگا، عرش الٰہی کے سایہ میں اسے جگہ دی جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سات قسم کے افراد کو قیامت کے ہولناک دن عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔

رجل دعته امراة ذات حسب وجمال فقال انی اخاف الله (بخاری و مسلم)

وہ شخص جسے کوئی خاندان والی اور خوب صورت عورت معصیت کی دعوت دے اور وہ اس کے جواب میں کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔

۱۵۔ تقویٰ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں آدمی اس قدر حساس ہو کہ چھوٹی سے چھوٹی لغزش بھی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے اور زندگی بے خبری اور بے خوفی کی نذر نہ ہونے پائے۔ کبھی غفلت طاری بھی ہو تو آدمی اچانک چونک پڑے، تلافی کے لئے بے چین ہو جائے، غلطی پر اصرار نہ کرے اور معصیت پر قائم نہ رہے۔ تڑپ کر اللہ کی طرف پلٹے اور اس کے دامن رحمت و مغفرت میں پناہ ڈھونڈے۔

حضرت آدمؑ شیطان کے دھوکہ سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر قائم نہ رہ سکے۔ غلطی کا احساس ہوتو فوراً توبہ کی اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔ جب مغفرت کے لئے اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو رحمت و مغفرت کی بارش شروع ہو گئی۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ٥ (البقرہ: ۳۷)

پس آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے (ان کے ذریعہ توبہ کی) اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ توبہ قبول کر لی بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت آدمؑ کی اولاد کو بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ رویہ آسان نہیں ہے۔ جرم کا ارتکاب جتنا آسان ہے اعتراف جرم اتنا ہی دشوار ہے۔ یہ شیطان کے حملہ کے جواب میں پلٹ کر اس پر وار کرنا اور اس کے اثرات کو ختم کرنا ہے۔ اس کی قوت اور طاقت تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ

بے شک جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو شیطان

طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۞ (الاعراف: ۲۰۱)

کی طرف سے کوئی برا خیال چھو جاتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اور پھر ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ صحیح راہ دیکھنے لگتے ہیں۔

متقیوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں ایک وصف یہ بھی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۞ (آل عمران: ۱۳۵، ۱۳۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرنے لگتے ہیں اور اس سے اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ معاف کرے اور وہ جانتے بوجھتے اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کی طرف سے ان کی بخشش ہے اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے کیسا اچھا بدلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا

نیکی کے تصور سے اعمال سے بھی بعض اوقات غرورِ تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو بغیر کسی نیک عمل کے ہی یہ مرض لگ جاتا ہے۔ یہ بڑا موذی مرض ہے اور انسان کی شخصیت کو کھا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ تقویٰ ہی کیا جو انسان کو پندار سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ اگر اس دنیا میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی سعادت ملی ہے تو یہ سراسر اس کا فضل ہے۔ کتنا بڑا نادان ہے وہ شخص جو اس فضلِ عظیم کا ادراک نہ کرے اور اسے اپنا کارنامہ سمجھ بیٹھے۔ بعض بدوی اپنے اسلام لانے کا اس طرح ذکر کرتے تھے جیسے انھوں نے اللہ اور اس کے رسول پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ (حجرات: ۱۷)

یہ تم پر اپنے اسلام لانے کا احسان جتاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو۔ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔ اگر واقعی تم اپنے ایمان میں سچے ہو۔

یہود سیرت و کردار کے لحاظ سے بالکل کھوکھلے ہو چکے تھے۔ لیکن انھیں اپنے تقویٰ اور دین داری پر ناز و غرور تھا۔ وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق کی اولاد تھے اس لئے سمجھتے تھے کہ خدا کے محبوب اور مقرب ہیں اور جنت

ان کی میراث ہے۔ یہ غرور ان کے مرتبہ و مقام کو تو اونچا نہیں کرتا تھا البتہ اس سے ان کی فہرست جرائم میں ایک اور اضافہ ہوتا تھا۔ قرآن مجید نے ان کی اس جہالت کا ذکر ایک جگہ اس طرح کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ٥ (النساء: ۴۹)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے تقویٰ اور پاکیزگی کا چرچا کرتے ہیں (اس کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں) صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (ایمان و عمل کی توفیق دے کر) جس کا چاہتا ہے تزکیہ فرماتا ہے۔ ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔

تقویٰ پندار تقویٰ سے حاصل نہیں ہوتا اور اپنی بزرگی کا اعلان کسی کو بزرگ نہیں بنا دیتا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے اندر تقویٰ کا جوہر ہے اور کتنا ہے؟ ارشاد ہے۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ٥ (النجم: ۳۲)

اپنے آپ کو مقدس مت سمجھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تقویٰ والے ہیں۔

حقیقی تقویٰ تکبر اور پندار سے پاک ہوتا ہے اور تواضع اور خاکساری پیدا کرتا ہے۔ انسان کی نظر اپنے اعمال پر نہیں ہوتی کہ وہ اترانے لگے بلکہ وہ اپنی کمزوریوں کو دیکھتا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرسکتا ہے اور وقت آنے پر بے دریغ قربان کر بھی دیتا ہے لیکن اس کی فکر میں اتنی رفعت ہوتی ہے اور وہ اتنی بلندی سے دیکھتا ہے کہ اسے اپنے بڑے بڑے کارنامے بھی حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وہ خدا کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے بھی سوچتا ہے کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا ہے۔ یہ تو شاہنشاہِ کائنات کے دربار کے قابل ہی کہاں ہے؟ وہاں زرِ خالص قبول کیا جاتا ہے اور میرے اعمال میں کھوٹ ہی کھوٹ ہے۔ سوچئے! کتنی بلند ہے اس کی پرواز اور کتنی پاکیزہ ہے اس کی فکر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا

بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ وہی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کرکے انہیں

سمعون د (المومنون: ۵۷-۶۱) پا لینے والے ہیں۔

تقویٰ کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ تقویٰ نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس سے نیکیاں ابلتی ہیں۔ آدمی معصیت سے دور رہتا ہے اور اطاعت کے نور سے اس کی زندگی جگمگانے لگتی ہے، خدا کا خوف اس کی شخصیت کو زینت عطا کرتا ہے۔ اس کا کردار نکھرتا چلا جاتا ہے، سیرت کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی یاد اس پر چھا جاتی ہے اور اس کے تمام اعمال اس کی رضا کے تابع ہو جاتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہمیں تقویٰ کی زندگی گزارنے کی توفیق دے اور قیامت میں متقیوں کے ساتھ ہمیں اٹھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ اور تزکیہ کے لئے جو دعائیں فرمائی ہیں ان میں سے ایک دعا یہ ہے اَللّٰھُمَّ آتِ نَفْسِی تَقْوَاھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکَّاھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَا یُسْتَجَابُ لَھَا (مسلم، کتاب الذکر والدعاء ... باب التعوذ من شر ما عمل ... باب الاستعاذۃ من العجز ... والاستعاذۃ من دعاء لا یستجاب) یہ دعا بتاتی ہے کہ تقویٰ کے لئے اس کی حقیقی طلب کا پایا جانا ضروری ہے۔ بے طلب کے یہ دولت بے بہا ہاتھ نہیں آتی۔ یہی طلب یہاں خوب صورت پیرایہ دعا میں ڈھل گئی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ اور تزکیہ کسے کہتے ہیں اور نفس کو کن کمزوریوں سے پاک ہونا چاہئے؟ اس کا تزکیہ یہ ہے۔ اے اللہ! میرے نفس کو اس کے تقویٰ سے نواز دے، اس کا تزکیہ فرما دے، تو اس کا سب سے اچھا تزکیہ کرنے والا ہے۔ تو اس کا سرپرست اور اس کا آقا ہے، اے اللہ! میں تجھ سے پناہ کا طالب ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے دل سے جس میں تیری خشیت نہ ہو، ایسے نفس سے جس کا پیٹ نہ بھرے اور ایسی دعا سے جس کے لئے در قبولیت نہ کھلے۔ اسی دعا پر یہ مضمون ختم ہوتا ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

صداقت کا اسلامی تصوّر

جناب محمد اسلام عمری

صداقت اور سچائی کی ہر زمانہ میں بڑی قدر و منزلت رہی ہے۔ لوگوں نے اس خوبی کے انسان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور صادق انسان معاشرہ میں ہمیشہ معزز رہا ہے۔

صداقت صدق سے مشتق ہے۔ جو کذب کا ضد ہے۔ اس کا معنی ہے سچائی اور وعدہ وفائی۔[1] سچائی نام ہے زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کا۔ دل میں جو کچھ ہے، اس کے خلاف اگر زبان سے اظہار ہو رہا ہو تو اس کا نام نفاق ہے۔[2] اسلام کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی طرح دل میں جو بات ہو اس کے خلاف عمل کو بھی جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو اپنے قول و عمل میں سچا نہیں اس کا دل نفاق کی آماجگاہ بن سکتا ہے۔ لیکن جو صداقت شعار ہے وہ برائیوں سے دور رہے گا اور اچھائیاں اس کے اندر ابھریں گی۔ سچائی کی عادت انسان کو بہت سے غلط کاموں سے بچا دیتی ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ" زبان دل سے ہم آہنگ ہو، عمل اور قول میں مطابقت ہو، ظاہر و باطن ہم رنگ ہوں، عقیدہ اور فعل میں یکسانیت ہو، یہ باتیں صدق کے مظاہر ہیں اور انسانی زندگی کا ظاہر و باطن انہی کی بدولت روشن ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسانی زندگی کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے"۔[3]

اسلام نے صداقت کی جو تعلیم دی ہے اس میں بڑی وسعت ہے۔ عقیدہ و فکر کی استواری سے لے کر قول و عمل کی تمام صورتیں اس میں داخل ہیں۔ اسلام ہمیشہ انسانوں سے صحیح تصور حیات قائم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اس کے لئے وہ توحید خالص کا تصور پیش کرتا ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو صحیح تصور مل جائے تو اس کا اظہار اس کے قول و عمل سے بھی ہوتا ہے۔

سچائی کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً زبان[1] کی سچائی، دل[2] کی سچائی، اور عمل[3] کی سچائی۔ زبان کی سچائی

---

[1] المنجد مادہ ص، دق [2] سورہ احزاب ۲۰، میں صدق کو نفاق کے مقابل میں بیان کیا گیا ہے۔

[3] امین احسن اصلاحی۔ تدبر قرآن ۱/۴۲۵، طبع سوم اگست ۱۹۷۶ء انجمن خدام القرآن۔ لاہور

یہ ہے کہ ہمیشہ صحیح بات کہی جائے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد ہو سکتا ہے فرمایا ہو سکتا ہے پھر پوچھا کیا بخیل ہو سکتا ہے، جواب دیا ہو سکتا ہے پھر دریافت کیا کہ کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے فرمایا نہیں[1] مطلب یہ کہ مومن میں دوسری اخلاقی کمزوریاں ہو سکتی ہیں مگر اس کی سیرت جھوٹ کی گندگی سے آلودہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ جوہر ایمان کے سراسر خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے یہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے اسی طرح آدمی سچ بولتا جاتا ہے یہاں تک کہ خدا کے یہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے[2]

دل کی سچائی کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ قرآن حکیم نے دل کے خلاف اعمال کو بھی جھوٹ سے تعبیر کیا ہے منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے لیکن ان کا یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا۔ اس لئے قرآن حکیم نے ان کے اس دعوی کی تردید کی اور ان کا پردہ فاش کر دیا۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (المنافقون) 　　اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافقین قطعی جھوٹے ہیں۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ "شہادت دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک وہ اصل بات جس کی شہادت دی جائے، دوسری اس بات کے متعلق شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ اب اگر بات بجائے خود بھی سچی ہو اور شہادت دینے والے کا عقیدہ بھی وہی ہو جس کو وہ زبان سے بیان کر رہا ہو تو ہم لحاظ سے وہ سچا ہوگا اور اگر بات اپنی جگہ جھوٹی ہو لیکن شہادت دینے والا اس کے حق ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو تو ہم ایک لحاظ سے اس کو سچا کہیں گے کیونکہ وہ اپنا عقیدہ بیان کرنے میں صادق ہے اور ایک دوسرے لحاظ سے جھوٹا کہیں گے کیوں کہ جس بات کی وہ شہادت دے رہا ہے وہ بجائے خود غلط ہے۔ اس کے برعکس اگر بات اپنی جگہ سچی ہو لیکن شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ اس کے خلاف ہو تو ہم اس لحاظ سے اس کو سچا کہیں گے کہ وہ صحیح بات کی شہادت دے رہا ہے اور اس لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے کہ اس کا اپنا عقیدہ وہ نہیں جس کا وہ زبان سے اقرار کر رہا ہے"[3] یہاں منافقین نے قسم کھا کر اپنے قول کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بات بات پر قسم کھانا ایک طرح کی کمزوری کا اظہار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس آدمی کو اپنے قول پر اعتماد ہوتا ہے وہ بے ضرورت قسم نہیں کھاتا لیکن جس کو

---

[1] موطا امام مالک: باب ما جاء فی الصدق والکذب　[2] بخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ تعالیٰ اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین۔ مسند احمد ۱/۳۶۴ ترمذی، ابواب البر والصلہ، باب ما جاء فی الصدق والکذب۔　[3] تفہیم القرآن، ۶ / ۱۱۵ طبع ستمبر وفروری ۱۹۸۰ء، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

اپنے قول پر بھروسہ نہیں ہوتا اس کا واحد سہارا قسم ہوتی ہے۔[1]

منافقین کو اپنے جھوٹے رویہ کی وجہ سے دنیا میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قیامت کے روز بھی انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (البقرہ: ۱۰)

ان کے دلوں میں مرض تھا تو اللہ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں۔

نفاق کی بیماری پیدا ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ آدمی زبان سے وعدے کچھ کرتا ہے اور عمل سے ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ جھوٹ بولنا اس کا شیوہ بن جاتا ہے، "اچھی یا بری خصلت خود اختیار کرنے اور کثرت ممارست و مزاولت سے وہ دائمی بن جاتی ہے۔ بُری خصلت کے اسی دوام و استحکام کو کبھی کبھی ختم و طبع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[2]

اسلام کے نزدیک کسی برائی پر اصرار کرنا بہت سنگین جرم ہے۔ نفاق بھی ایک بُرائی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے اس پر اصرار اور اس کی افزائش کی سخت مذمت کی ہے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ (التوبہ: ۷۷)

(وعدہ خلافی کے پاداش میں) خدا نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے لئے نفاق جما دیا جس دن وہ اس سے ملیں گے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نفاق کی پرورش پر ایک مدت صرف کر دی ہے یہ چیز اتفاقاً ان کے اندر نہیں گھس آئی ہے۔ بلکہ ان کے دانستہ نقض عہد اور طویل جھوٹ اور فریب کا نتیجہ ہے جس سے ان کی جان اب مر کے ہی چھوٹے گی۔ ان سے توبہ و اصلاح کی امید نہیں رکھنی چاہیے"[3]

عمل کی صداقت کا معاملہ اور بھی مشکل ہے۔ دل سے کسی بات کو تسلیم کر لینا اور زبان سے اس کا اقرار

---

[1] تدبر قرآن: ۸/ ۳۹۸، طبع اول، نومبر ۱۹۸۰ء فاران فاؤنڈیشن لاہور

[2] حاشیہ، مولانا شبیر احمد عثمانی/ ۲۵۷، مدینہ پریس، بجنور ۱۹۷۰ء

[3] تدبر قرآن: ۳/ ۲۰۱ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

اتنا مشکل نہیں ہے جتنا عمل کے ذریعہ کسی عقیدہ یا خیال کی صداقت کا ثبوت دینا مشکل ہے۔ ارادہ کی پختگی بھی صدق عمل میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۱۵)	مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔

عمل کی صداقت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ ایمان نہایت پختہ ہو۔ سورہ حجرات کی اس آیت میں مومنین صادقین کی تعریف میں جاھدوا باموالھم وانفسھم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایمان کمزور نہیں بلکہ نہایت پختہ ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول ایک شخص اگر ایک نصب العین کے لئے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا تو یہ ایک ناقابل انکار شہادت اس بات کی ہے کہ اس نصب العین کی صداقت سے اسے پورا یقین ہے اور اگر وہ اس کی خاطر نہ مال قربان کرنے پر تیار ہے نہ اپنی جان کو کسی خطرہ میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اگرچہ وہ اس عشق میں کتنی ہی لاف زنی کرے لیکن اس کا عمل گواہ ہے کہ وہ اس باب میں ابھی مبتلائے شک ہے۔[1]

قول و عمل میں مطابقت بہت ضروری ہے۔ یہ بات ایک مومن کی شان کے خلاف ہے کہ دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لائے، زبان سے اس کا اقرار بھی کرے اور عمل اس کے خلاف ہو۔ صحابہ کرام کی زندگی میں بہت ساری مثالیں ایسی مل جائیں گی جنھوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم و ارادہ کو پورا کر دکھایا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بہت خوبیوں کی مالک ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں ایک صفت صداقت بھی ہے۔ خدا سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (النساء ۸۷)	اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے

اللہ تعالیٰ نے صادقین سے ایسی نعمت بھری جنت کا وعدہ کیا ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (الاحقاف ۱۶)	یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے جنت والوں کے ساتھ یہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جا رہا ہے۔

---

[1] تدبر قرآن ۷/۵۰۱ فاران فاؤنڈیشن لاہور طبع دوم اکتوبر ۱۹۸۲ء

اللہ تعالیٰ سچا ہے، اس لئے اس کی شریعت، اس کے تمام انبیاء اور اس پر ایمان لانے والے بھی سچے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سچوں سے ایسی بے پایاں نعمت کا وعدہ کیا ہے۔ "وعد الصدق" مصدر مؤکد ہے یعنی نیک صفت انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ سچا اور پکا وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جنت میں کہیں گے

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (الزمر: ۷۴)	وہ کہیں گے شکر ہے اس اللہ کے لئے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔

قیامت کے دن منکرین خدا بھی اللہ اور اس کے رسول کی صداقت کا اعتراف کریں گے۔

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یٰسین: ۵۲)	وہ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا۔ یہ تو وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں کی بات سچ نکلی۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ یہ نہیں بتاتی ہے کہ قول کس گروہ کا ہے۔ لیکن اس بات کا امکان ضرور ہے کہ یہ کفار کا قول ہو۔ کیونکہ دنیا میں جب اللہ کے رسول ان کو قیامت کی باتیں بتاتے تھے تو وہ اس کو جھٹلا دیتے تھے لیکن جب قبر سے اٹھائے جائیں گے تو معاملہ کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی اور وہ خود ہی اپنے دلوں میں کہیں گے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر خدا کے رسول ہمیں دنیا میں دیتے تھے اور ہم اسے جھٹلایا کرتے تھے۔[1]

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کو کفار صادق سمجھتے تھے۔ کیونکہ بعض اوقات وہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس بھیجے گئے، انھوں نے اس کے سامنے حق بات رکھی مگر وہ بگڑ گیا اور کہنے لگا کہ اس کو قتل کر دو۔ اس وقت ایک مرد مومن نے جو اس وقت اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا تمام درباریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ	کیا تم لوگ ایک شخص کو اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ درآنحالیکہ وہ تمہارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں بھی لے آیا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا اور اگر

[1] تفہیم القرآن: ۴/۲۶۶ طبع دوم ۱۹۶۹ء مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند

مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ـــــــــ تو اس کا کوئی حصہ تم کو پہونچ کے
(المؤمن: ۲۸) رہے گا جس کی وہ تم کو وعید سنا رہا ہے اللہ اس کو بامراد
نہیں کرے گا جو حد سے گزرنے والا اپاٹیا ہوگا۔

قرآن حکیم نے ایمان و توحید پر قائم رہنے والوں اور شرک سے بری لوگوں کو صادقین کہا ہے اور ان کے اس فعل کو صدق سے تعبیر کیا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ آج سچوں کو ان کی سچائی کے نفع پہونچانے
صِدْقُهُمْ (مائدہ: ۱۱۹) کا دن ہے۔

توحید کی دولت انسان کی زندگی میں بڑی قیمت رکھتی ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت میں صادقین سے مؤحدین اور صدق سے توحید مراد لیا ہے[1]۔ یعنی قیامت کے دن مؤحدین کو اللہ تعالیٰ ان کے توحید کا بدلہ دے گا۔ قرآن حکیم نے وعدہ پورا کرنے والوں کو بھی صادق کہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو جب پیدا کیا تو ان سے اپنی ربوبیت کا وعدہ لیا۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ اور یاد کرو جب نکالا تمہارے ربّ نے بنی آدم سے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ ان کی پیٹھوں سے ـ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ
عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ٹھہرایا خود ان کے اوپر، پوچھا کیا میں تمہارا رب
قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (الاعراف: ۱۷۲) نہیں ہوں۔ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔

قرآن حکیم نے اس عہد (ربوبیت) کے پورا کرنے والوں کو صادق اور بے وفائی کرنے والوں کو کافر کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق ایمان کے مظاہر میں سے ایک بڑا مظہر ہے۔

لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ تاکہ اللہ راست بازوں سے ان کی راست
وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا باری کی بابت سوال کرے اور کافروں کے لئے اللہ
(الاحزاب: ۸) نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس سے ماقبل آیت میں اس عہد و میثاق کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء سے لیا تھا۔ بعض لوگوں نے اس میثاق سے ذریت آدم کی پیدائش کے وقت کا میثاق مراد لیا ہے[2]۔

---

[1] مختصر تفسیر ابن کثیر، ۱/ ۵۶۶ دار القرآن الکریم، بیروت ۱۴۰۲ھ
[2] مختصر تفسیر ابن کثیر ۳/ ۸۳

انبیاء کرام جو تاریخ انسانی کے گل سرسبد ہوتے ہیں۔ ان کے اندر صداقت کی صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، بلکہ وہ ہمیشہ صداقت کا پیکر ہوتے ہیں۔ ان کی نبوت کی ساری بنیاد ہی صداقت پر مبنی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے انبیاء کرام کی صداقت پر کئی طرح سے دلیلیں ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرنے والی قوم کی عادت کذب رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی کی تعلیم صداقت کے اصول پر ہی کارفرما رہی ہوگی اسی طرح ان باغی قوموں نے قیامت کو بھی جھٹلایا جو ایک اٹل حقیقت ہے۔ قرآن حکیم نے انبیاء کرام کا نام لے لے کر ان کی صداقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیم[۱]، حضرت اسماعیل[۲]، ادریس[۳] اور یوسف[۴] وغیرہ کے اندر یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔

صحابہ کرام کی معاشرتی زندگی میں صداقت کو بڑا مقام حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ صحابہ کے نزدیک جھوٹا شخص سے زیادہ مبغوض کوئی شخص نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ اگر کوئی شخص آپ کے پاس جھوٹ بولتا تو آپ اس کے خلاف ہی رہتے یہاں تک کہ یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے جھوٹ سے توبہ کر لیا ہے[۵]

حضرت انس بن نضرؓ ایک مشہور صحابی ہیں، ان کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں مل سکا تھا، اس کی تلافی کے لئے انھوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤں گا۔ چنانچہ وہ غزوۂ احد میں شریک ہوئے، نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، مشرکین نے ان کا مثلہ کر دیا تھا، انھیں کوئی شخص پہچان نہیں سکتا تھا سوائے ان کی بہن کے جنھوں نے ان کی انگلیوں کو دیکھ کر پہچان لیا[۶]۔ ایفائے عہد کی یہ بہترین مثال تھی۔

صحابہ کرام میں انصار کے اندر صداقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جب مکہ فتح ہوا تو مال غنیمت قریش کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، اس تقسیم سے انصار کو کسی قدر ناانصافی کا احساس ہوا۔ کہنے لگے کہ اب تک ہماری تلوار سے خون ٹپک رہا ہے اور مال غنیمت قریش کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچی، آپ نے ان کو جمع کیا اور معاملہ کی تحقیق فرمائی، چنانچہ انھوں نے اقرار کیا کہ صحیح بات آپ تک پہونچی ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ انصار کی شان میں کہتے ہیں کہ "وکانوا لایکذبون"[۷] وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

---

[۱] سورۂ مریم: ۴۱۔ [۲] مریم: ۵۴۔ [۳] مریم: ۵۶۔ [۴] یوسف: ۴۶۔ [۵] مسند احمد: ۱۵۲/۶
[۶] بخاری، کتاب الجہاد، باب قول اللہ تعالیٰ من المؤمنین رجال صدقوا الخ
[۷] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اعطاء المؤلفۃ ومن یخاف علی ایمانہ

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے قبیلہ کی تعریف فرمائی۔ حضرت ابواسیدؓ اس وقت موجود تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "انصار کا بہترین قبیلہ بنونجار ہے، پھر بنوعبدالاشہل، پھر بنوحارث، پھر بنوساعدہ اور انصار کے ہر قبیلہ میں بھلائی ہے"[1]۔ راوی حدیث حضرت ابواسیدؓ کا تعلق قبیلہ بنوساعدہ سے تھا، آپ نے جس ترتیب سے نام لیا تھا اس اعتبار سے ان کے قبیلہ کا نام سب سے آخر میں ہے۔ اگر وہ چاہتے تو سب سے پہلے اپنے قبیلہ کا نام لے سکتے تھے۔ لیکن یہ صداقت شعاری کے بالکل خلاف تھا، اس لئے انھوں نے بالکل صحیح ترتیب سے بیان کیا۔ یہی معاملہ تمام راویان حدیث کا ہے کہ انھوں نے بغیر کسی تبدیلی اور حذف و اضافہ کے تمام حدیثیں بیان کردیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرہ کی بنیاد افراد ہی پر ہوتی ہے۔ ان کی انفرادی زندگی کی درستگی ہی سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ حضرات صحابہ کرام کی انفرادی زندگی میں بھی صداقت کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر کیا جارہا ہے۔ حضرت کعب بن مالکؓ ان تین اشخاص میں سے ایک ہیں جو غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوسکے تھے۔ چنانچہ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ غزوۂ تبوک سے واپس مدینہ تشریف لائے تو تمام لوگ اپنی عدم شرکت کی معذرت کرنے لگے۔ میں نے سوچا کہ جھوٹ بول کر چھٹکارا حاصل کرلوں گا" و طفقت اتذکر الکذب"[2] لیکن جب آپ میری طرف متوجہ ہوئے تو مجھ سے یہ نہ ہوسکا۔ جو بات تھی صاف صاف عرض کردی، آپ نے سن کر فرمایا "اچھا جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادے۔

خیر کے معاملہ میں صحابہ کی طرح صحابیات بھی بازی لے جانے کی کوشش کرتی تھیں، اچھی صفات سے ان کی زندگیاں بھی آراستہ تھیں، حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کا نکاح حضرت زبیرؓ سے ہوگیا، وہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں، لیکن ان کو روٹی پکانا نہیں آتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے پڑوس کی عورتوں سے پکوا لیا کرتی تھیں، ان کا یہ کام انھیں بہت پسند آتا تھا، چنانچہ وہ اپنے پڑوس کی عورتوں کے سلسلہ میں تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں وکن نسوۃ صدق[3] (وہ صداقت شعار عورتیں تھیں) ان کی تعریف کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ عام طور سے عورتیں اس کام کے لئے جلد تیار نہیں ہوتی ہیں اور ہوتی بھی ہیں تو خیانت سے نہیں چوکتی ہیں، اس کے مقابل میں وہ عورتیں سچی اور امانت دار تھیں کیوں کہ ان کا یہ عمل خلوص و للہیت پر مبنی تھا۔

---

[1] مسلم کتاب الفضائل باب فضائل الانصار [2] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک۔
[3] مسلم کتاب السلام باب جواز ارداف المرأۃ الا جنبیہ اذا اعییت فی الطریق۔

صداقت کی صفت کیسے پیدا ہوتی ہے اور اس کو کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے، اس کا جواب متعین طور سے دینا مشکل ہے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ صحبت اور معیت سے اخلاق و کردار سازی میں بڑی مدد ملتی ہے۔
"اگر آدمی کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا کافروں، منافقوں اور جاہلوں کے ساتھ ہو تو کم زور تو در کنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ ان کا اثر قبول کرلیتا ہے۔ اسی طرح راسخ الایمان اور راسخ العمل لوگوں کے فیض صحبت سے کم زور آدمی کے اندر بھی اپنی کم زوریوں پر غالب آنے کا حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ صحبت اور معیت کے اسی اہمیت کے پیش نظر ان لوگوں کو جو دارالکفر میں پڑے ہوئے تھے ہجرت کر کے دارالاسلام میں آنے کا حکم ہوا اور مسلمانوں کو جو مدینہ کے اطراف دیہاتوں میں آباد تھے یہ ہدایت ہوئی کہ ان کی جماعتیں برابر باری باری حصول تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ آتی رہیں۔ تاکہ ان کا ربط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے قائم رہے۔"[1]

---

[1] تدبر قرآن ۳/۴۰۹

(بقیہ مدارس میں سائنس کی تعلیم)

مدارس اور طلبہ مدارس کی تقدیر ان کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے۔ یہاں کے مخصوص حالات کا انھیں علم ہے، کس چیز کی اور کتنی مقدار میں ضرورت ہے ان تمام باتوں سے یہ واقف ہوتے ہیں۔ مدارس میں ضرورت اس بات کی تھی کہ عالمیت کے ابتدائی سالوں میں جو قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیاسیات، معاشیات، منطق اور فلسفہ جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں آخری سالوں میں کسی موضوع پر تخصص کرایا جائے۔ خود مذکورہ بالا مضامین میں سے کسی پر تخصص ایک مسئلہ تھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب حکومت کی طرف سے آواز اٹھی اور سائنسی مراکز نے اس تجویز سے متعلق کانفرنس اور سمینار کرائے تو بعض علماء مدارس نے اپنے قلم کا سارا زور صرف کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کردی کہ تعصب، بے جا ہٹ دھرمی و تنگ نظری کا واحد علاج اور علماء کی معاشی بدحالیوں کا حل اسی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں ہی مضمر ہے۔

(بقیہ تنقید و تبصرہ)

یہ بات ارباب حل و عقد فی الجملہ تسلیم بھی کرتے ہیں مگر عملاً اس طرف موثر اقدامات نہیں کئے جاتے، رحمانی صاحب نے اس مقالہ میں مہاراشٹرا کی نصابی کتابوں کا اسی نقطہ سے جائزہ لیا ہے، اور ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جن سے فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر ریاست کا دانشور طبقہ اس طرف متوجہ ہو، ان مقامات کی نشاندہی کرے جو تاریخی اور اخلاقی نقطہ نظر سے قابل اصلاح ہیں اور پھر ان کی اصلاح کی کوشش کی اور کرائی جائے۔ محمد سعود عالم قاسمی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی خدمات کا ایک جائزہ

محمد مسعود عالم قاسمی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ جامع کمالات اور ہمہ پہلو شخصیت کے حامل تھے، اس لیے ان کی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع اور مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ شاہ صاحب اگر ایک طرف سماجی مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف ایک عظیم سیاسی مبصر کے طور پر ابھرتے ہیں۔ ایک طرف وہ معاشی اصلاحات کے داعی ہیں تو دوسری طرف علوم و فنون کی تشکیل نو کے مبلغ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ ملک کے ہر طبقہ کو اس کے منصبی فرائض یاد دلاتے ہیں اور دوسری طرف روحانی پیشوا اور باطنی امراض کے معالج دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی ان متنوع خدمات کو دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

ایک تو وہ خدمات ہیں جو ان کے دور کے خاص حالات اور ماحول کے سبب انجام پائیں، مثلاً شاہ صاحب نے اپنے وقت کے امراء، صنعت گر، سیاسی صوفیا، علما، اور عوام کو خطاب کیا۔ اسی طرح شاہ صاحب کی سیاسی جدوجہد، شاہ ابدالی کے نام خط اور ان کو ہندوستان آنے کی دعوت دینا، سکھوں اور مرہٹوں کی شورش کا علاج تجویز کرنا وغیرہ۔ یہ ساری خدمات اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو انہی حالات کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کوئی بھی مصلح اپنے زمانہ کے حالات اور مسائل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر اپنے ماحول میں جیتا اور کام کرتا ہے تو اسے لازماً اس کے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور یہ انبیائی طریقہ کار بھی ہے۔ دوسری وہ خدمات ہیں جو خالص علم و فکر کی تہہ میں اتر کر پورے دین، سارے مسلمان اور ہر دور کے حالات کو پیش نظر رکھ کر انجام دی گئیں۔ گو کہ ان خدمات کا بھی مقامی اور عصری پس منظر ہے تاہم وہ خدمات ہر دور کے لئے یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان خدمات سے امت کے علمی اور ثقافتی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ یہی اصل کارنامہ ہے جس سے شاہ صاحب کے علمی عطیات کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اور یہی کام شاہ صاحب کی عبقریت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسے ہم علمی خدمات سے موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ خدمات اس قدر وسیع ہیں کہ بعد کے مورخوں اور مبصروں کو اس پر

حیرت ہوتی ہے کہ شدید ہنگامی حالات میں شاہ صاحب نے یہ ٹھوس علمی خدمات کیونکر انجام دیں۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

"ایک طرف ان کے زمانہ اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانہ میں نشو و نما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و سیر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم، اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ جاتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گرد و پیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و غارت، جبر ظلم اور بدامنی وطوائف الملوکی کا طوفان تھا۔"[1]

شاہ صاحب کی علمی خدمات کے بھی دو پہلو ہیں، ایک تعلیم و تدریس جس کے ذریعہ انھوں نے علما اور ماہرین فن کی ایک ٹیم تیار کی، جنھوں نے ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ اور دوسرا پہلو تصنیف و تالیف ہے شاہ صاحب نے اسلامی موضوعات پر ایک قیمتی سرمایا چھوڑا۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق شاہ صاحب کی مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی باون کتابیں ہیں۔ ذیل میں ان کی خدمات کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

تدریسی خدمات

شاہ صاحب نے یوں تو اپنے والد کی وفات کے بعد ہی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا مگر سفر حجاز کی وجہ سے ایک عرصہ تک یہ سلسلہ منقطع رہا، جب وہ حجاز سے علوم نبوت کی سوغات اور خدمت دین کا تازہ ولولہ لے کر ہندوستان واپس آئے تو پھر مسند تدریس سنبھالی، اور باقاعدہ تعلیم و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ یہ سلسلہ شاہ صاحب نے اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ واقع مہندیان میں شروع کیا۔[2] اللہ نے آپ کے کام میں برکت دی اور طلبہ جوق در جوق آپ کی خدمت میں آنے لگے، جب طالبان دین

---

[1] تجدید احیائے دین ص ۹۶-۹۸ [2] حیات ولی ص ۱۱۳

کی کثرت ہوئی اور یہ چھوٹا سا مدرسہ ان سب کے لئے ناکافی ثابت ہوا تو شاہ صاحب نے اپنی درسگاہ تبدیل کردی اور یہ نئی درسگاہ کلاں محل کی ایک طویل و عریض عمارت تھی، جسے اس وقت کے فرمانروا شاہ عالم نے شاہ صاحب کو اشاعت دین کے لیے دیا تھا[1] نئی درس گاہ میں منتقل ہونے کے بعد پرانی جگہ غیر آباد ہوگئی، اور یہ نیا مدرسہ بعد میں شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کے نام سے مشہور ہوا، اندرون شہر کی یہ عمارت شاہ صاحب کا دارالعلوم تھی جو اپنے دور کی نہایت عالی شان اور خوبصورت حویلی تھی۔ افسوس سارے یہ عمارت بغاوت ہند میں لوٹ لی گئی اور کڑی تختہ تک لوگ اٹھالے گئے[2]

شاہ صاحب کا طریقہ تدریس یہ تھا کہ پہلے وہ قرآن کی تعلیم دیتے تھے پھر حدیث شروع کراتے تھے وصیت نامہ میں شاہ صاحب نے اس طریقہ تدریس پر روشنی ڈالی ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن عظیم کا درس دینا چاہیے اس طریقے سے کہ صرف قرآن پڑھایا جائے یعنی صرف متن قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھایا جائے۔ پھر قرآن کے متن کے متعلق جو دشواری پیش آئے مثلاً نحو یا شان نزول کے متعلق تو رک کر اس کی تحقیق کی جائے جب قرآن ختم ہو جائے تب نصاب کے مطابق جلالین پڑھائی جائے، اس طریقہ میں بڑے فیوض ہیں اس کے بعد ایک ہی وقت میں صحیحین وغیرہ سے کتب حدیث پڑھائی جائیں اور کتب فقہ عقائد اور سلوک ایک وقت میں پڑھائی جائیں[3] شاہ عبدالعزیز کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے اس طریقہ کے مطابق زیادہ عرصہ تک تدریسی خدمات انجام نہ دے سکے۔ اور صرف حدیث اپنے ذمہ رکھا اور بقیہ اوقات تصنیف و تالیف اور عبادت میں صرف کرتے[4] بلکہ فتح الرحمان کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تدریس بھی انھوں نے جاری رکھی اور اسی ذریعہ سے فتح الرحمٰن کی تالیف عمل میں آئی۔ شاہ صاحب کے انداز تدریس میں غالباً یہ تبدیلی اس وجہ سے آئی کہ وہ تدریس کے علاوہ اصلاح و تجدید تصنیف و تالیف اور دیگر سیاسی امور کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو چکے تھے اس لئے وہ مدرسہ کے طلبا کو پورا وقت دے نہیں سکتے تھے ساتھ ہی انھوں نے اپنی تدریسی ذمہ داری کچھ کم کر لی تھی، اور یہ ذمہ داری ان لوگوں کو سونپ دی تھی جن کو انھوں نے اس کام کے لئے تیار کیا تھا۔ چنانچہ خود شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے کہ حضرت والد ماجد نزد یک خود کسے تیار کردہ بودند طالب ہر فن بادے می سپردند[5] بہر صورت شاہ صاحب نے تعلیم و تدریس اور بالخصوص اشاعت حدیث کے لئے جو درسگاہ قائم کی وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ دور دراز سے تشنگان علم دین کشاں کشاں اس کی طرف آنے لگے اور آس پاس کے علاقے خاص طور پر منور ہوئے، دہلی علم حدیث

---

[1] دارالحکومت دہلی ۳/۲، [2] ایضاً [3] التفہیمات الالٰہیہ جلد دوم صفحہ ۲۴۵ [4] ملفوظات صفحہ ۸۱ [5] ایضاً۔

کی اشاعت کا مرکز بن گیا۔ اس مرکز نے علم دین کی اشاعت میں وہ نمایاں کردار ادا کیا کہ آج بھی ہندو پاک میں پائے جانے والے بیشتر مدارس کے شجرہ تعلیم پر غور کیجئے تو وہ شاہ صاحب اور ان کے تیار کردہ علما تک ضرور پہونچتا ہے۔ گویا اس ایک چراغ سے ہزاروں، اور لاکھوں چراغ روشن ہوئے۔

شاہ صاحب کی تدریسی خدمات نے جن لوگوں کو نابغہ روزگار بنایا اور جو جدید ہندوستان میں علم دین کی حفاظت اور اشاعت کے پشتیبان بنے ان میں سب سے پہلے خود شاہ صاحب کے چاروں صاحب زادے لائق ذکر ہیں۔ اس خانوادہ ہی نے خدمت دین کا بیڑا اٹھایا، ان کے علاوہ مولانا معین سندھی جنھوں نے "دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب" لکھی، شاہ صاحب کے خاص شاگرد ہوئے، کشمیر کے مولانا محمد امین خصوصی شاگرد کی حیثیت سے معروف ہیں، یہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے استاد بھی تھے۔ ان کے علاوہ سید مرتضیٰ زبید بلگرامی ہ ۱۲۰۵ھ صاحب تاج العروس شرح قاموس اور اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۱۲۲۵ھ صاحب تفسیر مظہری اسی حلقہ سے متمتع ہوئے غرض کہ شاہ صاحب نے علماء اور معلمین کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو بعد کے تمام علماء کی تیاری کا سبب بنی۔ بعض علما نے اسی وجہ سے شاہ صاحب کی مثال اس شجرہ طوبیٰ سے دی ہے جس کی جڑ ان کے گھر میں ہے اور شاخیں مسلمانوں کے ہر گھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔[1]

تصنیفی خدمات:- قرآن شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن اور علوم قرآن کی اشاعت ہے، چونکہ قرآن انسانوں کی ہدایت کا دائمی سرچشمہ ہے اور مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی علمی و فکری ترقی قرآن ہی کے فہم و تدبر اور اس کے مطابق زندگی گذارنے وابستہ ہے اس لئے شاہ صاحب نے اپنی توجہ قرآن اور علوم قرآن کی تعلیم و ترویج پر صرف کی۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں قرآن مجید یقیناً پڑھا جاتا تھا، بعض فارسی کی تفسیریں اور تراجم بھی موجود تھے۔ دینی درس گاہوں میں جلالین، کشاف اور مدارک التنزیل داخل نصاب بھی تھیں مگر اس کے باوجود یہ کہنا بالکل درست ہے کہ مسلمانوں کی علی العموم قرآن سے جذباتی وابستگی ان میں علمی اور فکری پختگی پیدا کرنے کے بجائے جمود و تعطل کی نذر ہو کر رہ گئی تھی۔ نظری طور پر تو قرآن دین و شریعت کا پہلا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا مگر مسائل واحکام میں فقہی جمود اور بحث و استدلال میں فلسفیانہ موشگافیوں نے جڑ پکڑ لیا تھا محفلیں سجا

---

[1] نزہۃ الخواطر ۶/۴۰۶

بالکل تصوف اور قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھتے تھے مگر ان میں قرآن کے حلقے بنانے کا رجحان نہ تھا[1]
لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن کا سمجھنا اور اس پر غور کرنا علماء کا کام ہے اور ان کے لئے صرف اس قدر کافی
ہے کہ قرآن کی تلاوت کر لیا کریں۔ قرآن کے درس و تدریس کے ماحول میں بھی قرآن فہمی سے زیادہ تفسیر
خوانی پر توجہ صرف ہوتی تھی[2] شاہ صاحب نے مسلمانوں کو پرسوز طریقے سے سمجھایا" اگر تم انصاف سے
کام لو تو نزول قرآن کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کی جائے اور اس کی ہدایت سے
رہنمائی حاصل کی جائے۔ قرآن کا صرف تلفظ مقصود نہیں اگرچہ وہ بھی غنیمت ہے۔ مسلمانوں نے یہ کیا
شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس شخص کو کیا حلاوت
نصیب ہو سکتی ہے جو قرآن کے مدلول کو نہیں سمجھتا"[3] چنانچہ شاہ صاحب نے سلیس اور متعارف فارسی زبان میں لوگوں
کے لیے قرآن کا ترجمہ کیا جو فتح الرحمان کے نام سے مشہور ہے۔ اس ترجمہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ
ہوں اس کو پڑھیں سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی درست کریں۔ فاسد خیالات، اوہام اور غلط قسم کے رسوم
اور اعمال جو مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں ان کا خاتمہ ہو۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ" اس کتاب (فتح الرحمٰن)
کا مرتبہ متن قرآن اور فارسی کے مختصر رسائل پڑھنے کے بعد ہے تاکہ فارسی ان کی سمجھ میں بے تکلف آجائے، خاص طور پر
سپاہیوں اور اہل حرفہ کے بچوں کے لیے جو کہ علوم عربیہ کے پورا کرنے کی توقع نہیں رکھتے، سن تمیز کے پہلے ہی مرحلہ
میں اس کتاب کی ان کو تعلیم دی جانی چاہئے تاکہ ان کے اندر پہلی چیز جو داخل ہو وہ کتاب اللہ کے معانی ہوں اور ان کی
سلامتی فطرت ہاتھ سے نہ جائے، ملحدوں کے اقوال جو کہ صوفیوں کے لبادہ میں پنہاں ہو کر دنیا کو گمراہ کرتے ہیں ان کو
فریفتہ نہ کریں۔ خام معقولوں کی ہرزہ سرائی اور واہیات، ہندؤں کی بکواس ان کے لوح سینہ کو ملوث نہ کرے۔
پھر وہ لوگ جو عمر کا ایک بڑا حصہ گنوا دینے کے بعد توبہ کی توفیق پاتے ہیں مگر اسلامی علوم کو حاصل نہیں کر پاتے
یہ کتاب ان کو پڑھائی جائے، تاکہ وہ قرآن کی تلاوت میں حلاوت پائیں، اور اس کتاب کا فائدہ عام مسلمانوں
کے حق میں متوقع ہے انشاء اللہ تعالیٰ العظیم"[4]

قرآن مجید کے ترجمہ اور مختصر تفسیری حواشی کے ساتھ شاہ صاحب نے علوم قرآن کی اشاعت اسی عزم
اور اعتماد کے ساتھ کی اور اس موضوع پر ایک نہایت جامع کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر لکھی، نیز

---

[1] شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے زمانہ میں تین چیزوں کا زیادہ رواج تھا (۱) برہان یعنی یونانی علوم اور کلام سے مرکب علم (۲) وجدان یعنی تصوف اور صوفیاء کے رموز و اشارات (۳) السمع۔ یعنی علوم دین میں انتشار ملاحظہ ہو التفہیمات الالٰہیہ اول ص ۲۴۳
[2] یہ صورت حال کم و بیش آج بھی پائی جاتی ہے۔ [3] مقدمہ فتح الرحمٰن [4] ایضاً

فتح الخبیر اور مقدمہ فی قوانین الترجمہ بھی ضبط قلم کیا۔ انبیائی قصوں پر ایک اور اصولی نوعیت کی کتاب تاویل الاحادیث لکھی[1] شاہ صاحب کی قرآنی خدمات وقیع اور بے نظیر ہیں، انھوں نے اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ کتاب ہدایت کی ترویج واشاعت کے لئے اور امت کو از سر نو قرآن کی بنیادوں پر کھڑی کرنے کے لئے جامع اور منصوبہ بند طریقہ پر کام کا آغاز کیا، یہ شاہ صاحب ہی کی تحریک اور راہنمائی تھی کہ ان کے جلیل القدر صاحب زادوں نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ کا فریضہ انجام دیا۔ الفضل للمتقدم یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی اصلاح کیلئے بالخصوص اور عام انسانوں کی فلاح کے لیے بالعموم جو تحریک برپا کی وہ قرآنی تحریک تھی جو قرآن فہمی سے شروع ہوئی اور جہاد بالسیف تک بسیط ہو گئی۔ گویا شاہ صاحب کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ وہ تحریک قرآن کے داعی اور مبلغ تھے

سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس مہم کے تین نمایاں پہلو ہیں ایک تو یہ کہ مہلک رسوم ورواج اور مشرکانہ عقائد وخیالات کی وبا عام کے لئے قرآن کو موثر علاج سمجھ کر اسی حیثیت سے اسی کو متعارف کرانا، کہ جتنی قربت قرآن سے ہوگی مشرکانہ خیالات واعمال سے اسی قدر دوری ہوتی چلی جائے گی اور جب تک قرآن کی اشاعت نہ ہوگی یہ برائیاں ختم نہ ہو سکیں گی۔ دوسرے یہ کہ قانون وشریعت کی اساس اور سرچشمہ اول کی حیثیت سے قرآن کو پیش کرنا کہ زندگی کے تفصیلی معاملات میں وہی مرجع اور قول فیصل قرار پائے تیسرے یہ احساس پیدا کرنا کہ جب لوگ قرآن کی طرف رجوع کریں گے تو ان کی علمی، ذہنی اور فکری سطح بھی حسب استفادہ بلند ہوتی چلی جائے گی۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب کی اس تحریک کی وجہ سے شرک وبدعات اور فسق وفجور کا خاتمہ ہو گیا اور جاہلیت کافور ہو گئی تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ظلم وجہالت کے طوفانوں کا زور یقیناً کم ہو گیا اور صورت حال میں بہت حد تک تبدیلی آئی۔ قرآن کی اشاعت کا رجحان بڑھا اور امت قرآن خوانی کے مرحلہ سے نکل کر قرآن فہمی کے مرحلہ تک آئی۔ یہ اثرات بعد کے ادوار میں شدت کے ساتھ محسوس کئے گئے، اس وقت اردو زبان میں قرآن کریم کے سینکڑوں مکمل ونامکمل تراجم وتفاسیر موجود ہیں اگر غور کیا جائے تو ان سب پر کسی نہ کسی درجہ میں شاہ صاحب کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس دور کی اصلاحی اور انقلابی تحریکوں میں بھی شاہ صاحب کے اثرات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ کیونکہ غالباً پہلی مرتبہ ہندوستان میں شاہ صاحب نے قرآن کو بنیاد بنا کر اصلاح معاشرہ کی تحریک چلائی

---

[1] ان کتابوں کا تعارف آئندہ کرایا جائے گا۔

مولانا علی میاں کے بقول شاہ صاحبؒ نے اس مرض (شرک و بدعات) بلکہ وبائے عام کے علاج کے لئے قرآن مجید کے مطالعہ اور تدبر اور اس کے فہم کو سب سے موثر علاج سمجھا اور یہ بات محض ذہانت، قوت مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہ تھی بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی جس پر قرآن مجید خود شاہد اور نہ صرف عہد بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگزشت اصلاح و تجدید گواہ ہے [1]

حدیث:- قرآن کے بعد شریعت اسلامیہ کا دوسرا سرچشمہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اسی لئے حضور نے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے ان دو سرچشموں یعنی قرآن و سنت کو لازم پکڑنے کی تاکید فرمائی ہے۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت جس علم کے ذریعہ ہوتی ہے وہ علم حدیث ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد شاہ صاحب، دوسرے عالم ہیں جنھوں نے اس فن میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور ہندوستان میں حدیث کی اشاعت میں ان کا اہم رول ہے شاہ صاحب کے نزدیک اس فن کی کیا اہمیت ہے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے،" بلا شبہ علم یقینیہ کا معتمد علیہ سرمایہ اور سرتاج اور دینی فنون کی اساس علم حدیث ہے، جس میں افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل یا کسی بات پر آپ کی رضامندی و سکوت کا ذکر خیر ہوتا ہے، اس لئے یہ حدیثیں تاریکی میں روشن چراغ، رشد و ہدایت کا سنگ میل اور بدر کامل کا درجہ رکھتی ہیں۔ جو شخص ان پر عمل کرتا اور ان کی نگہداشت کرتا ہے تو وہ ہدایت یاب اور خیر کثیر سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اور جو اس سے اعراض اور روگردانی کرتا ہے وہ گمراہ اور ہلاک ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ کو سراسر نقصان میں مبتلا کرتا ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی امر و نہی، انذار و تبشیر اور نصیحت و تذکیر سے معمور ہے۔ اور آپ کی حدیثوں میں یہ چیز قرآن ہی کی طرح یا اس سے (مقدار میں) کچھ زیادہ ہیں [2]

حدیث رسول کی اہمیت اور ضرورت پر اس پختہ یقین ہی نے شاہ صاحب کو اس کی خدمت اور اشاعت پر کمربستہ کیا۔ ہندوستان کے علاوہ حرمین شریفین میں بھی خاص طور پر آپ نے حدیث ہی میں تخصص اور مہارت پیدا کی، پھر ہندوستان لوٹ کر اس کی اشاعت میں ایسے منہمک ہوئے کہ ہندوستان اور اس کے باہر محدث کے لقب سے مشہور ہوئے اور یہ لقب اب گویا آپ کے نام کا جزو بن گیا ہے۔ بعد کے ہندوستان میں علم حدیث کی آبیاری میں جن علماء کی مساعی قابل ذکر ہیں ان سب کے آپ صدر نشین ہیں

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت پنجم ص۱۲۱　[2] حجۃ اللہ البالغہ، مقدمہ

حدیث رسولؐ پر شاہ صاحب کی حسب ذیل کتابیں لائق ذکر ہیں۔

(۱) الاربعین یہ چالیس جامع احادیث کا مجموعہ ہے، شاہ صاحب نے عوام میں حدیث کا ذوق پیدا کرنے کے لئے اس کتاب کو مرتب کیا تھا، یہ مجموعہ مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا، اردو میں اس کے متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں جن میں سید عبداللہ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔

(۲) الارشاد الی مہمات الاسناد، یہ رسالہ عربی میں اپنے اساتذہ اور شیوخ حجاز کے تذکرہ سے متعلق لکھا ہے اس میں ان کی سند حدیث پر گفتگو کی ہے۔ ۱۳۰۷ھ میں مطبع احمدی حبش خاں دہلی سے شائع ہوا۔

(۳) تراجم ابواب البخاری۔ (عربی) اس رسالہ میں بخاری شریف کے ترجمۃ الباب کو حل کرنے کے لئے اصولی قواعد بیان کئے گئے ہیں یہ رسالہ مطبع نورالانوار آرہ سے ۱۸۹۹ء میں شائع۔

(۴) شرح تراجم ابواب البخاری. یہ رسالہ بھی عربی میں ہے اور بخاری شریف کے تراجم، عنوانات اور احادیث کے لطائف و حکمت پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں رسالے ایک ساتھ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوئے ہیں۔ نیز بخاری شریف کے موجودہ ایڈیشن میں جو کلکتہ سے شائع ہوا ہے مولانا محمد علی سہارنپوری کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

(۵) الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین۔ عربی میں یہ رسالہ فن حدیث پر لکھا گیا ہے اور مسلسلات کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ صاحب نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھی ہیں (۱) مسوّی بزبان عربی (۲) مصفّی بزبان فارسی یہ دونوں کتابیں الگ الگ بھی شائع ہوئی ہیں اور یکجا کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد دہلی سے طبع ہوئی ہیں۔ ایک ہی مجموعہ حدیث کی دو شرحیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ شاہ صاحب کی نظر میں موطا کی غیر معمولی اہمیت ہے اس اہمیت کی وجہ شاہ صاحب یہ بتاتے ہیں" یہ فقیر ایک مدت تک فقہا کے اختلاف مذہب اور علماء کے گروہوں کی کثرت اور ہر ایک کی اپنی جانب کھینچ تان کی وجہ سے تشویش میں مبتلا رہا کیونکہ تعین عمل ضروری تھی اور یہ بغیر ترجیح کے ممکن نہیں اور وجوہ ترجیح میں بھی اختلاف پایا۔ پھر ہر طرف ہاتھ پاؤں مارا ہر کسی سے مدد چاہی مگر فائدہ نہ ہوا، پھر اللہ کے حضور یہ مدعا لے کر کھڑا ہوا لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین" چنانچہ اشارہ امام مالک بن انس کی کتاب موطا کی طرف ہوا۔ (مصفّی ص۳)

(۶) النوادر من احادیث سید الاوائل والاخر۔ علم حدیث پر یہ رسالہ عربی میں لکھا گیا ہے اور مطبع نورالانوار آرہ سے شائع ہوا ہے۔

(۷) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔ یہ رسالہ دراصل حدیث کے بجائے خواب سے متعلق ہے اس میں حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے وہ مبشرات ہیں جو شاہ صاحب اور ان کے بزرگوں کو خواب میں نظر آئے۔ یہ رسالہ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ فن حدیث پر بعض دوسری کتابوں میں شاہ صاحب نے بڑی قیمتی بحثیں کی ہیں۔ اور جس انداز پر حدیث کی تفہیم وتشریح کی ہے وہ ایک منفرد کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حجۃ اللہ البالغہ جلد اول کی ساتویں بحث مبحث استنباط الشرائع من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں علم نبوت کے اقسام، شریعتوں اور مصلحتوں میں فرق، طبقات کتب حدیث، حدیث کے مراد کو سمجھنے کی کیفیت کتاب وسنت سے شرعی معانی کی تفہیم کی کیفیت اور مختلف احادیث میں تطبیق وغیرہ پر جدید عقلی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں سے صرف ایک عنوان طبقات کتب حدیث کو لیجئے۔

شاہ صاحب نے تمام مجموعہ ہائے حدیث کو صحت وشہرت کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے طبقہ میں موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو رکھا ہے۔ دوسرے طبقہ میں ان کتابوں کو رکھا ہے جو مذکورہ تینوں کتب کے درجہ تک صحت وشہرت کے لحاظ سے نہیں پہونچتیں مگر ان کے مصنف عدالت وثوق حفظ اور مہارت حدیث میں معروف تھے، اس طبقہ میں سنن ابو داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی کو رکھا ہے۔ تیسرے طبقہ میں ان مسانید جوامع اور تصانیف کو رکھا ہے جو شیخین سے پہلے یا ان کے زمانہ میں یا ان کے بعد مرتب کی گئیں مگر ان میں صحیح، حسن، ضعیف، معروف، غریب، شاذ، منکر، خطا، صواب، ثابت، مقلوب ہر قسم کی احادیث جمع کی گئیں۔ اس طبقہ میں مسند ابو علی، مصنف عبد الرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند ابوداود الطیالسی بیہقی، طحاوی، اور طبرانی کی کتب احادیث شامل ہیں۔ مسند احمد کو شاہ صاحب نے دوسرے طبقہ سے قریب رکھا ہے۔ چوتھے طبقہ میں ان کتب احادیث کو رکھا ہے جو مشہور کتب احادیث کے عرصہ بعد لکھی گئیں اور ان میں ان احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی جو مشہور کتب میں نہیں تھیں۔ اس میں کتاب الضعفاء ابن حبان اور کامل ابن عدی کی اور خطیب بغدادی ابو نعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار، دیلمی وغیرہ کی کتب شامل ہیں۔ مسند خوارزمی کو شاہ صاحب نے اسی طبقہ سے قریب رکھا ہے۔ پانچویں طبقہ میں ان احادیث کے مجموعہ کو رکھا ہے جو فقہا، واعظین، صوفیا اور مورخین وغیرہ کے یہاں زبان زد ہیں مگر ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے طبقہ کی کتب پر محدثین اعتماد کرتے ہیں۔ تیسرے طبقہ کی احادیث پر قول وعمل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ مگر ماہرین حدیث جن کو اسماء الرجال اور علل احادیث پر عبور ہے وہی اس سے استنباط کر سکتے ہیں چوتھے طبقہ کی کتب سے مدد لینا درست نہیں

فقہ:۔ فقہ کے میدان میں بھی شاہ صاحب نے زبردست خدمت انجام دی ہے، قرآن و حدیث جس شریعت کی تشکیل کرتے ہیں اس کا تفصیلی علم "فقہ" کہلاتا ہے۔ قرآن و حدیث سے مسائل زندگی کے استخراج و استنباط کے طریقہ سے متعلق کئی مکاتیب وجود میں آئے ان میں چار مکاتب فقہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔ نیز ان چاروں مکاتب میں فقہ حنفی کو خاص طور پر وسعت اور رواج ملا، ہندوستان تو گویا ابتدا ہی سے فقہ حنفی کا مرکز تھا اور حکومت کی سرپرستی بھی اس فقہ کو حاصل تھی، اگرچہ دوسرے مکاتب فقہ بھی موجود تھے۔ یہاں فقہ کے رواج کا عالم یہ تھا کہ ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک کے پیرو کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے یہاں تک کہ کوئی حدیث ہی پر عامل کیوں نہ ہو۔ مدارس عربیہ میں بھی فقہ کا عنصر اس قدر غالب تھا کہ حدیث گویا ثانوی درجہ میں تھی، اس صورتحال میں ذوق تحقیق اور روح اجتہاد پژمردہ ہو کر رہ گئی تھی، شاہ صاحب کی نشوونما بھی اسی ماحول میں ہوئی اور خاندانی طور پر وہ بھی فقہ حنفی سے وابستہ تھے مگر قیام حجاز کے ایام میں ان کو دوسرے مسالک کو بھی قریب سے سمجھنے کا موقع ملا[1] اس سے ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی، نیز قرآن و حدیث پر ازسرنو غور کرنے کے جذبہ اور کار تجدید کے داعیہ نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ فقہی جمود اور تعصبات کا حصار توڑ سکیں، اور فقہی مسالک کو تنقید و تطبیق کی نگاہ سے دیکھ سکیں۔ اور راہ اعتدال دکھا سکیں۔ سب سے پہلے فقہی تقشف اور اندھی تقلید کی مخالفت کی انھوں نے اہل علم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تم لوگ ما قبل کے فقہا کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب کر غور و خوض کرتے ہو کیا تم نہیں جانتے کہ حکم تو وہ ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول حکم دیں، تم میں بہت سے لوگوں کے پاس جب کوئی حدیث پہونچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ میرا عمل حدیث پر نہیں بلکہ فلاں کے مذہب پر ہے"[2]

شاہ صاحب اگرچہ خود فقہ حنفی کی پیروی کرتے تھے مگر ان کی نظر میں دوسرے مکاتب فقہ بھی یکساں اہمیت کے حامل تھے اور اسی لئے وہ بہت سے معاملات میں اپنی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں جس مسلک کے مطابق مسئلہ کو درست سمجھتے اسی پر عمل کرتے۔ "الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین" میں شاہ صاحب نے اپنا ایک خواب بیان کیا ہے جس میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] شاہ صاحب کے اساتذہ حرمین میں شیخ ابوطاہر مدنی شافعی تھے، شیخ وفداللہ مالکی تھے، شیخ تاج الدین قلعی حنفی تھے، جبکہ عام طور پر فقہ حنبلی کا رواج تھا۔ [2] التفہیمات الالٰہیہ اول ص ۲۱۴

سے فقہ اربعہ کے بارے میں سوال کیا تو آنجناب نے فرمایا یہ سب حق پر ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر شاہ صاحب نے مختلف مکاتیب فقہ میں اختلاف اور اس کے اسباب پر اصولی نوعیت کی ایک کتاب "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف لکھی۔ اس میں انھوں نے صحابہؓ اور تابعین کے اختلاف کے اسباب فقہائے مذاہب کے اختلاف کے اسباب، اہل حدیث اور اہل الرائی کے اختلاف کے اسباب پر گفتگو کی ہے۔ نیز ابتدائی صدیوں میں فقہ کے سلسلہ میں لوگوں کے رویے اور بعد کے ادوار کے فقہی حالات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے ضخیم کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب شیخ ابوالفتاح ابوعدہ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ دارالنفائس بیروت سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب نے کیا ہے۔ اس موضوع پر شاہ صاحب کی دوسری کتاب "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" ہے: اس کتاب میں شاہ صاحب نے اجتہاد کے احکام اور شرائط مجتہد کے اقسام اور اوصاف، مذاہب اربعہ کی تقلید، علماء کی تقلید دوسرے علماء کے لئے، جیسے مسائل پر گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب اردو ترجمہ "سلک مروارید" کے ساتھ ۱۳۱۰ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ، اور التفہیمات الالٰہیہ میں بڑی قیمتی بحثیں شامل ہیں۔

مغلیہ دور حکومت فقہی جمود کے تناظر میں اگر شاہ صاحب کی کوششوں کو دیکھا جائے تو بالکل منفرد اور ممتاز معلوم ہوتی ہیں۔ شاہ صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ابتدائی صدیوں میں جب فقہی مکاتیب کی تشکیل نہیں ہوئی تھی لوگ کسی ایک فقیہ کے پابند نہ تھے جس عالم سے چاہتے مسئلہ دریافت کر کے عمل کر لیتے مگر بعد میں مکاتیب فقہ وجود میں آئے اور ہر فقیہ کے تلامذہ اور متوسلین کا حلقہ پیدا ہو گیا اور وہ اپنے امام کی پیروی کرنے لگے اور دوسرے ائمہ سے ان کا واسطہ نہ رہا، بعد میں یہ صورتحال خراب ہو گئی اور معاملہ صرف اپنے امام کی اتباع تک محدود نہ رہا بلکہ دوسرے ائمہ اور ان مسلک کی تردید و تنقیص تک جا پہونچا، لوگ قرآن و حدیث سے اپنے ائمہ کی ہر بات کو ثابت کرنے میں اور دوسرے کو غلط ٹھہرانے میں لگ گئے۔ شاہ صاحب عوام کو ائمہ اربعہ کی تقلید سے نکلنے کا مشورہ نہیں دیتے مگر وہ علماء ان پر اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لینے کے لئے زور دیتے دیتے ہیں۔

فقہ اسلامی میں شاہ صاحب کی بالغ نظری اور اجتہادی صلاحیت ہی کی بناء پر بعد کے علماء ان کو مجتہد قرار دیتے ہیں[۵]۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ "ہم شاہ ولی اللہ صاحب کو حنفی اور شافعی ہر

۵۔ الدرالثمین، مبشرات نمبر

دو فقہ میں مجتہد منتسب مانتے ہیں[1]۔ چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو مرکز اسلام یعنی حجاز میں پاتے ہیں، اور بالجملہ تمام مسلمانوں کو اپنا مخاطب بناتے ہیں تو ان کے نزدیک حنفی اور شافعی فقہ میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا جائز ہے، لیکن جب وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں، تو اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کے طریقہ پر فقہ حنفی کی پابندی ضروری قرار دیتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ خاص حنفی فقہ کے مجتہد نظر آتے ہیں[2]۔

شاہ صاحب نے آخر وقت میں مسلمانوں کو جو نصیحت کی ہے اس میں یہ بھی فرمایا ہے "کہ مسائل میں ان علماء محدثین کی پیروی کریں جو فقہ اور حدیث کے جامع ہوں اور ہمیشہ فقہی مسائل کو کتاب و سنت پر پرکھیں، جو کچھ موافق ہو اسے قبول کریں ورنہ چھوڑ دیں، امت مسلمہ کو کسی بھی وقت اپنے مجتہدات کو کتاب و سنت پر پرکھنے سے استغنا نہیں ہے۔ اور متقشف فقہا جو کسی عالم کی تقلید کو دستاویز بنا کر سنت کی تلاش و تتبع کو چھوڑ رکھا ہے کی طرف متوجہ نہ ہوں اور ان سے دور رہ کر خدا کا قرب حاصل کریں[3]۔

---

[1] شاہ صاحب نے مجتہد مطلق اور مجتہد منتسب کے فرق کو اس طرح واضح کیا ہے۔ مجتہد مستقل وہ ہوتا ہے جس کے اندر تین باتیں موجود ہوں (۱) ان اصول و قواعد میں جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے وہ بطور خود تصرف کرے (۲) ممکن حد تک احادیث اور آثار کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلے۔ اور ان کے احکام کو اپنے دائرہ معلومات میں اچھی طرح سمیٹ لے، اس امر سے پوری طرح باخبر ہو کہ کون سی حدیثیں فقہ کا ماخذ ہیں پھر یہ کہ وہ مختلف روایات میں تطبیق و ترجیح دے سکے اور مفہوم کی تعیین کر سکے (۳) ان فروعی مسائل کا اپنے اجتہاد سے جواب دیتا جائے جو اس کے سامنے لائے جائیں جن کا اس سے پہلے جواب نہ دیا گیا ہو۔ مجتہد منتسب وہ ہوتا ہے جو مذکورہ پہلی صفت میں بجائے خود کوئی مستقل مقام نہ رکھتا ہو، بلکہ کسی مجتہد کا مستقل پیرو ہو اور اسی کے مقرر کئے ہوئے اصولوں کو جوں کا توں مان لیا ہو مگر دوسری اور تیسری صفت سے خود متصف ہو،

ملاحظہ ہو الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف صفحہ ۸۰

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ صفحہ ۱۹۴

[3] التفہیمات الالٰہیہ دوم صفحہ ۲۴۲

نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ

جناب محمد حبیب الدین احمد صاحب

اسلامی نظامِ تعلیم اور اس کی اہمیت و ضرورت پر ہم اپنے گذشتہ مضامین میں روشنی ڈال چکے ہیں[1]۔ یہاں مطلوبہ نظامِ تعلیم کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو مقامی ضروریات اور احوال و ظروف کے مدنظر جزوی تبدیلیوں کے ساتھ کم و بیش ہماری ملی درسگاہوں میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک اہم بات جو اس سلسلے میں ملحوظ ہے وہ یہ کہ ہم اس وقت کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ان تمام ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہیں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشنری کو چلانے کے لیے پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں اخلاقی، فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موثر لیڈر اور کارکن تیار کریں۔ اس کام کے لئے ڈاکٹری یا انجینیرنگ یا سائنس وغیرہ کے ماہرین کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دین اسلام اور علوم اجتماعیہ میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھتے ہوں۔ آگے چل کر جیسے جیسے ہماری کارروائیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔ اس لحاظ سے جن جن علمی شعبوں کے اضافے کی ضرورت ہوگی ان کا اضافہ کیا جائے گا ــــ انشاءاللہ۔

معیادِ تعلیم: ان درسگاہوں کی معیادِ تعلیم ۱۲ سال کے تین تعلیمی مرحلوں پر مشتمل ہوگی۔

تعلیمی مراحل: مرحلہ اولیٰ: ۵ سال (ثانوی تعلیم - جماعت ششم تا دہم) مماثل مولوی

مرحلہ ثانی: ۴ سال (اعلیٰ تعلیم - انٹرمیڈیٹ و بی۔اے) مماثل فضیلت

مرحلہ ثالث: ۳ سال (اختصاصی تعلیم) مماثل پوسٹ گریجویشن یا کاملیت۔

ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد ایسے طلبا جو اعلیٰ تعلیم کی استعداد یا استطاعت نہیں رکھتے ان کے لئے ایک شعبہ صنعتی تعلیم و لسانیات کا جو دو سال پر مشتمل ہو قائم کیا جائے۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ ماہنامہ زندگی نو اکتوبر، نومبر ۱۹۸۱ء۔ جنوری، فروری ۱۹۸۲ء۔

۱۔ مرحلہ اولیٰ جو پانچ سالوں پر مشتمل ہوگا اس میں عربی ادب و قواعد، اردو ادب و فارسی، قرآن حکیم حدیث و فقہ سیرت و تاریخ اسلام، انگریزی ادب، ریاضی، جنرل سائنس، سوشل اسٹڈیز اور متعلقہ علاقائی زبان کے مضامین پڑھائے جائیں۔

۲۔ مرحلہ ثانی جو چھ سالوں پر مشتمل ہوگا اس میں تعلیم کے شعبے حسب ذیل فیکلٹیز پر مشتمل ہوں گے
ا۔ اسلامیات۔ ب۔ عصری علوم
اسلامیات کا شعبہ حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہوگا۔

(ا) قرآن حکیم و اصول تفسیر (ب) حدیث و اصول حدیث (ج) فقہ و اصول فقہ (د) عربی ادب و قواعد
عصری علوم کی فیکلٹی میں حسب ذیل شعبے ہوں گے۔

(ا) انگریزی ادب کے ساتھ (ب) تاریخ (ج) معاشیات (د) سیاسیات (ھ) سماجیات (و) صحافت میں کسی تین مضامین کے (COMBINATION) رہیں گے۔

۳۔ مرحلہ ثالث :۔ اختصاصی تعلیم کا شعبہ جو دو سال پر مشتمل ہوگا اس میں اگر کوئی طالب علم چاہے تو مرحلہ ثانی میں مذکورہ فیکلٹیوں میں سے (اسلامیات یا عصری علوم کے) کسی ایک مضمون پر دو سال تک علمی تحقیق کرکے ایک مقالہ پیش کرے گا جس کو اہل علم جانچنے کے بعد کاملیت کی سند دیں گے۔

۴۔ فنی تعلیم و لسانیات کا شعبہ جو دو سال پر مشتمل ہوگا اس میں ایسے ٹریڈس جن کی زیادہ مانگ ہو جیسے ریفریجریشن و ایرکنڈیشننگ، ریڈیو و ٹیلی ویژن، آٹوموبائل میکانزم، الکٹرک موٹر وائنڈنگ لیتھ مشین، بیاٹری چارجنگ، اسٹینوگرافی و ٹائپ رائٹنگ اور سکریٹریل ورک وغیرہ ٹریڈس میں سے کسی ایک میں تربیت کے ساتھ طالب علم سے متعلقہ علاقہ واری زبان میں مہارت (PROFICIENCY) پیدا کی جائے اکہ آزادانہ معیشت کے حصول میں وہ ممد و معاون ہو سکیں اور علاقہ واری بنیادوں پر دعوت و تبلیغ، ترجمہ و تصنیف کے لئے تقریری و تحریری صلاحیت پیدا ہو سکے۔ ان علاقہ واری زبانوں میں تلگو، مرہٹی، کنڑی ٹامل، ملیالم، گجراتی، بنگالی اور ہندی وغیرہ شامل ہیں۔

۵۔ ان درس گاہوں میں کتاب و سنت کی تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل رہے گی اس لیے فطری طور پر عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے گی۔ انگریزی زبان و دیگر علوم کا مقام اس اصل مقصد کے لیے معاون و مددگار کا ہوگا۔

۶۔ ثانوی تعلیم کے مرحلے میں ذریعہ تعلیم اردو ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم و اختصاصی تعلیم کے مرحلے میں اسلامیات کا ذریعہ تعلیم اردو اور عصری علوم کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔

سالانہ ایام درس و اوقات تعلیم :۔ درس گاہوں میں تعلیم کا آغاز ماہ جون سے ہو (تاکہ سرکاری مدارس سے مطابقت پیدا کی جا سکے) روزانہ دو تعلیمی سشن صبح اور شام کے ۵ گھنٹے بچاس منٹ پر مشتمل ہوں گے۔ صبح کا سشن ہا ۹ بجے سے ۱۲.۵۰ تک اور شام کا سشن ۲ بجے سے ہا ۴ بجے تک ہوگا۔ اس طرح ۴۰ منٹ والے ۹ ساعات تعلیمی ہوں گے۔ درمیانی وقفہ برائے طعام و نماز ظہر ۱۲.۵۰ سے ۲ بجے تک ایک گھنٹہ دس منٹ کا ہوگا۔

مرحلہ اولیٰ میں ۴ ساعات تعلیمی علوم اسلامیہ اور ۴ ساعات تعلیمی علوم عصریہ اور ایک ساعت تعلیمی لائبریری سے استفادے کے لیے مختص ہوگی۔

توسیعی لکچرس :۔ ان تعلیمی مرحلوں میں جو مضامین شریک نصاب نہیں ہیں جیسے طبعی و حیاتیاتی علوم، نفسیات، نظم و نسق، وغیرہ ایسے مضامین پر اور نصاب میں شریک شدہ مضامین پر بھی ماہرین فن سے توسیعی لکچرس منعقد کرے جائیں تاکہ ان علوم کو مزید معلومات کے ذریعہ SUPPLEMENT کیا جا سکے۔ حسب ضرورت لائبریری پیریڈ کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔

لائبریری :۔ اس درس گاہ سے متعلق ایک معیاری لائبریری بھی ہوگی جس میں طلبا و اساتذہ کی تعلیمی و تدریسی و تحقیقی ضروریات کے لیے مختلف علوم و فنون پر کتب مہیا کی جائیں گی۔

درسیات و معلمین کی تیاری : اس وقت بعض شعبوں میں ایسی درسی کتابیں مفقود ہیں جن سے ہمارے مطلوبہ نقشۂ کار کے مطابق تعلیم دی جا سکے اور اگر بعض ہیں بھی تو انگریزی زبان میں نہیں جو اعلیٰ تعلیمی مرحلے میں عصری علوم کا ذریعہ تعلیم ہے۔ فی الوقت ایسے اساتذہ کا ملنا بھی دشوار ہے جو اس نقشۂ کار کے مطابق ہمارے مخصوص طرز پر تعلیم دے سکیں اس لیے کوشش اس بات کی کی جائے کہ موجودہ اسلامی لٹریچر سے ان علوم میں جو بھی کتابیں مل سکیں ان کو لے لیا جائے اور منتخبہ ابواب کو درسیات میں شامل کر لیا جائے ان علوم پر بعض کتابیں انگریزی میں بھی لکھی گئی ہیں اور اکثر کتب کا ترجمہ انگریزی میں کیا جا رہا ہے۔ اس طرح انشاء اللہ مستقبل قریب میں اس مشکل پر قابو پا لیا جا سکے گا۔ جب تک کہ اپنی ضرورت کے مطابق درسی کتب تیار نہیں کی جاتیں اس عبوری دور کی حد تک موجودہ درسی کتابوں کو محتاط انتخاب اور ضروری حذف و اضافہ کے ذریعہ کام کے قابل بنا لیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کے تعلق سے موجودہ ایسے تعلیم یافتہ حضرات جن کا نقطۂ نظر اور طرز فکر اسلامی ہے یا ذرا سی محنت سے اسلامی بنایا جا سکتا ہے ان کو لے کر اگر اس تعلق سے ذہنی اور فکری تربیت دی جائے اور اسلامی نقطۂ نظر کو ان پر اچھی طرح واضح کر دیا جائے تو یہی لوگ تحقیق او مطالعہ سے ان علوم کو ہمارے مطلوبہ نقشہ کے مطابق مدون کرنے

کے قابل ہو سکیں گے۔ پھر جب ان درس گاہوں سے طلباء اس خاص نظام تعلیم و تربیت کے تحت فارغ ہو کر نکلیں گے تو درسیات کی تیاری و تدوین اور اساتذہ کی فراہمی میں ان شاء اللہ کوئی دقت باقی نہیں رہے گی۔

داخلے:۔ ان درس گاہوں میں ابتدائی جماعت ششم رکھی گئی ہے اس لیے ان میں ایسے ہی طلباء کو داخلہ دیا جائے جو کسی بھی مدرسے سے اردو میڈیم سے پانچویں کامیاب کر چکے ہوں اور جو ناظرہ قرآن پڑھ چکے ہوں۔ چونکہ تحتانوی درجات کا یونٹ پانچویں تک ہے اور چھٹی جماعت میں باضابطہ ٹسٹ کے بعد ہی سرکاری مدارس میں داخلہ دیا جاتا ہے اس لئے اسی مناسبت سے ان درس گاہوں میں ابتدائی درجہ ششم جماعت کا رکھا گیا ہے اور اسی درجے سے اپنے مخصوص طرز کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔

اقامت خانے:۔ غیر مقامی طلباء کے قیام و طعام کے لیے اقامت خانوں کا لازمی نظم ہونا چاہیے جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی خطوط پر تربیت کا خاص خیال رکھا جائے۔

امتحانات:۔ درس گاہوں کے اپنے امتحانات ہوں گے۔ کامیاب طلباء کو مرحلۂ اولیٰ کے ختم پر میٹرک/مولوی اور مرحلۂ ثانی کے ختم پر انٹرمیڈیٹ/عالم، بی اے/فاضل کے اسناد درس گاہوں کی طرف سے دیے جائیں گے۔

نوٹ:۔ نصاب تعلیم کی تفصیلات ایک بورڈ طے کرے گا جو اس مقصد کے لیے تشکیل دیا جائے گا اور جو ماہرین تعلیم پر مشتمل ہوگا۔

تعلیم نسواں:۔ چونکہ اس ملک میں مسلم خواتین کے لیے اعلیٰ دینی تعلیمی اداروں کی کمی ہے اور دینی تعلیم کی خواہش مند طالبات کو یا تو بیرون ریاست دور دراز مقامات کا سفر کر کے مطلوبہ قسم کی درسگاہوں میں داخلہ لینا پڑتا ہے جو انتہائی کٹھن اور مشکل ہے یا مجبوراً اس نوعیت کی تعلیم سے محروم ہونا پڑتا ہے، اس تعلق سے طالبات کے اکثر سرپرستوں کا مطالبہ ہی نہیں بلکہ شدید اصرار ہے کہ جامعۃ الصالحات رامپور کے طرز پر دینی درس گاہیں مسلم بچیوں اور خواتین کے لیے قائم کی جائیں۔ یوں بھی دینی درس گاہوں کی عدم موجودگی کے باعث سرکاری مدارس، کالجوں اور مخلوط تعلیمی اداروں کی غیر موزوں، بے مقصد اور ملحدانہ و مادہ پرستانہ تعلیم مسلم خواتین میں وہ سیرت و کردار تعمیر کرنے سے قاصر رہی ہے جو ایک مومنانہ زندگی گزارنے اور ایک صالح معاشرہ وجود میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے برخلاف اس تعلیم نے ملت کو کئی معاشرتی مسائل سے دوچار کر دیا ہے اس لئے ایسی درس گاہیں جو پردہ نشین خواتین کی اعلیٰ تعلیمی ضروریات کی تکمیل کر سکیں نہایت ضروری ہیں۔ چونکہ ان کا وظیفۂ حیات مردوں سے مختلف ہے اس لیے نصاب تعلیم بھی اس لحاظ سے مختلف ہوگا۔

ذیل میں اس مخصوص نظامِ تعلیم ایک خاکہ دیا جاتا ہے۔

معیادِ تعلیم: درس گاہ کی تعلیمی معیاد ۱۱ سال کے دو تعلیمی مرحلوں پر مشتمل ہوگی۔

تعلیمی مرحلے: مرحلہ اولیٰ: ۷ سال، جماعت ششم تا دہم (مماثل مولوی)

مرحلہ ثانی: ۴ سال، انٹرمیڈیٹ و بی اے (مماثل عالمیت و فضیلت)

ابتدائی مرحلے میں آغازِ کار کے طور پر درس گاہ کی ابتدا تحتانی جماعتوں یعنی کے۔ جی سے کی جائیگی اور میٹرک کے بعد جب درس گاہ ثانی کے مرحلے میں قدم رکھے گی اس وقت تحتانی سکشن (کے جی تا پنجم) کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تحتانی جماعتوں کی حد تک طالبات کو معیار کے لحاظ سے درمیانی جماعتوں میں داخلہ دیا جا سکتا ہے۔

نصابِ تعلیم: ۔۔ کے۔ جی تا پنجم تک وہی نصاب پڑھایا جائے گا جو عام طور پر پرائمری اسکولوں میں ان جماعات کے لیے مقرر ہے۔ اس میں ناظرہ قرآن اور دینیات کا اضافہ کر لیا جائے (چونکہ اس مرحلے میں طلبا و طالبات کے درمیان ان کے عمر، ذہن، شعور، احساسات و جذبات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا اس لئے بغرض سہولت یہی کورس اختیار کیا جا سکتا ہے)

۲۔ **مرحلہ اولیٰ:** ۔۔ ششم تا دہم، خواتین کی تعلیم کے لحاظ سے یہ مرحلہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں طالبات کو دینی تعلیم کے ساتھ خاتونِ خانہ بننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ایک لڑکی سن بلوغت کو پہنچ چکی ہوتی ہے اور مسلم معاشرہ کے ایک اوسط گھرانے میں اس مرحلے پر پہنچ کر شادی خانہ آبادی اور خاتونِ خانہ کی ذمہ داریاں پوری کرنی ہوتی ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کرنا اور ان کو CAREER GIRL بنانے کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے طالبہ کو اس مرحلے میں اپنی ذاتی، خاندانی اور عائلی زندگی، تمدن و معاشرت سے متعلق ان تمام ضروری احکام سے واقف ہونا چاہئے جو ایک شادی شدہ خاتون کے لیے درکار ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ان احکام کو اتنی تفصیل کے ساتھ جانے کہ مفتی بن جائے لیکن نکاح، طلاق، رضاعت، وراثت اور حقوق الزوجین وغیرہ سے متعلق اسے اتنی معلومات ہونی چاہئے جن سے وہ ایک اسلامی اور کامیاب زندگی بسر کر سکے۔ لہٰذا اس مرحلے میں متذکرہ تمام امور کی تعلیم کو داخلِ نصاب کیا جانا ضروری ہے۔ ٹائم ٹیبل کا ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

حدیث و فقہ میں ان احادیث و فقہی مسائل کا انتخاب کیا جائے گا جو عورتوں سے متعلق ہیں اور جن سے نکاح و طلاق، رضاعت، وراثت اور حقوق الزوجین وغیرہ سے متعلق احکام معلوم ہوں۔ حدیث و فقہ اور امورِ خانہ داری سے متعلق نصاب علیحدہ تیار کیا جائے گا اور دوسرے مضامین کی حد تک کم و بیش وہی نصاب ۔۔۔ کو کیا جائے گا جو جامعۃ الصالحات میں اس مرحلے کی جماعتوں

کے لئے متعین ہے۔ ایک عبوری دور کی حد تک اس مرحلے کی تکمیل پر طالبات کو اورینٹل ایس ایس سی کا سرکاری امتحان خانگی امیدوار کی حیثیت سے بھی دلایا جاسکتا ہے۔

مرحلۂ اولیٰ یعنی میٹرک کی تکمیل کے بعد وہ طالبات جو مزید دینی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں انھیں مرحلۂ ثانی میں داخلہ دیا جائے گا۔ یہی طالبات علم وفن کے اعتبار سے درس گاہوں کا حاصل ہوں گی کیونکہ فراغت کے بعد وہ خواتین میں دعوتی واصلاحی کام اور اس غرض کے لئے تصنیف وتالیف اور تقریر و تحریر کا کام بھی انجام دے سکیں گی۔

اس مرحلہ کا نصاب کم وبیش جامعۃ الصالحات رام پور کے معادل درجات کے مطابق ہوگا۔ یہ درس گاہ بنیادی طور پر اقامتی ہوگی۔ مقامی اور غیر مقامی طالبات کے قیام وطعام کے لئے اقامت خانہ کا نظم ہوگا جہاں طالبات کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی خطوط پر تربیت کا اہتمام کیا جائے گا۔

پردہ:۔ بڑی عمر کی طالبات، معلمات و دیگر خواتین اسٹاف ممبرس کو پردے کی پابندی لازمی ہوگی۔ طالبات و معلمات کو شوخ رنگ کے غیر ثقہ اور غیر ساتر لباس پہننے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس تعلق سے کوئی مناسب یونی فارم بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔

لائبریری:۔ ان درس گاہوں سے متعلق لائبریری بھی ہوگی جس میں عام علمی وادبی کتب کے علاوہ خواتین کی تعلیم وتربیت کی مناسبت سے منتخبہ دینی کتب بھی ہوں گی۔ اخبارات ورسائل میں عام اخبارات کے علاوہ الحسنات، نور، ذکریٰ، حجاب، بتول وغیرہ رسائل بھی رکھے جائیں گے تاکہ طالبات فارغ اوقات میں ان سے استفادہ کرسکیں۔ ان درس گاہوں میں اخلاق سوز اور فحش و عریاں لٹریچر کا داخلہ ممنوع ہوگا۔ داخلہ، امتحانات ودیگر امور سے متعلق کم وبیش ان ہی ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے گا جو مردوں کی درس گاہوں کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں۔

ابتدائی اسلامی دور میں قائد مفکر ہوا کرتا تھا، اور مفکر قائد اسلامی نظریہ ذہنوں میں روشن تھا جس کی تعمیر کی تڑپ ان کے فکر وعمل کے راستے متعین کرتی رہتی تھی پوری اسلامی امت کا بس یہی ایک مقصد وحید تھا۔ ہر باشعور مسلمان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ حقائق کو کھنگالے اور ان کو اسلامی قالب میں ڈھالے۔ (اسماعیل الراجی الفاروقی الشہید)

مدارس میں سائنس کی تعلیم ــــ ایک نقطہ نظر

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی،

مدارس دینی اسلام کے قلعے ہیں۔ یہ بہترین تربیت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں قافلہ حق کے ہم سفروں کی اصلاح اور تربیت ہوتی ہے اس کے بعد ہی وہ راہ کی دشواریوں پر قابو پا سکتے ہیں

کتاب الٰہی کا علم، احادیث نبوی سے واقفیت اور فقہ و کلام سے شغف دراصل وہ قیمتی سرمایہ ہے جو اسلامی تہذیب کی بقا اور ارتقا کا ذریعہ ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں مہارت پر اپنی ساری توجہات کو مرکوز کر لینے کے بعد ہی ایسے لائق اور باصلاحیت کارکن تیار ہوتے ہیں جو ایک طرف تو مثبت انداز میں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور دوسری طرف دشمنوں کے اٹھائے گئے اعتراضات کا مثبت جواب دیتے ہیں۔ دوسرے تعلیمی اداروں کے برعکس اسلامی مدارس کے اساتذہ اپنے طلبہ کے ذہنوں پر دین کی خدمت اور اطاعت دینی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اساتذہ کی مخصوص نشستوں میں یا طلبہ کے حلقوں میں دین ہی بحث کا موضوع اور التفات توجہ کا خاص ہدف ہوا کرتا ہے۔

اساتذہ کا حقیر سی تنخواہ پر قناعت کرنا، طلبہ کی روحانی قوتوں کی افزائش کرنا اور اقامت دین کا جذبہ محمود طلبہ کے قلوب واذہان میں پیدا کرنا یہ تمام چیزیں مدارس کے کیمپس میں نظر آتی ہیں جسے مدارس دینیہ کی ایک خاص جہت معلوم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ سائنسی تعلیم کے نفاذ کا مسئلہ خاصا پیچیدہ اور دشوار ہے۔ کم از کم بیسویں صدی میں تخصص کو ہر میدان میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں مہارت رکھنے والے فرد کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کسی ایسے شخص کی رایوں کو قدر و قیمت ہرگز نہیں دی جاتی جو متعلقہ امور میں خاص صلاحیت کا مالک ہو۔ جہاں ہر علم و فن میں کمال و تخصص کا اصول کارفرما ہو۔ وہاں آخر مدارس کے اندر جو ایک مخصوص کلچر کے نمائندہ ہوتے ہیں ــــــــــــــــــــــ، سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں قرآن حدیث یا فقہ کے میدان میں تخصص انفرادیت پیدا کی جا سکے گی؟ کیا خالص اسلامی علوم (قرآن، حدیث اور فقہ) کی اتنی بھی حیثیت نہیں کہ انہیں علم طبیعیات، علم کیمیا اور علم حیاتیات سے الگ کر کے پڑھایا جائے۔ احساس یہ ہے کہ اس طرح کے دوسرے علوم اگر یہاں باضابطہ نصاب کے تحت پڑھائے

جائیں گے تو خود بخود وہ توجہ جو قرآن و حدیث پر مرتکز تھی تقسیم ہو جائے گی اس کے نتیجہ میں مدارس کا اصل مقصد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

سائنسی تعلیم کے نفاذ کے حق میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ فارغین مدارس کے معاشیات کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس میں یہ مفروضہ شامل ہے کہ محض قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے والے لوگ ہی مفلس اور قلاش ہوا کرتے ہیں اس لئے بالخصوص ان کی معیشت پر توجہ دی جانی چاہئے۔ حالانکہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں وہ لوگ بھی بے روزگار ہیں جن کے پاس عصری علوم کی مختلف اسناد ہوتی ہیں پھر یہ کہنا کہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے ہی خوشحال ہوا کرتے ہیں قطعی اور حتمی بات نہیں ہے کیونکہ لیبا اوقات انھیں بھی نان شبینہ کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ یہ کلیہ اعداد و شمار کی بنیاد پر نہیں قائم کیا گیا ہے۔ کہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے علم دین حاصل کرنے والوں کے مقابلے میں زیادہ آسودگی اور فارغ البالی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ علوم دینیہ سے آراستہ ہونے والوں کے شایان شان یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ مدارس میں سائنس کی تعلیم پر محض اس بنا پر اتفاق کرلیں کہ ان کا معاشی مستقبل درخشاں اور تابناک ہو جائے گا۔ جب معاشی مستقبل ہی سعی و عمل کا حاصل اور توجہات کا مرکز بن جائے تو کیوں نہ پورے طور پر اس کے حصول میں جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا جائے۔

کم از کم مدارس کے لوگ کبھی اس حقیقت کو بالائے طاق نہیں رکھتے کہ رزق میں فراخی و کشادگی نہ تو عزت و ذلت کا معیار ہے اور نہ مقصود حیات۔ ایک مومن اسلام کے فلسفہ آزمائش کو اچھی طرح جانتا ہے کہ لیبا اوقات اطاعت کیش اور وفا شعار بندے بھی فاقہ کش و مجبور ہوتے اور آفات ارضی و سماوی کا نشانہ بنتے ہیں اور کبھی جابر و سرکش بندے بھی خوشحال اور فارغ البال ہوتے ہیں۔ اس لئے محض دنیا طلبی کے لیے سائنس کی تعلیم کے نفاذ کی بات کرنا زیر بحث طبقہ کے مزاج کے خلاف ہے اور ان لوگوں کے لئے بھی مضر ہے جو اپنے سامنے زندگی کا ایک متعین فلسفہ رکھتے ہیں اور معاشی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم کو ناکافی سمجھتے ہوئے سائنس کی تعلیم کو مرکز توجہ بنا۔ ایک طرح کی خیانت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس طریقہ عمل سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے ہی فلاکت و بد حالی اور غربت و افلاس مقدر ہے۔ حالانکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ماضی میں علوم و فنون کی تقسیم اس طرح سے نہیں ہوئی۔ کسی پیوندکاری کے بغیر لوگ اپنے اپنے وقت میں عزت اور عظمت کے زینوں کو طے کرتے رہے۔

مدارس میں سائنس کی تعلیم سے متعلق دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ اگر مدارس میں سائنس کی تعلیم دی جائے تو تنگ نظری، تعصب اور بے جا طرفداری کے امراض سے نجات مل سکتی ہے اور وسعت فکر

نظر کی دولت مدارس کے طلبہ کو میسر آسکتی ہے۔ اس طرح فارغین مدارس کے لئے دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی یہ طریقۂ تعلیم مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن انجام دے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین کے لئے وسعت فکر و نظر، دلیل و برہان اور داعیانہ کردار سے بیزاروں کو کیا مطلب؟ اگر واقعی حکومت اور اس کے کارکن اپنی نیتوں میں خالص ہیں تو کالجز اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم کے نفاذ کی بات کیوں نہیں کہی جاتی تاکہ یہاں طلبہ کے سوچنے سمجھنے کا دائرہ وسیع ہو۔ رد و قبول کی صلاحیت بیدار ہو اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کرنے کا جوہر آشکارا ہو۔ اگر دلیل و برہان کے ذریعہ اپنی دعوت پیش کرنے کی بات ہو تو یہ آواز جس کی طرف سے بھی اٹھتی ہو اس کی قدر کی جائے گی لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ مدارس کے طلبہ اپنے مشن کی تبلیغ و اشاعت کے لئے علم طبیعیات، علم کیمیا اور علم حیاتیات کی گتھیاں سلجھانے بیٹھ جائیں فی الجملہ واقفیت کی اہمیت سے انکار نہیں ہاں یہ تجویز زیادہ موزوں ہوگی کہ طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے مرکزوں یعنی کالجز اور یونیورسٹیوں میں قرآن و حدیث کی باضابطہ تعلیم دی جائے تاکہ ہر گام پر رہنمائی اور مسائل کی عقدہ کشائی ہو۔

ان مدارس کے اندر سائنس کی تعلیم کے نفاذ کے پشت پر حکومت اور اس کے کارکن جو بھی مقاصد رکھتے ہوں بہر حال ہمیں اس طرز عمل سے کسی ترقی اور مثبت تبدیلی کی امید نہیں لیکن یہ بات اب زیادہ تجربہ کی محتاج نہیں ہے کہ موجودہ حکومت کا ذہن کم از کم مدارس دینی معاملات میں صاف نہیں ہے۔ خواہ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہو یا بابری مسجد کا قضیہ و فسادات کا معاملہ ماضی قریب کے یہ تمام واقعات حکومت کے ذہن کی ترجمانی کرتے ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی کے تحت جب مدارس بھی حکومت کی عنایت و توجہ کا مرکز ہے تو مسلمانوں کی خاصی تعداد نے استقبال کرکے روایتی خوش فہمی کا ثبوت دیا۔ یہ کسی قوم کے لئے بہت بڑا المیہ ہے کہ اپنے دوست و دشمن کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ آج مسلمان بلا مبالغہ اپنوں اور غیروں کی طرف سے لگائی گئی ہر صدا پر لبیک کہہ دیتے ہیں۔ ملک کے مخصوص سیاسی حالات اور ذاتی مفادات کے پیش نظر حکومت کی طرف سے جب بھی مسلم مسائل سے متعلق اقدام کیا جاتا ہے تو مسلمانوں کے ذہن و دماغ اس طرح مسحور ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ہر تباہی و بربادی کو تعمیر و ترقی سمجھ بیٹھے ہیں، ہر سازش کو خیر و فلاح کا موجب قدم تسلیم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جب نئی تعلیمی پالیسی کی زد مدارس پر پڑی تو یہ تاویل کی گئی کہ بلاشبہ معاشیات کی درستگی و اصلاح کے لئے، جامعات سے فارغ طلبہ کے سکون و طمانیت کے لیے اور مستقبل کی تعمیر و ترقی کے لئے ایک ضروری قدم ہے جو حکومت نے اٹھایا ہے

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسائل کی بنیادوں پر غور کیا جائے۔ وہ ادارے جو حکومت کے عطیوں سے چلتے ہیں

ان کے ذمہ داران تو مجبور رہیں۔ حکومت اپنے مفاد کے مطابق ایسے قوانین و ضوابط کا بھی نفاذ کر سکتی ہے جو ان کی شانِ انفرادیت اور تشخص کو ختم کر سکتے ہیں لیکن کم از کم وہ ادارے جو حکومت کے مرہونِ منت نہیں ہیں جن کا ایک امتیازی مقام ہے اور جو مخصوص کلچر و ثقافت کی ترویج کے لئے ہیں وہ تو مجبور نہیں ہیں وہ اسی طرح کی تجویز من وعن قبول کیوں کر لیتے ہیں۔ حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدارس میں سائنس کی تعلیم کی آواز محض ان اداروں میں مداخلت کے جواز کا ایک ذریعہ ہے جو حکومت کی نوازش و کرم پر نہیں ہیں۔

اس میں شک و شبہ نہیں کہ ہر ایک اپنے مسائل سے دوسروں کے مقابلے میں اچھی واقفیت رکھتا ہے۔ مدارس کی چہار دیواری میں کیا کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں طلبہ اور اساتذہ کی بحث و گفتگو میں کن کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، طلبہ کے مسائل کی نوعیت خود اداروں میں کیا ہوتی ہے اور مخصوص و محدود مدت کی رہائشی زندگی کے بعد طلبہ کی مصروفیات کیا ہو سکتی ہیں ان تمام معاملات و مشکلات کے خم و پیچ سے ادارے کی انتظامیہ بے خبر نہیں رہتی ہے۔ اس کے ذمہ دار ہی طلبہ کی ناگزیر ضرورتوں کی تکمیل بطریقِ احسن کر سکتے ہیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے اور مسلمانوں کی معصومیت پر ماتم کیا جانا چاہئے کہ وہ غیروں کی سازشوں کے دام میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی مفاد پرستانہ حرکتوں کو اپنے لئے باعثِ شرف و تکریم اور وجہ سعادت سمجھ لیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جذبات کی طوفانی لہروں میں غوطہ زنی ایک مہلک مرض ہے۔

غیروں کی باتیں سننا اور مفید مطلب نتائج اخذ کرنا نامعقول اور قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ فرمانِ نبویؐ کی روشنی میں یہ مومن کی ایک متاعِ گم شدہ ہے۔ لیکن ہمارا شیوہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ جدھر سے بھی کوئی آواز آئے وہ دوڑ پڑیں۔ حق و باطل اور تلخ و شیریں ہر ایک کو مفید اور سودمند نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم سائنس کی تعلیم کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ہماری مخالفت اس بات پر ہے کہ مدارس میں باضابطہ سائنس کی تعلیم ــــ کا نفاذ کر کے ان علوم کو متاثر کر دیا جائے جو اصلاً ان کے مخصوص مزاج سے متعلق ہوں اور اصل و فروع کی بحث سے قطع نظر یہ کہ ہر ایک کا ایک میدان ہوتا ہے۔ مدارس کے طلبہ بھی مخصوص میدان کے سپاہی ہوتے ہیں۔ ان سے یہ توقع ہرگز نہ کی جانی چاہئے کہ وہ علم کیمیا اور علم طبیعیات کے پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کریں گے یا حیاتیات کے اسرار و رموز سے واقف ہو کر دنیائے انسانیت کو کچھ راہنما اصول فراہم کریں گے۔

ان توضیحات سے میرا مقصد قطعاً سائنس کی ــــ تعلیم یا اس کی افادیت سے انکار کرنا نہیں ہے۔ ہاں مدارس کے اندر کسی اصول یا پالیسی کے تحت سائنس کی تعلیم کے نفاذ کی بات کرنا بہرحال قابلِ غور اور لائقِ توجہ ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر ضرورت تھی بھی تو علماء اور فضلاء حضرات نے اب تک اس تریاق کی تلاش و جستجو سے اپنے آپ کو کنارہ کش کیوں رکھا۔ مدارس میں سائنس کی تعلیم سے متعلق تجویز مسلمانوں کی طرف سے آتی (باقی صفحہ ۹۴ پر)

اخبار و افکار

مقبوضہ فلسطین میں بغاوت کی تازہ لہر

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

محمد مسعود عالم قاسمی

اب جو غاصب اسرائیلی فوجوں کو اندرون شہر نہتے مظلوم عوام کی طرف سے خشت و سنگ کی بارشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تو ان کے درمیان شور قیامت برپا ہوگیا ہے، یہ سنگ باری ان کے لئے غیر متوقع بھی تھی اور اس نازک اور تشویشناک صورتحال کا قبل از وقت انھوں نے اندازہ بھی نہیں لگایا تھا، البتہ وہ ضرور سمجھتے تھے کہ ان کے ظلم و جبر سے فلسطینی عوام بیزار ہیں اور کسی قیمت پر ان کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، پی ایل او کی مسلح جد و جہد کو پسپا کر دینے کے بعد وہ سمجھنے لگے تھے کہ فلسطینی مسلمان صرف ہتھیاروں اور بصورت دیگر سیاسی مذاکروں پر یقین رکھتا ہے، اور اس بات پر وہ مطمئن تھے کہ یہ دونوں ہتھیار اتفاق سے صرف اسرائیل کے حق میں ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ فلسطینی عوام کی خود مختاری کا ہر مطالبہ کسی کامیابی کے بغیر گھٹ جائے گا، اور آزادی کی ہر آواز صدا بصحرا بن جائے گی، ظلم و جبر کے آگے نہتے مسلمان دم بھی نہ مار سکیں گے۔ اور اس طرح وہ عرب علاقوں کو توسیع اسرائیل کی مہم میں ہڑپ کر جائیں گے۔

مگر مقبوضہ عرب علاقوں کے مسلمانوں میں آزادی وطن کی تازہ لہریں اتنی شدید اور منظم شکل میں اٹھی ہیں کہ اسرائیل دہشت سے کانپنے لگا ہے، اور نہ صرف اسرائیل بلکہ اسرائیل ساز حکومتیں بھی انجام و عواقب پر غور کرنے لگی ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ اسرائیلی فوجوں کا اس وقت نہ کسی گوریلا فوج سے سامنا ہے نہ گولہ و بارود سے مقابلہ ہے اور نہ ہی ان کے بالمقابل کوئی تربیت یافتہ جماعت ہے جسے کسی ملک یا سیاسی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہو۔ یہاں تک کہ ان سرگشتہ اور برگشتہ عوام کا کوئی ایک لیڈر اور رہنما بھی نہیں ہے۔ مسجدوں سے نماز کے بعد، مدرسوں اور اسکولوں سے کلاس کے بعد اور گھروں سے غیر متوقع اوقات میں ہر عمر کے مسلمانوں اور زیادہ تر نوعمر لڑکوں کی ٹولیاں نکلتی ہیں، فضا میں نعرۂ تکبیر کی صدا بلند ہوتی ہے اور پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ کرفیو کے بعد جب دوبارہ کیمپ اور شہر کھلتے ہیں تو جوق در جوق لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور پھر پتھروں کی بارش ہونے لگتی ہے یہ سنگ باری

غاصب اسرائیلی فوجوں اور حکام کے لئے سنگ ابابیل بن گئی ہے، اس لئے اب وہ حواس باختہ ہو رہے ہیں۔ اور اس حواس باختگی کے عالم سفاکی اور درندگی کے سارے حربے اپنا رہے ہیں۔ بے گناہ عوام کی بلاوجہ گرفتاری مظاہرین پر اندھا دھند فائرنگ، قیدیوں سے حیوانی سلوک، معصوم بچوں پر وحشیانہ مظالم، شریف خواتین کی تذلیل وآبرو ریزی اور معزز شہریوں کی جلاوطنی جیسی بے شمار شرمناک حرکتیں ہیں جن کا ارتکاب وہ کرتے جارہے ہیں۔

لیکن ان غارت گروں کی ظلم وبربریت میں جتنا اضافہ ہوتا ہے اسی تناسب سے عوامی ردعمل میں بھی اضافہ ہوتا ہے، اور خوف وہراس کی جگہ غم وغصہ اور جوش انتقام کا موزوں اظہار ہوتا ہے سڑکیں مظاہرین اور ان کے بعد پتھروں سے ڈھک جاتی ہیں فضا میں جلتے ہوئے ٹائروں کا دھواں بھر جاتا ہے، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گولہ وبارود کا مقابلہ کرنے والے سنگ بدست فلسطینی غاصبوں کو عاجز کرکے ہی دم لیں گے۔

۱۹۶۷ء کے آس پاس یا اس کے بعد یعنی فلسطین کی زبوں حالی اور غلامی کے دور میں جن بچوں نے جنم لیا ہے جن کی نشوونما اضطراب وانتشار، حقوق سلبی اور غیر یقینی حالات میں ہوئی ہے جن کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مسلمان ہیں، مظلوم ہیں اور خوددار ہیں جن کے سامنے ان کا تاریک قومی مستقبل ہے کربناک حال اور آزاد ماضی ہے وہ ہر صورت میں اس جنگ کو فیصلہ کن بنادینے پر مصر ہیں۔ وہ ہتھیاروں کی پروا کرتے ہیں نہ سیاسی مذاکرات پر یقین رکھتے ہیں، اور نہ ان کو مسلم حکمرانوں، ان کی کانفرنسوں اور ان کے راڈرس اور اواکس طیاروں سے کوئی امید ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سب ان کی شب غم کو طویل تو کرسکتے ہیں مختصر نہیں کرسکتے، وہ صرف خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہیں اور جہاد پر یقین رکھتے ہیں۔ اور یہی یقین ان کو مجبور کرتا ہے کہ جب اسرائیلی ہیبت سے سب لوگ لرزہ براندام ہوں تو وہ سڑکوں پر نکل کر اپنے سروں کی فصل لگادیں، اور پتھر اٹھاکر دشمن کو حواس باختہ کردیں۔

جن ماؤں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی قومی عظمت کو تاراج ہوتے دیکھا تھا اپنا گھر بار اجڑتے دیکھا ہے اور اپنے بھائی بند کو خاک وخون میں تڑپتے دیکھا ہے اب وہ اپنے بچوں کو آزادی کا دودھ اور حریت کی غذا کھلاتی ہیں اور کہنے لگی ہیں" جب تک میں زندہ ہوں میں نوجوانوں کو لڑنا سکھاتی رہوں گی یہاں تک کہ مسئلہ حل ہوجائے، ہم امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور ہم اپنی سرزمین سے یہودیوں کو نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔"

اس جدوجہد آزادی میں جب نوعمر لڑکے گرفتار کئے جاتے ہیں اور جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں ٹھونس کر اذیت پہونچائے جاتے ہیں تو ان کے جواں سال حوصلے ٹھٹھرنے کے بجائے کچھ اور کچھ

ہو جاتے ہیں، ان کی قوت مدافعت دو چند ہو جاتی ہے، ان کے جذبہ انتقام کی چنگاری شعلہ بن چکی ہوتی ہے اور اپنی مظلوم قوم سے محبت وحمیت اور آزادی وطن کا جذبہ ان کو بے خوف بنا دیتا ہے۔ یروشلم پوسٹ کے نامہ نگار کا یہ تجزیہ سو فی صد درست ہے کہ "اگر آپ ان لڑکوں کو پتھر پھینکنے والوں کی حیثیت سے جیل میں ڈالیں گے تو یہ جیل سے بم پھینکنے والے بن کر نکلیں گے۔ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے پر تشدد و تباہ کاری اور جلاوطنی کے واقعات کے نتیجہ میں جب ہنگامے اور مظاہرے شدید ہوئے تو اسرائیلی حکام اس کا تجزیہ کرنے پر مجبور ہوئے، اس تجزیہ نے ان پر یہ راز فاش کیا کہ پندرہ سے پچیس سال کے لڑکے ان ہنگاموں کی بنیاد ہیں جو لڑکا ایک مرتبہ جیل کاٹ کر آتا ہے وہ مجاہد آزادی بن جاتا ہے۔ جیل کی چہار دیواری اس کے لئے تربیت گاہ بن جاتی ہے اور قیدی ہم سبق ہو جاتے ہیں۔ جیل کی سزا کاٹتے ہوئے کل دو سو نوجوان ہیں جنھوں نے عام نوجوانوں میں روح جہاد اور جوش انتقام پیدا کر دیا ہے۔

اسرائیلی حکام، اسرائیل سار طاقتوں اور اسرائیل نواز حکومتوں کے لئے اس پورے قضیہ میں جو سب سے زیادہ پریشان کن معاملہ نظر آتا ہے وہ اس تحریک کا اسلامی اور عوامی ہونا ہے، تحریک اسلامی جتنا آج نوجوانوں میں مقبول ہو رہی ہے اور ان بکھرے ہوئے شیرازوں کو مجتمع کرنے میں کامیابی حاصل کر رہی ہے اس کی مثال ماضی قریب کی اسرائیلی مزاحمت میں نہیں ملتی، تحریک اسلامی فلسطین کی جنگ کو قومی لڑائی کے تنگنائے سے نکال کر اسلامی جہاد کے مرحلہ تک لانے کی کوشش میں مصروف ہے اور اس کے نتائج مخالفین پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں، یہ ان کی گھبراہٹ کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ غزہ کی اسلامی تحریک کے رہنما ایک معمر رسیدہ مفلوج شیخ احمد یسین ہیں گو کہ وہ خود حرکت نہیں کر سکتے مگر ٹائم کی رپورٹ کے مطابق ان کی بیٹھک نوجوانوں کی آماج گاہ بنی رہتی ہے اور وہ ان کو متحرک کرنے میں سب سے بڑا سبب ہیں۔ وہ پی۔ ایل او پر تنقید کرتے ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہو کر اسلام کے سوا دوسرا طریقہ نہیں اختیار کر سکتے، ظاہر ہے کہ یہ طریق کار نئی نسل کو خود اعتمادی کی طرف لے جاتا ہے، غزہ کے ایک شہر خان یونس میں اسلامی جہاد نامی تنظیم نے جب ہینڈبل تقسیم کئے تو آس پاس کے قصبات سے بھی نوجوانوں کی بڑی تعداد خان یونس آگئی اور جب فوج نے راستہ روکا تو انھوں نے سنگ باری شروع کر دی، اس تحریک کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اب تحریک اسلامی اور آزادی فلسطین کے لئے کام کرنے والی دوسری مسلم تنظیموں میں بھی اتحاد و تعاون کی فضا ہموار ہوئی ہے اور مشترکہ جد و جہد کے مظاہرے سامنے آئے ہیں۔ ایک طرف مجامع اسلامی اور جہاد اسلامی تنظیموں نے اپنی تعمیری اور کردار سازی کی مہم کا رخ عوامی بیداری اور براہ راست مزاحمت کی طرف موڑا ہے تو دوسری طرف پی ایل او اور دیگر قومی تنظیمیں اپنے آپ کو اس رخ پر ڈالنے کے لئے

کوشاں نظر آتی ہیں۔ اور اب نہ صرف جدوجہد کے انداز میں بلکہ نعروں اور مطالبوں میں بھی اسلامی انداز فکر جھلکنے لگا ہے۔ اور اسلامی روح کی طاقت عیاں ہونے لگی ہے۔

اسرائیل کے لئے پریشان کن دوسری چیز اس تحریک کا عوامی ہونا ہے۔ اب اس تحریک کی باگ سرگستہ اور برگشتہ نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے جن کو نہ خریدا جا سکتا ہے نہ دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے ہاتھ پاؤں مفلوج کرکے آزادی وطن کے مطالبہ سے دست بردار کیا جا سکتا ہے، ان مظاہروں کے سلسلہ میں قتل و غارگری کے بعد اسرائیلی حکام کی نئی حکمت عملی یہ سامنے آئی ہے کہ اب وہ مظاہرین اور احتجاجی نوجوانوں کو گولی سے نہیں بھونتے بلکہ اس طرح سے ٹارچر کرتے ہیں کہ پھر وہ کسی مظاہرہ میں حصہ لینے کے قابل نہ رہ سکیں اس کے باوجود یہ تحریک روزافزوں ہے نہ مظاہرہ میں کمی ہوئی اور نہ احتجاج بند ہوا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب، غزہ اور مغربی کنارہ کے روزانہ معمول میں داخل ہو چکا ہے۔ اور اس کے اثرات اسرائیلی ریاست اور دوسرے اسرائیل سے متاثرہ علاقوں تک محسوس کئے جا رہے ہیں۔

اس تحریک کا ایک تیسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں جو اس جنگ کو قومی انداز کی لڑائی سمجھ بیٹھے تھے اور یہ آرزو رکھتے تھے کہ ہم ہتھیاروں اور سیاسی دباؤ کے ذریعہ اسے جیت لیں گے اب وہ بھی پوری شدت کے ساتھ اس طریق مزاحمت کی اثر انگیزی کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ نیز ان عرب حکمرانوں اور مسلمانوں کے لئے بھی اس میں بڑا سبق ہے جو سیاسی شرک کے اس کنکھجورے سے اپنے دل ودماغ کو پاک نہیں کر سکے ہیں جو خود اعتمادی، سرفروشی اور ذوق شہادت کو چاٹتا جا رہا ہے۔

اگر یہ شہری جنگ کچھ عرصہ تک جاری رہی تو اسرائیل کی حواس باختگی انتہا تک پہونچ جائے گی، اس کے پائے چوبیں میں زلزلہ آ جائے گا اور ظلم و سفاکی، انسانی حقوق کی پامالی اور بین الاقوامی ردعمل سے چشم پوشی، کے نقد نتائج سامنے آ جائیں گے۔ کچلے اور ستائے گئے مسلمان صیہونیوں کی گردن تک پہونچ لگے اور پھر ان کے سامنے فرار یا موت کے علاوہ تیسرا راستہ نہ ہوگا۔

خیبر خیبر یا یہود	اے یہودیو! خیبر کی تاریخ دہرائی جانے والی ہے
جیش محمد سوف یعود	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہی جلد ہی لوٹنے والے ہیں

(فلسطینی مسلمانوں کا ایک نعرہ)

سال رواں ۱۹۸۸ء کے لئے

عالمی شاہ فیصل ایوارڈ

محمد رضی الاسلام ندوی

گزشتہ کئی سالوں سے خدمت اسلام، مطالعات اسلامی، ادب عربی، طب اور سائنس میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والوں کو سعودی حکومت کی جانب سے مرحوم شاہ فیصل کے نام سے منسوب عالمی ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ امسال ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے ۱۲ر جنوری ۱۹۸۸ء کو ان شخصیات کے ناموں کا اعلان کیا گیا جنہیں سال رواں ۱۹۸۸ء میں ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اس سے قبل ۹-۱۲ر جنوری ۱۹۸۸ء مطابق ۲۰-۲۳ر جمادی الاول ۱۴۰۸ھ انتخاب کمیٹی کی مسلسل میٹنگیں ہوئیں جن میں ان شخصیات کا انتخاب عمل میں آیا۔

طب اور سائنس کے ایوارڈ کا مستحق غیر مسلم ماہرین کو قرار دیا گیا ہے۔ طب کے ایوارڈ کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ ایک امریکی خاتون ڈاکٹر جانیت ڈیفسون راولی کو دیا گیا ہے جو شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور دوسرا ڈاکٹر ملفن فرانسس جرنیفر کو دیا گیا جو برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور لندن میں قائم مرکز تحقیقات سرطان دموی میں کام کرتے ہیں۔ ایوارڈ سرطان دموی (LEUKAEMIA) کی تشخیص کے سلسلے میں ان کی وقیع تحقیقات پر دیا گیا ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعے اس مہلک مرض کے کچھ نئے طریقہائے علاج دریافت کرنے اور نئی دوائیں ایجاد کرنے میں مدد ملی ہے۔ سائنس کا ایوارڈ بھی دو افراد میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک برطانیہ کے ڈاکٹر ریکارڈ میلیدی ہیں جو کیلیفورنیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور علم وظائف الاعضاء (PHYSIOLOGY) میں مہارت رکھتے ہیں اور دوسرے ڈاکٹر پیر سامیون فرانسی ہیں جو پاسٹور یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

ادب عربی کا ایوارڈ بھی دو اشخاص کو دیا گیا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر محمد بن شریفہ جو مراکش سے تعلق رکھتے ہیں اور جامعہ محمد الخامس رباط میں اندلسی ادب کے پروفیسر ہیں آپ نے اندلسی ادب کے میدان میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے دیوان ابن ذکون اور دیوان البسطی جو حکومت غرناطہ کے زمانے کے مخطوطے تھے۔ کی تحقیق کی ہے اور اس زمانے کے ایسے ادبی گوشوں کو نمایاں کیا ہے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے، عہد الموحدین کے شاعر ابن عمیرہ اور اندلسی امثال پر آپ کی گرانقدر تصنیفات ہیں۔ آپ نے اندلسی ادب، تہذیب اور معاشرت پر اس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے کہ اندلسی ادب کے

بحث و تحقیق کرنے والوں کے نزدیک انھیں بنیادی مراجع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد یوسف علی مکی جو مصر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور قاہرہ یونیورسٹی میں اندلسی ادب کے پروفیسر ہیں آپ نے دیوان ابن دراج القسطلی پر تحقیقی کام کیا ہے۔" اثر العرب والاسلام فی الحضارۃ الادربیہ (یورپی تہذیب پر عرب اور اسلام کے اثرات) آپ کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اندلسی مورخ ابن حیان پر بھی آپ نے تحقیق کی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اندلسی ادب کے متعدد شہ پاروں کو عربی زبان میں منتقل کیا ہے اور اسپینی زبان میں اپنے گرانقدر مقالات کے ذریعے اندلسی سرمایۂ علم سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔

خدمت اسلام کا ایوارڈ ڈاکٹر احمد دموکا والونتو کو دیا گیا ہے۔ موصوف فلپیں سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں کی اسلامی تحریک النھضۃ الاسلامیۃ" کے سربراہ ہیں۔ آپ نے فلپین میں متعدد اسلامی ادارے قائم کئے منداناو یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کا اقتصادی معیار بلند کرنے کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی۔ متعدد وقیع کتابیں تصنیف کیں اور بعض کتابوں کا داناد زبان میں ترجمہ کیا۔ فلپین میں سیاسی پیمانے پر مسلمانوں کو استحکام بخشنے اور اسلامی تشخص برقرار رکھنے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اور ملک وبیرون ملک اجتماعی، اقتصادی علمی اور سیاسی میدانوں میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مطالعات اسلامی کے ایوارڈ کا مستحق بھی دو افراد کو قرار دیا گیا ہے ایک ڈاکٹر مقداد یالجن اور دوسرے محمد قطب ڈاکٹر مقداد یالجن ترکی کے رہنے والے ہیں۔ آپ نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی تربیت کے گوشوں کی وضاحت کی ہے اور تربیت سے متعلق مغربی افکار پر تنقید کی ہے۔" جوانب التربیۃ الاسلامیۃ اور اہداف التربیۃ الاسلامیۃ آپ کی مشہور اور قابل ذکر تصنیفات ہیں۔

استاذ محمد قطب کی شخصیت ہمارے لئے نئی نہیں ہے۔ آپ مشہور اخوانی رہنما سید قطب شہید کے چھوٹے بھائی ہیں اور خود بھی اخوان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی جرم کی پاداش میں ایک زمانہ میں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیے ہیں۔ موصوف کی متعدد تصنیفات کے اردو زبان میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے اردو خواں طبقہ ان کی اسلامی فکر اور گرانقدر تصنیفات سے بخوبی مستفید ہو رہا ہے۔ اس لئے ذیل میں ان کا کسی قدر تفصیل سے تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

آپ کی پیدائش مصر کے ایک گاؤں "موشا" میں ہوئی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم قاہرہ میں حاصل کی ۳۶-۱۹۳۷ء کے تعلیمی سال میں قاہرہ یونیورسٹی (جو ان دنوں جامعۃ فواد الاول کے نام سے جانی جاتی تھی) میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں انگریزی ادب میں بی۔ اے کیا پھر ۱۹۴۱ء میں المعہد العالی للمعلمین قاہرہ سے تربیت وعلم النفس میں ڈپلوما حاصل کیا۔ پھر چار سال تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد دار الکتب المصریہ سے متعلق ہو گئے جہاں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کام کرتے رہے پھر مزید پانچ سال وزارت

تعلیم کے شعبۂ ترجمہ میں کام کیا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک دو سال پھر درس وتدریس میں مشغول رہے۔ اس کے بعد وزارت تعلیم اعلیٰ کے شعبۂ ثقافت عامہ سے متعلق ہو گئے اور اس کے پروجکٹ "الف کتاب" کی نگرانی کرنے لگے۔ یہ پروجکٹ مختلف علوم وفنون میں عام فہم کتابوں کی تصنیف وترجمہ کا تھا جسے عوام کی ثقافتی معلومات میں اضافہ کے لئے کم قیمت پر فراہم کیا جا سکے۔ یہاں وہ ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ تک رہے پھر کلیۃ الشریعۃ مکہ مکرمہ میں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کر دیا۔ اس وقت کلیۃ الشریعہ کا الحاق جامعۃ الملک عبدالعزیز سے تھا۔ بعد میں اس کا الحاق جامعۃ أم القریٰ سے ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک قسم الدراسات العلیا میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں

تربیت، علم النفس، سماجی علوم اور ادب کے میدانوں میں آپ کی گرانقدر تصنیفات ہیں جن کی تعداد پندرہ تک پہنچتی ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ الانسان بین المادیۃ والاسلام طبع اول ۱۹۵۱ء

۲۔ شبہات حول الاسلام طبع اول ۱۹۵۷ء اس کا اردو ترجمہ "اسلام اور جدید ذہن کے شبہات" کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہو گیا ہے۔

۳۔ فی النفس والمجتمع طبع اول ۱۹۵۶ء

۴۔ قبسات من الرسول طبع اول ۱۹۵۸ء

۵۔ معرکۃ التقالید طبع اول ۱۹۵۹ء

۶۔ هل نحن مسلمون؟ طبع اول ۱۹۶۰ء اس کا اردو ترجمہ "کیا ہم مسلمان ہیں" کے نام سے مکتبہ الحسنات دہلی سے شائع ہو گیا ہے۔

۷۔ منہج التربیۃ الاسلامیہ۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ نظریہ سے متعلق ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اور دوسرا حصہ عملی تطبیق سے متعلق ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔

۸۔ منہج الفن الاسلامی طبع اول ۱۹۶۲ء

۹۔ دراسات فی النفس الانسانیۃ طبع اول ۱۹۶۳ء

۱۰۔ التطور والثبات فی حیاۃ البشریہ طبع اول ۱۹۶۳ء اس کے اردو ترجمہ کی اشاعت مرکزی مکتبہ اسلامی سے "انسانی زندگی میں جمود وارتقا" کے نام سے ہو چکی ہے۔

۱۱۔ جاہلیۃ القرن العشرین طبع اول ۱۹۶۵ء اس کا اردو ترجمہ "جدید جاہلیت" کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی سے شائع ہو چکا ہے

۱۲- دراسات قرآنیہ طبع اول ۱۹۷۸ء

۱۳- مذاہب فکریۃ معاصرۃ طبع اول ۱۹۸۳ء اس کا اردو ترجمہ "اسلام اور جدید مادی افکار" کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۴- واقعنا المعاصر طبع اول ۱۹۸۵ء

۱۵- مفاہیم ینبغی أن تصحح طبع اول ۱۹۸۶ء

ان کے علاوہ آپ کی ایک کتاب "کتاب التوحید" کو حال ہی میں سعودی عربیہ کے ثانوی مدارس کے سال اول، سال دوم اور سال سوم کے نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ تین مزید کتابیں زیر طبع ہیں :

۱- حول التفسیر الاسلامی للتاریخ

۲- کیف نکتب التاریخ الاسلامی ؟

۳- المستشرقون والاسلام

مندرجہ بالا تصنیفات میں "منہج التربیۃ الاسلامیۃ" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ شاہ فیصل ایوارڈ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں خاص طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے اس کتاب میں آپ نے کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کا تربیتی نقطۂ نظر پیش کیا ہے تربیتی حقائق کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ تربیت کے سلسلہ میں غیر اسلامی نظریات پر بحث کی ہے اور ان پر علمی انداز میں تنقید کی ہے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ مصر کی مختلف یونیورسٹیوں اور اعلیٰ اداروں میں اور سعودیہ آنے کے بعد وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں اور ادبی و ثقافتی مجلسوں میں لکچر دے چکے ہیں اور ملک و بیرون ملک متعدد کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

عالمی شاہ فیصل ایوارڈ کمیٹی نے آئندہ سال (۱۹۸۹ء) کے ایوارڈ کے لئے درج ذیل موضوعات کا اعلان کیا ہے :

مطالعات اسلامی کے لئے : اسلامی تمدن سے متعلق مطالعات

ادب عربی کے لئے : تیسری صدی ہجری تک شعر و نثر میں شہرت رکھنے والی ادبی شخصیات سے متعلق مطالعات

طب کے لئے : عقم (بانجھ پن)

سائنس کے لئے : طبیعیات (PHYSICS)

(تلخیص از روزنامہ المدینۃ شمارہ ۷۶۴۷ ، ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ)

تنقید و تبصرہ :- **توحید کی حقیقت اور اس کے تقاضے** : از مولانا عبدالرحمٰن خاں حماد عمری، قاسمی، صفحات ۶۴، قیمت دو روپے۔ ناشر مرکزی جمعیت ابنائے قدیم جامعہ دارالسلام عمرآباد تامل ناڈو۔

توحید کیا ہے، توحید ہی کیوں اختیار کریں، توحید کا عقلی ثبوت کیا ہے، توحید کے فکری اور عملی تقاضے کیا ہیں؟ ان سوالوں کا جواب مولانا عبدالرحمٰن حماد صاحب نے اس کتاب میں دیا ہے، انداز بیان سلیس اور قابل فہم ہے، مولف نے قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے۔ اور زیادہ تر اصولی نوعیت کی گفتگو کی ہے لیکن مسلمانوں کی اس بے راہ روی کی بھی نشاندہی کی ہے جو اپنے مزاج اور اثرات کے لحاظ سے شرک سے کچھ کم نہیں بلکہ شرک ہی کے قبیل کی ہے، عموماً اس قسم کے موضوع پر لکھتے ہوئے ہمارے اصحاب علم قبر پرستی نذر و نیاز، استمداد بالاولیاء جیسی برائیوں کو ہدف تنقید بنانے میں روحانی سکون محسوس کرتے ہیں مگر اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ "غیر اللہ کے احکام پر بھی مشرک ہی کی ایک قسم ہے ص۲۲" حالانکہ یہ بھی یکساں توجہ کا مستحق ہے۔ اور شرک کی ہر شکل قابل مذمت ہے۔

یہ کتاب جس طرح ایک ملحد، مشرک، متذبذب، انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے اسی طرح ایک مسلمان کے لئے بھی مفید ہے، مناسب قیمت اور عمدہ طباعت کی یہ کتاب ہر خاص و عام کے لئے لائق مطالعہ ہے۔

ماہنامہ آموزگار : مدیر اکبر رحمانی، جلگاؤں، خاص شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء، قیمت ۸ روپے اردو پرائمری، سکنڈری اور ہائر سکنڈری ٹیچروں کا ترجمان، ماہنامہ آموزگار کا یہ خاص شمارہ ہے۔

جناب صغیر احمد کی رپورتاژ "پروفیسر اکبر رحمانی کی تصنیف تحقیقات و تاثرات کی رونمائی" کے بعد پروفیسر اکبر رحمانی کا ایک خاص اور نسبتاً طویل مقالہ بعنوان "بڑھتی ہوئی منافرت میں نصابی کتابوں کا رول" زیب شمارہ ہے۔

یہ بات انتہائی حیرت ناک اور تشویش ناک ہے کہ ادھر چند دہوں سے ملکی ذرائع ابلاغ خواہ وہ اخبارات ریڈیو اور ٹی وی ہوں یا درسی کتابیں ایسا زہریلا مواد اگلنے کا ذریعہ بن گئے ہیں جو نہ صرف انسانی اقدار، تاریخی حقائق کے لئے چیلنج ہیں بلکہ ملکی سالمیت کے لئے بھی خطرناک ہیں۔ بالخصوص نوخیز ذہنوں میں درسی کتابوں کے ذریعہ جس طرح باہمی منافرت کا بیج بویا جا رہا ہے وہ آگے چل کر شدید تباہی کا باعث ہوگا، اگر یہ بات درست ہے کہ جرمنی کے مدرسوں میں پڑھایا گیا نصاب تاریخ دو عالمی جنگوں کا سبب بنا تو پھر یہ بھی درست ہے کہ آج ہندوستان میں جو تاریخ بچوں کو پڑھائی جا رہی ہے وہ کل کے بھیانک نتائج کا سبب ہوگی

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

جلد ۸ ، اپریل ۱۹۸۸ء شعبان / رمضان ۱۴۰۸ھ ، شمارہ ۴

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ: مدیر زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے: منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے حال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا فون: ۲۷۳۲۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات :

تحریکی نوجوانوں سے ایک خطاب

(جسے بعد میں قلم بند کیا گیا)

سید جلال الدین عمری

طالب علموں اور نوجوانوں کی اہمیت ہر زمانہ میں رہی ہے۔ آج بھی ان کی بڑی اہمیت ہے بلکہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت ہے یہی وہ طبقہ ہے جس کے ہاتھ میں جلد ہی ملک اور قوم کی باگ ڈور ہوگی۔ وہ اگر صحیح فکر اور صحیح سیرت کا حامل ہوگا تو پورے ملک کو صحیح راہ پر لے چلے گا اور اگر وہ فکری اور عملی بے راہ روی کا شکار ہو جائے تو پوری قوم اور ملک کا رخ بھی غلط ہو جائے گا۔ یہ قوم کے معمار ہیں، اس کی قسمت ان سے وابستہ ہے۔ ان میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو بڑی عمر والوں میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی فکر و خیال کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو دور و نزدیک کی مصلحتیں اور بسا اوقات عصبیتیں کسی فکر کو قبول کرنے سے روک دیتی ہیں۔ نوجوانوں کے مضبوط عزائم ان زنجیروں کو کاٹ سکتے ہیں۔ ان کی راہ میں بالعموم وہ چیزیں رکاوٹ نہیں بنتیں جو بڑوں کی راہ کی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں تازہ خون، نیا جوش اور ولولہ ہوتا ہے۔ اس لئے کچھ کر دکھانے کا حوصلہ اور اس کی قوت و صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ صحیح سمجھیں اس پر عمل کر سکتے ہیں کسی فکر سے تعاون کرنا اور خاموش بیٹھے رہنا یہ نوجوانوں کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ اس کے لئے تکلیفیں اٹھا سکتے ہیں اور قربانیاں دے سکتے ہیں۔

ان ہی اسباب کی بنا پر نوجوان ہر تحریک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کو ہر تحریک اپنے ساتھ لینے اور ان سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے جب کسی تحریک میں جوانوں کی آمد رک جاتی ہے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جو بھی بڑے انقلاب آئے ان میں نوجوانوں کا ہاتھ رہا ہے، ان کی قربانیوں ہی نے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ نوجوانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بندگی رب کی طرف دعوت دی تو نوجوانوں نے ہی آگے بڑھ کر اسے قبول کیا اور فرعون کے ظلم و ستم کو برداشت

کرنے کے لئے تیار ہوئے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۚ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (یونس۔ ۸۳)

موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون دنیا میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔ اس میں فیصلہ وحدہ ا

اصحاب کہف نوجوان ہی تھے جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کے دین کی خاطر اس دنیا کی زیب و زینت و آرائش کو چھوڑا جا سکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے غاروں میں پناہ لی جا سکتی ہے۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ (کہف۔ ۱۳، ۱۴)

وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمان اور زمین کا رب ہے ہم اسے چھوڑ کر ہم کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بیجا بات کریں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں ہی نے آپ کا ساتھ دیا۔ اولین صحابہ میں حضرت علیؓ سب سے کم عمر تھے جن کی عمر نو سال سے لے کر گیارہ سال تک بتائی جاتی ہے اور بڑی عمر والوں میں حضرت ابوبکرؓ ہیں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ اڑتیس سال تھی۔ دو ایک کے علاوہ بیشتر صحابہ کی عمریں اس سے کم ہی تھیں۔

موجودہ دور میں اسلامی تحریک نوجوانوں کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برت سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اُن کے مسائل کو سمجھیں اور انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ آج کے نوجوان جن مسائل سے دوچار ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ آج کا نوجوان ایک طرح کی ذہنی انتشار میں گرفتار ہے اس کے سامنے نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ طرح طرح کے اور متضاد نظریات نے اسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ ان نظریات کے درمیان حیرانی اور سرگشتگی

کے عالم میں کھڑا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان میں کس کو اختیار کرے اور کس کا ساتھ دے۔ فکری لحاظ سے ان میں سے کسی بھی نظریہ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس کے تمام مادی و روحانی مسائل کو حل کر سکے۔ ایک پہلو سے وہ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسرے پہلو سے اسے بے اطمینانی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان میں سے ہر نظریہ عملی لحاظ سے اس کے لئے سخت تباہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ان کا بُری طرح استحصال کرتا ہے اور اس کی قوتوں اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ اپنی بھلائی نہیں دیکھتا ہے۔

۲۔ اس وقت پوری دنیا اخلاقی بحران سے گزر رہی ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بحران کا شکار ہے۔ اخلاقی اقدار انسان کو بعض اصولوں کا پابند بناتی ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ دنیا نے ہمیشہ ان اخلاقی اقدار کو دائمی قدر وقیمت رکھنے والے اقدار سمجھا ہے۔ ان کی خلاف ورزی کو وہ جرم تصور کرتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ دور کے انسان کے نزدیک یہ اخلاقی قدریں ابدی نہیں ہیں۔ یہ سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے قدیم اقدار پر اصرار کرنا اور ان کی پابندی کو ضروری تصور کرنا قدامت پرستی اور بے دانشی کی دلیل ہے۔ اس تصور کے ساتھ اخلاق کی دائمی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی جس اخلاقی قدر کو چاہے دورِ جاہلیت کی یادگار کہہ کر پامال کر سکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو زبانی طور پر تو اخلاقی اقدار کی مستقل اہمیت کے قائل ہیں لیکن عملاً ان کے نزدیک ان کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کے لئے کوئی بڑا نقصان برداشت کیا جائے یا کسی حاصل ہونے والے فائدہ کو چھوڑ دیا جائے۔ صداقت اور راست بازی ایک اخلاقی قدر ہے۔ اس کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتے ہیں لیکن کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے فائدہ کے لئے وہ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ یہی حال اور اخلاقی اقدار کا ہے اس اخلاقی زوال کی وجہ سے کسی بھی شخص کو کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے سے خوف محسوس کرتا ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بے اعتمادی کی فضا میں جی رہا ہے۔ اسے نہ تو کسی کی دیانت، امانت، عہد وپیمان اور خلوص پر اعتماد ہے اور نہ کوئی دوسرا اس پر اعتماد کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ایک ایسی ہی دنیا ملی ہے جو بے اصول اور اخلاق سے محروم ہے۔ وہ یہاں بے اصولی اختیار کر کے ہی کامیاب ہو سکتا ہے ورنہ اسے قدم قدم پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

۳۔ جنسی آوارگی موجودہ فلسفوں نے انسان کو حیوان کی سطح پر پہونچا دیا ہے۔ وہ حیوان

کے نقطۂ نظر سے ہر مسئلہ کو دیکھتا ہے اور اسے فطری نقطہ نظر سمجھتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جنسی آزادی کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح مکمل جنسی آزادی چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جنسی جذبات کو مذہب اور اخلاق کے نام پر دبانا غیر فطری اور نقصان دہ ہے۔ اس سے انسان کے ذہن و مزاج پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لئے اس نے جنسی جذبات کو ابھارنے والا پورا ماحول تیار کر رکھا ہے۔ ریڈیو، ٹیلویژن، اخبار و رسائل، گندے اشتہارات اور گندی کتابیں غرض نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس ماحول کو بنانے اور ترقی دینے میں مدد دے رہے ہیں۔ انسان کے اندر جوانی کے دور میں جنسی جذبات کا طبعی طور پر غلبہ رہتا ہے۔ موجودہ ماحول نے ان جذبات کو اور بھڑکا دیا ہے۔ آج کے نوجوانوں پر جنسی جنون سوار ہے اور کسی سنجیدہ کام سے انھیں دل چسپی نہیں رہ گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان جذبات کو کنٹرول کیا جاتا اور صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی اور اس کا عادی بنایا جاتا لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔

۴۔ تعلیم کو موجودہ دور کی خرابیوں کا علاج سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تعلیم جیسے جیسے عام ہوگی یہ خرابیاں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم اصلاح کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کو بنانے اور سنوارنے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن موجودہ نظام تعلیم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ یہ ساری خرابیاں بڑی حد تک اسی نظام تعلیم کی پیدا کردہ ہیں۔ جس تعلیم نے پورے معاشرہ کو مسموم بنا رکھا ہو اسے تریاق سمجھنا بہت بڑی نادانی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ تعلیم عام ہو رہی ہے اور اس کے حاصل کرنے والوں کا اوسط بھی بڑھ رہا ہے۔ اگر اس سے موجودہ بگاڑ دور ہو سکتا تھا تو جس تناسب سے تعلیم پھیل رہی ہے اسی تناسب سے بگاڑ میں بھی کمی آتی۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں آرہی ہے بلکہ روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

•

موجودہ نظام تعلیم انسان کے اندر خالص مادی نقطۂ نظر پیدا کرتا اور اسے خود غرض اور ذاتی مفاد کا بندہ بناتا ہے۔ ہر معاملہ میں ذاتی مفاد اس کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اسی پہلو سے اسے دیکھتا اور اسی لحاظ سے عملی قدم اٹھاتا ہے۔ کم از کم مشرقی ملکوں میں موجودہ نظام تعلیم آدمی کو قوم و ملک اور نوع انسانی کا خیر خواہ تو درکنار ایک اچھا شہری بنانے میں بھی ناکام ہے۔ اسی نظام تعلیم کے تحت آج کے طلبا اور نوجوانوں کی ذہنی و فکری تربیت ہو رہی ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر پروان چڑھ رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمیں ایک ایسی نسل مل رہی ہے جو صرف اپنی ذات کے لئے جی رہی ہے اور جس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔

یہ حالات اور مسائل طلبا، اور نوجوانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر حالات سے

آج کام ہو رہا ہے۔ لیکن آپ نے طلبا اور نوجوانوں کو اپنا میدان کار مقرر کیا ہے اس کے پیش نظر چند باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

۱۔ موجودہ دور کی سب سے بڑی خامیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد حیات نہیں ہے۔ مقصد حیات جتنا بلند اور پاکیزہ ہوگا اتنی ہی پاکیزہ خوبیاں انسان کے اندر ابھریں گی اور وہ خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پاسکے گا۔ خدا کا شکر ہے آپ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد حیات رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اس مقصد کا خود آپ کو گہرا شعور ہونا چاہیے۔ آپ کو یہ پورا یقین ہونا چاہیے کہ یہی ایک مقصد صحیح اور حق ہے اس کے علاوہ زندگی کے جتنے مقاصد ہوسکتے ہیں وہ سب غلط اور باطل ہیں۔ پھر آپ کی پوری زندگی پر اس کی گہری چھاپ ہونی چاہیے۔ آپ کی ایک ایک حرکت اور عمل سے ظاہر ہونا چاہیے کہ آپ پر اسی مقصد کی حکمرانی ہے اور آپ کے تمام اعمال اسی کے تابع ہیں۔ آپ ان ہی امور میں دلچسپی لیں جن کی اجازت آپ کا مقصد آپ کو دے اور ان تمام امور سے کنارہ کش ہو جائیں جو اس مقصد سے متصادم ہوں۔ آپ کے قول و عمل پر وہ اس طرح چھا جائے کہ آپ کو دیکھنے والا ہر نوجوان محسوس کرے کہ آپ کی زندگی بے مقصد نہیں اور نہ کسی چھوٹے اور کم تر درجے کے مقصد کو آپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے آپ کی تعلیم بھی ہے اور تربیت بھی اسی کو غالب و بلند کرنے کے لئے آپ سوچتے بھی ہیں اور تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر یہ سوال ہی نہ ابھرنے پائے کہ دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ یاد رکھیے ایک بامقصد انسان ہی دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جو انسان کسی مقصد کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہو، جس کے اوقات اور قوت و صلاحیت اس کے لئے صرف ہو رہے ہوں اس سے دوسرا شخص جو صاحب احساس ہے اسی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ آپ بامقصد ہیں صحیح مقصد کے حامل ہیں اور ایک بالا و بلند تر منزل آپ کے سامنے ہے تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔

۲۔ آپ جس مقصد کے حامل ہیں اس کا اپنے حلقۂ احباب میں تعارف کرائیے اور مسلسل تعارف کرائیے آپ کو جو بھی وقت ملے اس کام میں صرف کیجئے۔ یہاں تک کہ آپ سے ملنے والا ہر شخص یہ سمجھ لے کہ آپ جس مرکز و مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اسی کو دوسروں کی زندگی کا بھی مقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت، دولت، علم اور صلاحیت جو کچھ بھی ہے اسے اسی کام میں لگائیے۔ پھر یہ کام نتائج سے بے فکر ہو کر انجام دیجئے۔ نتائج سے بے پروا ہو کر کام کرنا آسان نہیں ہے۔ انسان جب اپنی محنت کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھتا ہے تو اسے مایوسی ہوتی ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اسے اپنا فرض تصور کرے اور یہ سمجھے کہ مخاطب چاہے میری بات قبول کرے یا نہ کرے

مجھے بہرحال اپنا فرض ادا کرنا ہے اور مخاطب کے انکار کی وجہ سے میرا فرض ساقط نہیں ہو جائے گا۔ اس جذبہ کے ساتھ آپ کام کریں گے تو نہ تو آپ کی ہمت ٹوٹے گی اور نہ آپ پر مایوسی طاری ہوگی۔ ویسے یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ اسلام کی دعوت میں بڑی جان ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اگر فطرت مسخ نہ ہوئی ہو تو اس کا انکار ضمیر پر سخت گراں گزرتا ہے۔ صحیح الفطرت انسان اسے آسانی سے رد نہیں کرسکتا۔

بہت سے نوجوان اس کام کے لئے وقت کے نہ ہونے یا اس کی کمی کا عذر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ ذہین سے ذہین اور محنتی سے محنتی طالب علم بھی تفریح اور کھیل کود کے لئے وقت نکالتا ہے، دوستوں کے درمیان بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں بھی وقت صرف ہوتا ہے۔ تھوڑا بہت وقت غفلت کی بھی نذر ہو جاتا ہے۔ چھٹیاں بالعموم بے مقصد کاموں میں گزر جاتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے ان ہی فاضل اوقات کو دعوت کے کام میں لگائے تو بہت مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ جس شخص کے سامنے کوئی مقصد حیات ہو اور وہ اسے دوسروں تک پہونچانا بھی چاہتا ہو وہ مصروف ترین لمحات میں بھی اس کے لئے وقت نکال لے گا۔ مقصد حیات انسان کے ذہن و مزاج کو بدل دیتا ہے، اس کی دلچسپیوں کو بدل دیتا ہے، اس کے ترک و اختیار کے پیمانوں اور اس کی گفتگو کے موضوعات کو بدل دیتا ہے وہی وقت جس میں لوگ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں، فلمی گانوں کے سننے اور ٹیلی ویژن کے گندے پروگرام دیکھنے میں صرف کرتے ہیں ہنسی مذاق اور ٹھٹھوں میں گنواتے ہیں، سیر سپاٹوں اور تفریحوں میں ضائع کرتے ہیں با مقصد انسان اسی کو اپنے مقصد کی تبلیغ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور ان موضوعات پر بحث اور گفتگو کے لئے استعمال کرتا ہے جو اس کے مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہے۔ وہ یہ کہ تبلیغ و دعوت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اپنی تعلیم سے غفلت برتیں۔ اگر آپ طلباء میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ علم کے میدان میں اونچا مقام پیدا کریں۔ ایک طالب علم اسی طالب علم سے سب سے زیادہ متاثر بلکہ مرعوب ہوتا ہے جو پڑھنے لکھنے میں فائق اور برتر ہو۔ جو طالب علم تعلیم کے میدان میں پیچھے ہو اس کا دوسرے طالب علم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خاص کر کسی سنجیدہ طالب علم کو اگر یہ محسوس ہو کہ کسی تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آپ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں تو وہ آپ کے قریب نہیں ہوگا۔

۲۔ اسلام نے شروع ہی سے عقائد و عبادات کے بعد جس چیز پر زیادہ زور دیا ہے وہ اخلاق ہے آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ اسلام جگہ جگہ ان اخلاقی اوصاف کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے جنہیں وہ

انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پوری دعوت میں اخلاقیات اس طرح رچی بسی ہیں کہ ان کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خود بھی ان اخلاقیات کی پابندی کیجئے اور نوجوانوں کو بھی ان کا پابند بنائیے۔ ان کو لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ اور پاسبان بنا کر کھڑا کیجئے۔ دنیا کی تحریکیں اپنے غلط مقاصد کے لئے غلط طریقے سے طلباء کو استعمال کرتی ہیں۔ وہ ان کو حدود و قیود سے آزاد کر دیتی ہیں اپنے مخالفین کے خلاف بھڑکاتی ہیں، ان سے ہنگامے کراتی ہیں تخریب کے کام لیتی ہیں لیکن آپ اس طرح کے کام نہ ان سے لے سکتے ہیں اور نہ آپ کو لینا چاہئے آپ کو ان کے ذہن و فکر کو بنانا ہوگا۔ ان کو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر لگانا ہوگا اور انھیں اس مقام تک پہنچانا ہوگا کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے علمبردار بن جائیں۔

آخری بات یہ کہ آپ کا مقصد دنیا کی کامیابی نہیں آخرت کی کامیابی ہے۔ آپ کی ساری کوششیں اسی کے لئے ہیں۔ اس مادہ پرست دور میں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آج کے نوجوانوں میں یہی تصور آپ کو پیدا کرنا ہے۔ بظاہر یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انسان کے عزم کے سامنے کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں کامیابی عطا فرمائے۔

اسلام کے احکام و ہدایات کا ایک خاصا بڑا حصہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے وقف ہے اور اس کی پیروی بھی اس نے اسی طرح لازمی قرار دی ہے جس طرح اپنی دوسری احکام کی۔ وہ جہاں حقوق اللہ سے بحث کرتا ہے وہیں حقوق العباد کو بھی پوری اہمیت سے لیتا ہے۔ وہ صرف پرستش کا طریقہ بتا کر خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک پورا نظام اطاعت بھی دیتا ہے۔ منزلی اور عائلی، شہری اور ملکی، اخلاقی اور معاشرتی، تمدنی اور معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی، غرض حیات انسانی کا کوئی شعبہ نہیں جس کے سلسلے میں اس کے احکام موجود نہ ہوں اور زندگی کی کوئی گزرگاہ نہیں جہاں اس کے ہدایت نامے آویزاں نہ ہوں۔

اسلام اور اجتماعیت صـ ۲۲-۲۳

عائلی قوانین

آئین کی روشنی میں

سید امین الحسن رضوی

ہمارے ملک کے دستور کی ایک خصوصیت، جس کا اس مضمون سے براہ راست تعلق ہے، یہ ہے کہ اگرچہ دستور کے ابتدائیہ (PREAMBLE) میں ہندوستان کو ایک "سیکولر جمہوریہ" کہا گیا ہے لیکن ہمارا دستور فی نفسہ مذہب کی نفی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ مختلف مذاہب کے وجود کو باضابطہ طور پر تسلیم کرتا ہے اور مذہب ہی کی بنیاد پر مختلف طبقات کو گروہی تشخص بھی عطا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دستور میں ان تمام مذاہب کا نام بنام ذکر نہیں کیا گیا ہے جن کے ہندوستانی پیرو باہم مل کر ایک قوم بنتے ہیں۔ تاہم دو متعین سیاق کے تحت دستور میں سکھ مت، ہندومت، بدھ مت اور جین مت کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے (دفعہ ۲۵ (۲) (ب) توضیح نمبر ۲) لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان نامزد مذاہب کے علاوہ ہمارا دستور دوسرے مذاہب کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے کہ دستور دفعہ ۱۵ (۱) و (۲) میں صراحتاً یہ اعلان کرتا ہے کہ ریاست ہندوستان کے کسی بھی شہری کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھے گی اور نہ مذہب کی بنیاد پر کسی فرد کے حقوق میں کمی کی جائے گی۔ پھر دفعات ۲۹ و ۳۰ بطور خاص اقلیتوں کے حقوق کا تذکرہ کرتی ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ کہ گو دستور میں کوئی متعین دفعہ ایسی نہیں ہے جس میں ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم کہا گیا ہو تاہم ہمارا دستور ہندوستان کے تمام شہریوں کو، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہبی گروہ سے ہو، ہندوستانی قومیت کے اجزاء کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان کے مجموعہ کو ہندوستانی قوم سمجھتا ہے۔ اس طرح ہر ہندوستانی کا اس ملک سے دو طرح کا قانونی تعلق ہے۔ ایک تو انفرادی طور پر اس کے ہندوستان کا شہری ہونے کی حیثیت سے اور دوسرا ایک متعین اور مخصوص مذہبی گروہ کے رکن ہونے کے باعث گروہی حیثیت میں۔ اس گروہی حیثیت کو دستور ہند کی دفعات ۲۶ اور ۲۷ میں الفاظ (RELIGIOUS DENOMINATION) اور مذہبی اقلیت کی حیثیت کو دفعہ ۳۰ (۱) و (۲) میں
MINORITY BASED ON RELIGION

کے الفاظ کے ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ متعدد سرکاری فارموں میں ایک خانہ قومیت کے اظہار کے بارے میں ہوتا ہے جس میں فارم بھرنے والے کو اپنی قومیت بتانی ہوتی ہے، اور ہم اس خانہ میں اپنی قومیت 'ہندوستانی' لکھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ خود ہندوستان کے دستور میں سوائے اس کے ابتدائیہ (PREAMBLE) کے اور کہیں بھی لفظ قوم (NATION) استعمال نہیں ہوا ہے۔ گو اس کی دفعہ ۵۱۔اے میں 'قومی پرچم، قومی ترانہ اور قومی خدمات' کے الفاظ آئے ہیں لیکن باقی ہر جگہ ہندوستان کے باشندوں کے لئے شہری (CITIZEN) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بہر حال یہ ایک واقعاتی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کو ماننے والے گروہ آباد ہیں اور یہ سارے گروہ مل کر ہندوستانی قومیت کی تشکیل کرتے ہیں اس حقیقت کو ہندوستان کا دستور بھی تسلیم کرتا ہے۔

ہمارے فاضل اور صاحب بصیرت واضعانِ دستور کو اس بات کا اندازہ تھا کہ استبداد کی بدترین شکل ایک جمہوری نظام میں اکثریت کا استبداد ہے، ساتھ ہی ان کی دور رس نگاہیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ اس ملک کے جمہوری نظام کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ملک کے کثیر المذہبی ہونے کے باعث ایک طویل مدت تک یہاں جمہوری اصول کے تحت اکثریت کی حکومت عملاً اکثریتی فرقہ کی حکومت کے روپ میں کارفرما رہے گی۔ اس لئے ان کی فراخی اور دانائی نے یہ ضروری سمجھا کہ دستور ملک میں نہ صرف اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس ملک کے مختلف مذہبی اور لسانی گروہ باہم مل کر ہندوستانی قوم کی تشکیل کرتے ہیں بلکہ اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اکثریت کے استبداد (TYRANNY OF MAJORITY) کے خطرہ کی پیش بندی کے طور پر مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کو دستوری تحفظ بھی عطا کر دیا جائے۔

دستور ہند کا جو میں نے مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ دستور نے اقلیتوں کو جو تحفظات عطا کئے ہیں وہ ان کے مسائل کے حل کے لئے بالکل کافی ہیں بشرطیکہ ان پر تعصبات سے بلند ہو کر اسی وسیع النظری اور فراخ دلی سے عمل کیا جائے جو انھیں دستور میں فراہم کیا گیا ہے۔ میں ذیل میں ایک ایسے مسئلے کا دستور ملک میں فراہم کردہ تحفظات کی روشنی میں جائزہ لوں گا جو مسلمانوں کو ذہنی طور پر سب سے زیادہ مضطرب کئے ہوئے ہے۔

یہ مسلمانوں کے عائلی قانون (پرسنل لا) کا مسئلہ ہے۔ ایک طرف تو یہ رجحان ہے بلکہ بعض طبقات کی طرف سے یہ مطالبہ ہے اور حکومت بھی اس رجحان کی حامی ہے کہ تمام ہندوستانیوں کے لئے ایک ہی عائلی قانون ہو۔ مسلمانوں کا اس بارے میں موقف یہ ہے کہ ان کے عائلی قانون (جس سے نکاح و طلاق وراثت اور ان کے ذیل میں آنے والے امور ہیں) کی بنیاد مذہبی احکام ہیں جو براہ راست قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے اس میں تغیر کی گنجائش

تو ہو سکتی ہے لیکن کسی ترمیم یا تبدیلی کا مجاز کوئی بھی نہیں اور وہ مسلمانوں کی حد تک حوں کے توں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابل پابندی ہیں۔ ارباب حکومت اور دوسرے وہ لوگ جو تمام ہندوستانیوں کے لئے ایک ہی عائلی قانون کے حامی ہیں، دستور ہند کی دفعہ ۴۴ پر انحصار کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ریاست تمام ہندوستان میں اپنے تمام شہریوں کو ایک یونی فارم سول کوڈ کے تحت لانے کی کوشش کرے گی (یہاں میں یہ تسلیم کرکے چلتا ہوں کہ دستور میں جو لفظ سول کوڈ استعمال ہوا ہے اس سے صرف پرسنل لاہی یا پرسنل لا بھی مراد ہے) اس دفعہ کی بنیاد پر ان کا استدلال یہ ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ایک دستوری تقاضہ ہے جس کی بہرحال تکمیل ہونی ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کا (جن کی نمایندگی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کرتا ہے) یہ مطالبہ کرتا ہے کہ یا تو دستور میں ترمیم کے ذریعہ دفعہ ۴۴ کو سرے سے حذف ہی کر دیا جائے یا پھر اس کے دائرۂ عمل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ رکھا جائے۔ حکومت نے فی الحال یہ موقف اختیار کر رکھا ہے کہ جب تک کوئی مذہبی طبقہ خود خواہش کا اظہار نہ کرے، وہ کسی مذہبی عائلی قانون میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔ اس درمیان میں اختیاری سول کوڈ کی بات بھی چلی اور یہ کہا گیا کہ حکومت پرسنل لاز کا ایک مجموعہ مرتب اور مدوّن کرے اور پھر افراد کو آزادی رہے کہ وہ چاہیں تو اسے اختیار کریں۔ یہ خبر بھی آئی ہے کہ ایسا عائلی قانون مدون کرنے کے لئے کابینہ کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے۔ لیکن اب بظاہر یہ محاذ بھی ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

دستور کی مختلف دفعات جو اس مسئلہ سے متعلق ہیں ان کا جہاں تک میرا مطالعہ ہے اور مختلف ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ نے جو فیصلے دیئے ہیں ان کی روشنی میں میری رائے یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے اس فیصلے پر قائم رہیں کہ چونکہ ان کا عائلی قانون ان کے مذہب کا ایک جزو لاینفک ہے جس کی بنیاد دائمی وآلوہی قانون ہے تو دستور کی دفعہ ۴۴ کے باوجود ان کا عائلی قانون محفوظ رہے گا اور قانون سازی کے ذریعہ ان کی خواہش کے علی الرغم اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ میں اپنی اس رائے کے وجوہ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ دفعہ ۴۴ دستور کے باب چہارم میں آئی ہے باب چہارم ریاست کے رہنما اصولوں سے متعلق ہے اور باب چہارم کے آغاز میں ہی دفعہ ۳۷ میں صراحتاً کہہ دیا گیا ہے کہ اس باب میں مندرج رہنما اصول قابل نفاذ بذریعہ عدالت (ENFORCEABLE BY ANY COURT) نہیں ہیں۔ یعنی اگر ریاست ان رہنما اصولوں میں سے کسی ایک یا چند پر عمل پیرا نہ ہو، تو کسی عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ ریاست کو اس پر عمل آوری کے لئے پابند نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اس دفعہ ۴۴ میں یونیفارم سول کوڈ کے بارے میں ریاست کو مطلق الفاظ میں حکم نہیں دیا گیا ہے (جیسا کہ بعض دوسرے امور میں جن کا ذکر دستور کی دفعات ۳۹ ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۶، ۴۷، ۴۹ اور ۵۰ میں کیا گیا ہے، ان دفعات میں "کوشش کرنے" کا نہیں بلکہ ریاست کو مطلق انداز میں ان امور پر عمل آوری کا پابند کیا گیا ہے) کہ وہ تمام شہریوں کو ایک سول کوڈ کے تحت لے ہی آئے بلکہ اس میں ریاست کو اس بارے میں کوشش کرنے (SHALLENDBAVOUR) کی ہدایت کی گئی ہے جس کے واضح معنی یہ ہیں کہ ریاست افہام و تفہیم کے ذریعہ اس بات کی کوشش کرے کہ ہندوستانی شہری یونیفارم سول کوڈ قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور کسی طبقہ پر اس کی مرضی کے خلاف اس کو مسلط نہ کیا جائے۔ سکم ہائی کورٹ کے سابق جج مسٹر مہیتا چارجی نے اپنی حال میں شائع شدہ کتاب MUSLIDI LAW AND THE CONSTITUTION میں اس بارے میں مسلمانوں کے طرز عمل کے تعلق سے لکھا ہے کہ "ہندو تو اس بات کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں کہ ریاست ان کے عائلی قانون میں تبدیلی کرے لیکن مسلمان اس بات کے لئے تو آمادہ ہوئے ہیں اور نہ ہی اس بارے میں آمادگی کا رجحان اب تک ان کی طرف سے ظاہر ہوا ہے" (صفحہ ۱۵۱) اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، دستور کی دفعہ ۴۴ جن الفاظ میں مدون ہوئی ہے وہ اس بات کے متحمل نہیں، یہ کہ کسی طبقہ کی خواہش اور رضامندی کے خلاف اس طبقہ پر کوئی یونیفارم سول کوڈ کو مسلط کیا جائے۔

پھر خود اس دفعہ ۴۴ کے اہم ترین لفظ یونیفارم (سول کوڈ) کو لیجئے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ واضعان دستور نے لفظ UNIFORM استعمال کیا ہے نہ کہ COMMON یعنی دستور بنانے والوں نے ریاست کو ہندوستان کے شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ فراہم کرنے کی "کوشش" کرنے کی ہدایت کی ہے نہ کہ ایک "مشترکہ" سول کوڈ کی۔ لفظ UNIFORM اور COMMON کے معنوں میں نمایاں فرق ہے۔ انگریزی زبان کی کوئی بھی ڈکشنری دیکھ لیجئے اس میں یونیفارم (یکساں) کے معنیٰ یہ ملیں گے کہ وہ امر جو مقام کی تبدیلی کے ساتھ خود تبدیل نہ ہوتا ہو اور ہر جگہ اپنی صنف اور صفت میں یکساں رہے NOT VARYIN G IN (FORM OR QUALITY WITHOUT LOCAL VARIATION) اس کے برعکس لفظ COMMON (مشترک) کے معنی ہیں اور وہ امر جو کسی سماج کے تمام ارکان سے متعلق ہو اور جس کا اثر سماج کے تمام ہی افراد و ارکان پر یکساں پڑتا ہو (BELONGING TO, USED BY AND AFFECTING ALL MEMBERS OF A GROUP OR SOCIETY) جب ان دونوں الفاظ کے معنی اس درجہ مختلف ہیں تو یہ سمجھنا کہ ہمارے فاضل واضعین دستور کو اس اختلاف معنی کا شعور نہیں تھا اور انھوں نے لفظ یونیفارم اور کامن کو ایک دوسرے کا مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہوئے لفظ کامن کے بجائے لفظ یونیفارم استعمال کیا۔ یا یہ بحث

کرنا کہ ان کا مقصد تو کامن سے تھا لیکن سہواً یا روا روی میں یونیفارم کا لفظ استعمال کر گئے ان محترم حضرات اوران کی فہم و دانش کی توہین ہوگی۔ یہ محض ایک جذباتی بات نہیں ہے بلکہ خود ہمارے ملک کی عدالت عالیہ یعنی سپریم کورٹ نے کیشونند بھارتی کے مشہور مقدمہ میں فیصلہ دیتے ہوئے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ "ہمارا دستور بڑی احتیاط کے ساتھ مدون کیا گیا ہے اس میں ایک لفظ کا انتخاب بڑے غور و توجہ کے ساتھ ہوا ہے اس لئے (اس کی دفعات میں استعمال شدہ) ہر لفظ کو اس کے صحیح معنی ہی دیئے جانے چاہئیں"۔ اور اس اصول کا اظہار کرتے ہوئے چیف جسٹس سیکری صاحب نے اپنے اس فیصلہ میں امریکہ کے سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کا حوالہ دیا ہے جس میں بھی امریکہ کے دستور کی تعبیر کے تعلق سے یہی بات کہی گئی ہے کہ "امریکی دستور کی تعبیر و تشریح کرتے وقت ہر ہر لفظ کے صحیح معنی اور اس کے اندر جو زور ہے اس کا لحاظ رکھنا ہوگا اس لئے کہ دستور میں کوئی ایک لفظ بھی نہ تو غیر ضروری طور پر استعمال ہوا ہے اور نہ ہی اس میں کسی ایک لفظ کا بھی غیر ضروری طور پر اضافہ کیا گیا ہے"۔ (ملاحظہ ہو اے۔ آئی۔ آر، سپریم کورٹ ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۴۶۱ پر صفحہ ۱۵۱۰) یہی اصول ہمارے دستور کی تعبیر و تشریح پر بھی لاگو ہوگا۔

اس طرح گویا لفظ یونیفارم سول کوڈ سے مراد عائلی قوانین (مذہب پر مبنی شخصی قوانین) کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو اس مذہب کے ماننے والے تمام افراد کے لئے یکساں ہو نہ کہ ریاست کی طرف سے تیار کیا ہوا شخصی قوانین کا ایک مجموعہ جو تمام مذہبی طبقات کے لئے مشترکہ ہو اور تمام افراد مشترکاً اس کے پابند ہوں۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کی معنویت اور معقولیت کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذہبی طبقات کے لئے ان کا عائلی قانون پورے ملک میں یکساں نہیں ہے بلکہ مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں کا عائلی قانون ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں مختلف ہے اور بعض ریاستوں میں تو صورتحال یہ ہے کہ ایک ہی ریاست کے مختلف حصوں میں ایک ہی طبقہ کے لئے یہ عائلی قانون مختلف ہے۔ پروفیسر طاہر محمود صاحب نے اپنی تازہ ترین فاضلانہ تصنیف PERSONAL LAW SINCAISIS میں ایسے قوانین کی ایک جامع فہرست دی ہے۔ اس طرح دفعہ ۴۴ کا مقصد جو اس میں استعمال شدہ الفاظ سے واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ ریاست کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس تضاد کو رفع کرنے کی کوشش کرے تاکہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ان کا اپنا ایک ہی عائلی قانون ہو نہ کہ یہ کہ اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں رہنے والے ہندوؤں کے ایک قانون اور مدراس و کیرالہ کے ہندوؤں کے لئے کوئی دوسرا قانون (واضح رہے کہ یہاں میں اس تحریر میں ہندوؤں کے رواجی قانون کو بھی شامل کر رہا ہوں جس کی مختلف شکلوں کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے) یا ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لئے تو عائلی قانون

ایک ہو لیکن کشمیر کے مسلمانوں کے لئے ـــــــــــ اس سے مختلف وغیرہ۔ جیسی کہ صورت حال اس وقت ہے یہ محض لفظی کھیل نہیں ہے بلکہ اس کی واقفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور زمانہ شاہ بانو مقدمہ کے فیصلے میں، اس حقیقت کے باوجود کہ دستور میں یونیفارم سول کوڈ کا لفظ استعمال ہوا ہے سپریم کورٹ کے ججوں نے متعدد جگہ کامن سول کوڈ استعمال کیا ہے۔ سپریم کورٹ کے سابق جج وی آر۔ کرشنا ایر صاحب نے بھی مسلم مطلقہ کے قانون بابت ۱۹۸۲ء پر جو تازہ ترین کتاب تصنیف فرمائی ہے اس میں بھی انھوں نے یونیفارم سول کوڈ کی پرزور حمایت کی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کا لفظ تو انھوں نے بس دو چار، جگہ ہی استعمال کیا ہے جب کہ کامن سول کوڈ کو انھوں نے کم و بیش سیاس جگہ استعمال کیا ہے حتیٰ کہ ایک باب کا عنوان بھی انھوں نے کامن سول کوڈ ہی رکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان جج صاحبان کو بھی اس اہم فرق کا خوب احساس ہے جو یونیفارم (یکساں) اور کامن (مشترک) کے درمیان ہے اور یہ حضرات یونیفارم سول کوڈ کی آڑ میں کامن سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ نہیں یہ دیانت کی کون سی قسم ہے۔

میرے اطمینان کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جیسا میں

میرے اطمینان کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا یہ دفعہ ۴۴ دستور کے باب چہارم میں آئی ہے اور اس باب کے آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس باب میں مندرج امور قابل نفاذ بذریعہ عدالت نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس عقیدہ اور عمل کی یعنی مذہبی جو ہندوستانی کے تمام شہریوں کو مساوی طور پر حاصل ہے وہ دستور کے باب سوم میں درج ہے جس کا عنوان ہے "بنیادی حقوق" (FUNDAMENTAL RIGHTS) یہ بنیادی حقوق سارے کے سارے قابل نفاذ ذریعہ عدالت ہیں اور اس لحاظ سے انھیں باب چہارم میں مندرج رہنما اصولوں پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ اس بارے میں ہمارے سپریم کورٹ کے بھی متعدد فیصلے موجود ہیں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے دو مرتبہ اس بات کی کوشش کی جا چکی ہے کہ رہنما اصولوں پر بنیادی حقوق کو جو فوقیت دستور نے دی ہے اس کو کم از کم دفعہ ۴۴ کی حد تک ختم کر دیا جائے لیکن ان دونوں کوششوں کو سپریم کورٹ نے ناکام بنا دیا اس مقصد کے حصول کے لئے پہلی کوشش حکومت نے ۱۹۷۱ء میں دستور میں ۲۴ ویں ترمیم کے ذریعہ کی تھی لیکن سپریم کورٹ نے کیشونند بھارتی کے مقدمے میں (جس کا حوالہ میں اوپر دے چکا ہوں) اپنے فیصلہ کے ذریعہ اس کوشش کو ناکام کر دیا۔ اس سے زچ ہو کر حکومت نے دوسری کوشش ۱۹۷۶ء میں (ایمرجنسی کے دوران) دستور میں بیالیسویں ترمیم کے ذریعہ کی۔

اس ترمیم کے اغراض و مقاصد کے ذیل میں ترمیم کے مسودۂ قانون میں صاف طور پر کہا گیا تھا کہ "اس کا مقصد رہنما اصولوں کو مزید جامع بنانا اور انھیں ان بنیادی حقوق پر فوقیت عطا کرنا ہے جن کے بل پر رہنما اصولوں کے ذریعہ کی جا سکنے والی سماجی اور معاشی اصلاحات کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے" (ملاحظہ ہو سورن سنگھ کمیٹی رپورٹ) لیکن بنیادی حقوق پر ضرب لگانے کی اس کوشش کو بھی ہمارے سپریم کورٹ نے منروا ملس (MINERVA MILLS) کے مقدمہ میں اپنے فیصلہ سے غیر موثر کر دیا (ملاحظہ ہو اے. آئی. آر. سپریم کورٹ ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۷۸۹) مزید برآں سپریم کورٹ ہی نے بمقدمہ کرشنا سنگھ بنام متھرا ہیر کے اپنے تازہ ترین فیصلہ میں یہ قرار دیا ہے کہ " دستور کا باب سویم (متعلق بنیادی حقوق) پرسنل لا پر اثر انداز نہیں ہوتا" (ملاحظہ ہو اے. آئی. آر. سپریم کورٹ ۱۹۸۰ء صفحہ ۷) چنانچہ اب دستور اور قانونی پوزیشن یہ ہے کہ حکومت کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم بنیادی حقوق کو رہنما اصولوں پر فوقیت حاصل ہے اور چونکہ دستور کی دفعات ۲۵، ۲۶ میں مذہبی آزادی یعنی عقیدہ اور مذہبی عقاید کے مطابق عمل کرنے کی آزادی کو تمام ہندوستانیوں کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے، اسی لئے بصورت موجودہ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کو جسے دستور ملک میں مذہبی آزادی کے عنوان کے تحت بنیادی حق کا مضبوط تحفظ حاصل ہے۔ دفعہ ۴۴ رہنما اصول کے سہارے ختم کیا جا سکے۔ یا پارلیمنٹ اس میں اپنی مرضی سے مسلمانوں کی خواہشات کے علی الرغم کتر بیونت کر سکے۔

اس معاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ خاصا اہم ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہمارا دستور وفاقی نوعیت کا ہے۔ چنانچہ اس کی پہلی دفعہ ہی میں یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان مختلف ریاستوں کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ گویا مختلف ریاستوں کے باہمی وفاق سے آزاد ملک ہندوستان کی تشکیل ہوئی ہے۔ اسی طرح یہ ایک واقعاتی حقیقت ہے کہ ہندوستانی قوم بھی مختلف مذہبی (اور لسانی) گروہوں کے وفاق کا نام ہے اور یہ مختلف مذہبی طبقات اپنے وفاق سے ہندوستانی قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ مختلف طبقے جب وفاق میں شامل ہوئے تو وہ اپنے اپنے جداگانہ عائلی قانون کے ساتھ اور اس ذہنی تحفظ کے ساتھ شامل ہوئے کہ ان کا پرسنل لا علی حالہ محفوظ اور ریاست کے دائرۂ اقتدار سے بالاتر رہے گا۔ چنانچہ دستور کی دفعہ ۱۳ اسی صورت حال کا اثبات کرتی ہے۔ جس میں صراحتاً یہ کہدیا گیا ہے کہ نفاذ دستور کی تاریخ سے ایسے تمام رائج الوقت قوانین جو دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق سے متصادم ہوں خود بخود کالعدم متصور ہوں گے اور اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اسی دفعہ ۱۳ کی شق (۲) میں ریاست کو مطلق انداز میں اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسا کوئی قانون نہیں بنائے گی جس سے بنیادی

حقوق کسی بھی درجہ میں اور کسی بھی طرح متاثر ہوتے ہوں۔

یہ ایک معروف دستوری حقیقت ہے کہ ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا سب سے بڑا مظہر اس کا قانون سازی کا اختیار ہے۔ لیکن ہمارے دستور نے ریاست کے اس اختیار پر بنیادی حقوق کی حد تک مضبوط ترین قدغن لگا کر اس بات کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے کہ ریاست اپنے قانون سازی کے قاہرانہ اختیار کا اس طرح استعمال کرے جو ہندوستان کے شہریوں کے عقیدہ اور عمل کی آزادی اور اپنے اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کے بنیادی حق کو کسی بھی درجہ میں متاثر کرتا ہو۔ اس سے استثنار کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مذہبی گروہ اپنی مرضی سے اپنے پرسنل لا سے دستبردار ہو کر ریاست کو اس زمرے میں قانون سازی کا مجاز کرے۔ جیسا کہ ہمارے ہندو بھائیوں نے ہندو کوڈ بل کو قبول کر لیا۔ اور پارلیمنٹ نے ان کے لئے نئے سرے سے نکاح، طلاق، وراثت اور ولایت کے قانون مدون کئے۔ جو ہندوؤں کے دھرم شاستر پر مبنی پرانے قوانین سے یکسر مختلف ہیں۔

مندرجہ بالا اسباب و شواہد کی بنا پر میری مستحکم رائے ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کو (اور فی الحقیقت تمام اقلیتوں کے پرسنل لا کو) ایسا مضبوط دستوری تحفظ حاصل ہے کہ ان کی خواہش اور مرضی کے علی الرغم قانون سازی کے ذریعہ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے اور اس دستوری اور قانونی صورت حال کے ادراک ہی کا نتیجہ ہے کہ اب لازمی یونیفارم سول کوڈ کی جگہ اختیاری یونیفارم سول کوڈ کی بات کی جانے لگی ہے۔ البتہ یہ اختیاری یونیفارم سول کوڈ بھی دستور ہند میں تسلیم کئے گئے بنیادی حقوق سے متصادم ہوگا یا نہیں۔ یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے۔

شہادت

شہادت دو طرح کی ہوتی ہیں ایک قولی شہادت، دوسرے عملی شہادت، قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دنیا پر اس حق کو واضح کریں جو انبیاء کے ذریعہ ہمیں پہنچا ہے اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور اپنے سارے وسائل و ذرائع اس پر لگا دیں۔ رہی عملی شہادت تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں جن کو ہم حق سمجھتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کرلے۔ (مولانا مودودیؒ)

اسلام کی دعوت مسلمانوں کا فریضہ

مولانا محمد سلیمان قاسمی

مسلمان دنیا کی خوش قسمت ترین ملت ہیں کہ اسلام جیسے دین حق پر نہ صرف ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس پر جان چھڑکتے ہیں. لیکن خود مسلمانوں کی اور پوری دنیا کی بھی بدقسمتی یہ ہے کہ اسلام کو بحیثیت ایک نظام حق کے وہ دنیا میں نافذ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جبکہ دنیا اور آخرت کے تمام مسائل کا حل اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے ۔ اسلام کی دعوت دینا مسلمانوں کا فریضہ ہے یہ فریضہ مسلمان حکومتیں اور مسلمان معاشرے اور مسلمان تنظیمیں اگر انجام دینے لگیں تو نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ تمام دنیا کے مسائل حل ہونے کی راہ پیدا ہو جائے ــــ مسلمانوں کا نصب العین اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ جس دین پر ایمان لائے ہیں اس کی پیروی زندگی کے ہر گوشے اور میدان میں کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو اس کی دعوت دیں ارشاد ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ	دعوت دو اپنے رب کے راستہ کی طرف
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ	حکمت و دانائی اور اچھی نصیحت کے ذریعہ
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط	اور ان سے بحث و مباحثہ کرو اس طرح
(النحل : ۱۲۵)	جو سب سے بہتر ہو۔

اس آیت پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں ، دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہئے ایک حکمت دوسرے عمدہ نصیحت. حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت ، استعداد ، اور حالات کو سمجھ کر ، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے. جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا اعلاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں، عمدہ نصیحت کے دو مطلب

ہیں ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے، برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں ان کے لئے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے، ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو، مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لئے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ پر لکھتے ہیں۔ یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو، اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو، معقول اور دل لگتے دلائل ہوں مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۸۱، ۵۸۲)

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں۔ حکمت سے مراد یہاں دلائل و براہین ہیں اور موعظہ حسنہ سے مشفقانہ انداز بیان، تذکیر و تنبیہ۔ دعوت دین میں یہ دو چیزیں اصول کار کی حیثیت رکھتی ہیں آدمی جو بات بھی کہے دلیل و برہان کی روشنی میں کہے اور انداز خلوص جتانے کا ہو، بلکہ اس کے پیچھے جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی کا غماز ہو تاکہ مخاطب بدکنے کے بجائے اس کی باتوں کے سننے اور ان پر غور کرنے کی طرف مائل ہو اگرچہ ہٹ دھرم لوگ اس سے بھی نہیں پسیجتے لیکن خیر و برکت کا طریقہ یہی ہے (تدبر قرآن ج ۳ ص ۷۰۸، ۷۰۹)

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مذکورہ آیت کا توضیحی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے: آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین) کی طرف (لوگوں کو) علم کی باتوں (کے ذریعہ سے جن سے مقصود اثبات مدعا ہوتا ہے) اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے (جن سے مقصود ترغیب و ترہیب و ترقیق قلب ہوتا ہے) بلائیے! اور (اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقہ (کہ جس میں شدت و خشونت نہ ہو) بحث کیجئے!"

(مکمل بیان القرآن ج ۶ ص ۶۹)

علامہ صابونی لکھتے ہیں:

اے محمدؐ لوگوں کو اللہ کے دین اور اس کی مقدس شریعت کی طرف دعوت دو حکیمانہ طرز میں،

لطف ومہربانی اور نرمی کے انداز سے جو ان کے اندر اثر انداز ہو اور کامیاب ثابت ہو ڈانٹ پھٹکار اور شدت وسختی کے انداز سے نہیں۔ وَجَادِلْهُم ... یعنی مخالفوں سے بحث اور گفتگو اس بہتر انداز میں کرو، جو مناظرہ بازی اور جھگڑے کے انداز سے بہتر ہو، دلائل کے ساتھ رفق و ملائمت کے ذریعہ (صفوۃ التفاسیر ص۲)

" بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف" اسلام کی طرف "حکمت کے ساتھ" درست اور مضبوط گفتگو کے ذریعہ اور وہ حق کو واضح کرنے والی اور شبہ کو رفع کرنے والی دلیل ہے۔ "اچھی نصیحت کے ذریعہ" اور وہ یہ ہے کہ ان پر یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہے کہ آپ اس دعوت میں ان کے خیر خواہ ہیں اور اس تبلیغ میں ان کا فائدہ ہی آپ کے پیش نظر ہے یا قرآن کے ذریعہ یعنی اللہ کی کتاب کے ذریعہ ان کو دعوت دیجئے جو حکمت اور موعظہ حسنہ ہے اور حکمت یہ ہے کہ آدمی کو یہ معلوم ہو کہ کونسا کام کب کیا جائے اور کون سی بات کب اور کس طرح کہی جائے اور موعظہ حسنہ یہ ہے کہ ترغیب وترہیب اور انذار وبشارت ہر ایک سے کام لیا جائے۔ "اور ان سے بہترین طرز میں بحث کرو" اس طرح کہ جو بحث ومباحثہ کا احسن طریقہ ہو یعنی نرمی نرمی، ملائمت، کے ساتھ درشتی سے بچتے ہوئے یا اس انداز سے جو دلوں کو بیدار کر دے، جس سے نفسوں کو نصیحت ہو جس سے عقلوں کو روشنی حاصل ہو، اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید بھی ہوتی ہے جو دین کے معاملہ میں بحث ومباحثہ کا بالکل ہی انکار کرتے ہیں (تفسیر مدارک التنزیل ص۲)

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ مخلوق خدا کو اللہ کی طرف حکمت کے ساتھ بلائیں۔ ابن جریرؒ نے کہا سبیل رب سے مراد وہ سب کچھ ہے جو اللہ نے نازل فرمایا ہے یعنی اللہ کی کتاب، اور رسول اللہ کی سنت" اور اچھی نصیحت" یعنی قرآن میں جو تنبیہات اور لوگوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور حادثات ہیں ان سے لوگوں کو یاد دہانی کرائیے تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں اور اللہ تعالیٰ کا قول: "اور ان سے بہتر طریقہ پر مباحثہ کرو" یعنی ان میں سے جو مناظرہ اور جدال کے محتاج ہوں ان سے بہتر انداز میں، نرمی، ملایمت اور اچھے خطاب کے ذریعہ، بحث ومباحثہ کرو جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اور اہل کتاب سے مباحثہ بہتر انداز میں کرو الّا یہ کہ ان میں سے جو ظلم وستم کے مرتکب ہوں، ان سے مباحثہ کرو ہی نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: نرمی اختیار کرنے کا،

جیسا کہ اس کا حکم دیا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو، جبکہ ان دونوں کو فرعون کی طرف بھیجا۔ اپنے اس فرمان میں: "تو تم دونوں اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۵۲)

عرض کر (۱) سبیل رب، دین اسلام، شریعت اسلامی اور کتاب وسنت کی تعلیمات کی طرف دعوت دینا اور اس کی تبلیغ کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فریضہ تھا اور دنیا کے مسلمانوں کا بھی فریضہ ہے۔ (۲) اس فریضہ کی ادائیگی میں حکمت ودانائی سے کام لینا بھی ضروری ہے (۳) صرف ذہن کی گتھیاں سلجھانا اور عقلی استدلال سے کام لینا ہی کافی نہیں ہے۔ دلوں کو موہ لینے کی فکر بھی ضروری ہے جذبات سے اپیل کرنا بھی لازم ہے۔ محبت اور خوف کی جبلتوں کو جھنجوڑنا اور اسلام کے حق میں ان کو استعمال کرنا بھی لابدی ہے (۴) بحث ومباحثہ کا بھی ایک مقام ہے اور اس میں بھی لطف ومہربانی کا انداز اختیار کرنا چاہئے۔

دین کی دعوت وتبلیغ کے لئے قرآن مجید میں مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں ان میں سے ایک مذکورہ بالا تعبیر "سبیل رب" کی طرف دعوت ہے اور دوسری تعبیر امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ یعنی "بھلائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا"، چنانچہ فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران ۱۰۴)	اور تم کو ایک جماعت ہونا چاہئے (یا تم میں سے ایک جماعت ہونا چاہئے) جو بھلائی کی طرف دعوت دے اور یہی لوگ بھلائیوں کا حکم دیتے رہیں اور برائیوں سے روکتے رہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

دین کو پہلی آیت میں "سبیل رب" (راہ رب) اور اس آیت میں "الخیر" (خاص بھلائی یا بھلائیوں کا مجموعہ) کہا گیا ہے جس کی دعوت دینا اور جس کی تبلیغ کرنا مسلمان امت کا نصب العین ہے۔ اسی فریضہ کو بھلائیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے باز رکھنے کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے!

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے۔ تم بھلائیوں کا حکم دیتے ہو برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

پہلی آیت کے انداز بیان سے شبہ ہوسکتا تھا کہ پوری امت مسلمہ کا شاید یہ نصب العین نہیں ہے بلکہ اس میں ایک گروہ پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ حالانکہ اس خیال کی تردید اسی آیت کے آخری فقرہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہ سے ہو جاتی ہے کہ فلاح کا وعدہ تو پوری امت ہی سے ہے اس لئے فریضہ دعوت و تبلیغ بھی پوری امت ہی پر عائد ہونا چاہئے لیکن بعد کی آیت نے دو، دو چار کے انداز میں واضح کر دیا کہ یہ فریضہ پوری اُمت کا نصب العین ہے۔ اسی آیت پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نوٹ ہے۔

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نا اہلی کے باعث معزول کئے جا چکے ہیں۔ اس پر اب تم مامور کئے گئے ہو اس لئے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہوگئی ہیں جو امامت عادلہ کے لئے ضروری ہیں یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ و رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا اور تمہیں لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور ان غلطیوں سے بچو، جو تمہارے پیش رو کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن جلد ۱ ص ۲۷۹)

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اس سلسلے کی پہلی آیت پر لکھتے ہیں یہ" امت کو اس اہتمام و انتظام کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اعتصام بحبل اللہ پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے اس مقصد کے لئے یہ ہدایت ہوئی کہ مسلمان اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے، معروف و منکر سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں اور ان کے لئے امر و نہی کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں انجام دینا ہے بلکہ اختیار اور قوت سے اس کو نافذ کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ امت کی طرف سے سیاسی اقتدار و اختیار کا حامل ہو، اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدنظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لئے يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ کے الفاظ کافی تھے۔ یامرون بالمعروف (الآیہ) کی ضرورت نہیں تھی، ہمارے نزدیک اس آیت سے اس امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے" (تدبر قرآن ص ۷۵۶، ۷۵۷)

مولانا موصوف اس کے بعد والی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔ خیر امت میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اب دین کی صحیح شاہراہ پر تم ہی ہو اللہ نے جو دین نازل فرمایا تھا اہل کتاب نے اس میں کچ پیچ کی راہیں نکال کر اصل دین کو گم کر دیا اب خلق کی رہنمائی کے لئے خدا نے تم کو کھڑا کیا ہے۔

(تدبر قرآن جلد ۱ ص ۷۶۳)

علامہ صابونی لکھتے ہیں :-

وَلْتَكُنْ مِنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ اى وَلْتَقُمْ مِنكُمْ طَائِفَةٌ للدعوة الى الله وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ اى لِلْأَمْرِ بِكُلِّ مَعْرُوفٍ وَالنَّهْيِ عن كل مُنكَرٍ

(صفوة التفاسیر ص۲۲۰)

وَلْتَكُن مِّنكُمْ .... یعنی تم میں سے ایک گروہ کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے :-
وَيَأْمُرُونَ ...... یعنی ہر بھلائی کا حکم دینے کے لئے اور ہر برائی سے روکنے کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔

امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور تم میں سے ایک امت اللہ کے حکم کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہونے والی اور جمنے والی ہو، الخیر کی طرف دعوت دینے کے سلسلہ میں اور معروف کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے بارے میں۔ واُولئِكَ هم المفلحون " اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ضحاک نے کہا ان لوگوں سے خاص صحابہ اور خاص راوی مراد ہیں یعنی مجاہدین اور علماء، اور ابوجعفر الباقرؒ نے کہا رسول اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ پڑھی پھر ارشاد فرمایا الخیر سے قرآن اور میری سنت کی اتباع مراد ہے (ابن مردویہ) اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اس امت کا ایک گروہ اس فریضہ کو انجام دے۔ اگرچہ یہ واجب ہے امت کے ہر فرد پر حسب استطاعت جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، تم میں سے جو شخص بھی کسی منکر کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کردے اور اگر استطاعت نہ ہو تو زبان سے اور اگر استطاعت نہ ہو تو دل سے اور یہ کمزورترین ایمان ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے علاوہ رائی کے دانہ برابر بھی ایمان نہیں ہے۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص۲۷۶)

امام نسفیؒ لکھتے ہیں۔ (ولتکن ... بالمعروف) معروف یعنی جس کو شریعت اور عقل نے مستحسن ٹھہرایا ہو (وینھون عن المنکر) منکر یعنی جس کو شریعت اور عقل نے قبیح قرار دیا ہو، یا معروف وہ ہے جو کتاب وسنت کے مطابق ہو اور منکر وہ ہے جو کتاب وسنت کے خلاف ہو، یا معروف سے اطاعت خدا اور رسول اور منکر سے معصیت مراد ہے اور خیر کی طرف بلانا عام ہے کرنے کے کام اور چھوڑنے کے کام ہر ایک کے لئے عام ہے، اور جس کا اس پر عطف ہے وہ خاص ہے اور من تبعیض کے لئے ہے اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے اور اس لئے بھی (فرض عین نہیں ہے) کہ اس کی صلاحیت اسی کو ہو سکتی ہے جس کو معروف ومنکر کا علم ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ اس ذمہ داری کو کس

ترتیب سے انجام دے کیونکہ وہ ابتدا کرے گا آسانی سے اگر یہ آغاز مناسب نہ ہوگا تو مشکل اور سخت کی طرف ترقی کرے گا، (یعنی اوپچے مضامین اچھے انداز میں پیش کرے گا) اللہ تعالیٰ نے پہلے صلح کرنے کا حکم دیا پھر قتال کا حکم دیا۔ امن تیمن کے لئے ہوگا یعنی تم ایک ایسی امت بن جاؤ جو بھلائیوں کا حکم دے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے کنتم خیر امۃٍ (الآیہ) (تفسیر مدارک صہ ۱۳۳)

معلوم ہوا کہ (۱) الخیر یعنی دین کی دعوت دینا (۲) بھلائیوں کا حکم دینا اور (۳) برائیوں سے روکنا دنیا کے مسلمانوں کا ملی فریضہ اور نصب العین ہے، اسلام کی دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں تیسری تعبیر شہادت حق کی تعبیر ہے۔ اسلام کی گواہی اپنے قول وعمل اور اپنے انفرادی و اجتماعی کردار کے ذریعہ دینا مسلمان قوم کا فریضہ ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر گواہ
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (آیت ۱۴۳ البقرہ)	ہو جائے۔

امت مسلمہ کو اس آیت میں امت وسط ایک معتدل امت کہا گیا ہے اور دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کرنے کے بعد اسے اس کی ذمہ داری اور اس کے نصب العین سے آگاہ کیا گیا ہے۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"یہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے" اسی طرح" کا اشارہ دونوں طرف ہے اللہ کی اسی رہنمائی کی طرف بھی جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اس مرتبے پر پہونچ کر امت وسط قرار دیئے گئے اور تحویل قبلہ کی طرف بھی کہ نادان لوگ اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے تھے حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف، سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور امت محمدیہ کو اس پر فائز کیا ـــــ امتِ وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیانی صدر کی حیثیت رکھتا ہو جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو ـــــ پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں امت وسط اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوع انسانی کا اکھٹا حساب لیا جائے گا۔ اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے

کم وکاست پوری کی پوری پہونچادی اور عملاً اس کے مطابق کام کرکے دکھایا اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہونچایا تھا وہ ہم نے انھیں پہونچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمھیں دکھایا تھا وہ ہم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی ـــــ اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لئے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لئے زندہ شہادت بننا چاہئے حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے راست روی یہ ہے عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے. پھر اس کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہونچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی کہ اگر وہ اس ذمہ داری میں ذراسی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے. اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہونچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت جو تیرے رسول کے ذریعے ہمیں پہونچی تھی تیرے بندوں تک پہونچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے تو ہم بہت بری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں ان سب کے لئے ائمہ شر اور شیاطین انس وجن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے، ہم سے پوچھا جائے گا، کہ جب دنیا میں معصیت ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تم کہاں مر گئے تھے؟

(تفہیم القرآن ج۱ صفحات ۱۱۹، ۱۲۰)

مولانا امین احسن، اصلاحی مدظلہٗ لکھتے ہیں کذالک کا اشارہ اوپر والے معاملہ کی طرف ہے یعنی جس طرح ہم نے قبلہ کے معاملہ میں یہود ونصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ وخم اور مشرق ومغرب کے چکر سے تمہیں نکال کر صراط مستقیم کی طرف تمہاری رہنمائی کی اسی طرح ہم نے تم کو یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں سے بچا کر دین کی بیچ شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم خلق خدا پر اللہ کے دین کی گواہی دو، وسط، نعط وکد کی طرح مذکر اور مؤنث، واحد اور جمع سب کے لئے آتا ہے اس کے معنیٰ ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو. یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہوگیا، اس لئے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطۂ توسط واعتدال پر ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے. امت مسلمہ کو

امت وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لئے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصلی شاہراہ ہے یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کرکے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انھوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگڈنڈیاں نکال لیں، اس طرح وہ اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے لیکن یہ امّت ان کے بیچ کی راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصل راہ پر قائم ہے اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے (تدبر قرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۱)

اگلے صفحہ پر امت وسط کا وظیفۂ منصبی کا عنوان قائم کرکے لکھتے ہیں ۔۔ "رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو" سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس کا، جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی (تدبر قرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۲-۳۲۱)

علامہ محمد علی صابونی لکھتے ہیں: یعنی جیسا کہ ہم نے تم کو اسلام کی طرف ہدایت دی، اسی طرح، اے مسلمانوں ہم نے تم کو انتہائی عدل وانصاف پر قائم، پسندیدہ امت بنایا۔ لتکونوا ۔۔۔۔ شہیداً یعنی تاکہ تم امتوں پر گواہی دو، قیامت کے دن کہ ان کے رسولوں نے ان کو دین پہونچا دیا تھا اور "الرسول" گواہی دے کہ اس نے تم تک دین پہونچا دیا تھا۔ (صفوۃ التفاسیر صفحہ ۸۰)

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: 'اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تم کو پھیر دیا ابراہیمؑ کے قبلہ کی طرف اور اسے تمہارے لئے پسند کیا تاکہ ہم تم کو تمام امتوں میں بہترین امت بنائیں تاکہ تم قیامت کے دن تمام امتوں پر گواہ بنو، کیونکہ سب تمہارا فضیلت کے معترف ہوں گے اور وسط یہاں پر بہترین اور اعلیٰ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے قریش عرب میں نسب اور وطن کے لحاظ سے "اوسط" ہیں یعنی بہترین ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں وسط تھے یعنی اشرف تھے نسب کے لحاظ سے اور اسی سے الصلوٰۃ الوسطیٰ (نماز عصر) ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو وسط بنایا تو اس کو خاص فرمایا: مکمل قوانین بہترین طریقے اور واضح ترین مذہب کے ساتھ (مختصر تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۱۳۲)

غرض کہ تمام دنیا والوں کے سامنے حق کی شہادت دینا مسلمانوں کا ملی نصب العین ہے۔ یعنی اپنے فکر و عمل قول و قرار، اخلاق و کردار سے، اپنی ذہنی و فکری توانائیاں قلبی و روحانی قوتوں، زبان و قلم کی صلاحیتوں سے اپنی مادی ذرائع، وسائل سے دین حق کی گواہی دینا مسلمانوں کا فریضہ اور ڈیوٹی ہے تاکہ وہ آخرت میں حق کی شہادت دے سکیں۔

اس سلسلہ میں چوتھی تعبیر اقامت دین کی تعبیر ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ۱۳)	اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

اس آیت پر مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: "فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ "مقرر کیا تمہارے لئے"، شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے عربی زبان میں اسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی ([illegible]) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون ([illegible]) کا اور شارع کا لفظ واضع قانون ([illegible]) کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے یہ تشریع خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے ان اصولی حقائق کا جو اوپر آیت ۱۰ اور اس بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے اب چونکہ اصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے اس لئے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لئے قانون اور ضابطہ بنائے اور اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون و ضابطہ دے چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کر دیا ہے۔ پھر فرمایا من الدین "از قسم دین" شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ "از آئین" کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے اس کی نوعیت آئین کی ہے لفظ دین کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورہ زمر حاشیہ (۳) میں کر چکے ہیں وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی کہ دین کے معنی ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں اور جب یہ لفظ طریقہ کے معنی میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مطاع مانے اس بنا پر اللہ کے مقرر کئے ہوئے اس طریقہ کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سفارش ([illegible]) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بندوں کے لئے ان کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی کرنے کے معنی عبادت کے ہیں اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا، وہ دراصل اللہ کی سیادت و حاکمیت اور بندگی کا انکار کرتا ہے"

آگے ایک پیراگراف کے بعد لکھتے ہیں "اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیاء کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ اقیموا الدین" اس فقرہ کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے "قائم کنید دین را" کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب نے "قائم رکھو دین کو" یہ دونوں

ترجمے درست ہیں۔ اقامت کے معنیٰ قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی ہیں اور انبیاء علیہم السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے، ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں یہ اسے قائم کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو، وہاں اسے قائم رکھیں، ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو، ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا، یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔ (تفہیم القرآن جلد ۴ ص ۴۸۷، ۴۸۸)

علامہ محمد علی صابونی لکھتے ہیں:۔ یعنی ہم نے ان کو وصیت کی کہ دین حق اسلام کو قائم کرو۔ (قائم رکھو) وہ دین حو اللہ کی توحید، اس کی اطاعت، اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر زندگی بعد موت اور جزاء وسزا پر ایمان کا نام ہے قرطبی نے کہا مراد یہ ہے کہ دین کو ہمیشہ قائم اور محفوظ رکھو، بغیر اختلاف اور بغیر اضطراب کے ان اصول میں جن میں شریعت بدلتی نہیں ہے اور وہ توحید، نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج وغیرہ ہے تو یہ سب مشروع ہیں۔ دین ایک ہی ہے اور ملت متحدہ ہے۔ (صفوۃ التفاسیر ص ۲؍ ۱۵۷)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی خدمات کا جائزہ

(۲)

محمد مسعود عالم قاسمی

علم کلام: شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے علم کلام یا حکمت شریعت کے میدان میں بھی گرانقدر علمی خدمات انجام دی ہیں۔ اور یہ خدمات اس قدر وقیع ہیں کہ اسلامی فلسفہ کے سرمایہ میں اضافہ قرار دی جاتی ہیں۔ یہی شاہ صاحب کا وہ امتیازی کارنامہ ہے جو ان کو معاصرین اور متاخرین سے ممتاز کرتا ہے اور متقدمین کے صف اوّل کے علما کے برابر لا کھڑا کرتا ہے

شاہ صاحب کے عہد کے ہندوستان میں منطق و فلسفہ کا بڑا زور اور چرچا تھا۔ اس فن کے بغیر کوئی شخص عالم و دانشور نہیں بن سکتا تھا، مگر یہ منطق و فلسفہ عقلی موشگافیوں، لفظی بازی گری اور لاحاصل بحثوں کا ہم معنی ہو چکا تھا اور اسلامی فلسفہ محض ایک قصہ پارینہ بن چکا تھا، منطق و فلسفہ کی یہ گرم بازاری ایران کی مخصوص علمی فضا کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی جو عرصہ دراز تک عقلیت کا مرکز رہی تھی بمولانا مناظر احسن گیلانی کے بقول جو ملک ہندوستان اب تک صرف تصوف و فقہ کی جولان گاہ تھا اب ان علوم سے ہٹ کر آہستہ آہستہ اس کا میلان ایرانیوں کے ان لفظی گورکھ دھندوں کی طرف فلسفہ اور منطق یا عقلیات کے پُرشوکت ناموں سے بڑھنے لگا[1]

شاہ صاحب نے اس ماحول میں اسلامی فلسفہ حیات سے لوگوں کو متعارف کرایا، فلسفیانہ بحثوں کا رخ اسلامی عقائد و عبادات، اخلاق و معاشرت اور سیاست کی حکمت اور اسرار و رموز کے انکشاف کی طرف موڑا، اور دین کی کلیات سے لے کر جزئیات تک کو عقلی انداز پر پیش کرنے یعنی آج کی اصطلاح میں [illegible] کرنے کی کوشش کی۔ مولانا گیلانی کہتے ہیں:

آپ نے بجائے اوہام و خرافات کے قرآن و حدیث کے کلیات سے خود ایک فلسفہ تیار کیا اور

---

[1] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صفحہ ۱

جو لوگ ذہنی تمرین کے لئے لایعنی خیالات میں وقت ضائع کرتے تھے ان کے لئے شاہ صاحب نے غور و فکر کا ایک بڑا میدان پیش کیا[1]

کسی بھی عقیدہ یا نظریہ کی قدر و قیمت دو اعتبار سے پرکھی جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس عقیدہ کی عقلی اور نظری حیثیت کیا ہے اور علمی استدلال سے اسے کس حد تک ثابت کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عملی میدان میں وہ عقیدہ کس حد تک انسان کے لئے نفع بخش ہے، انسان کی زندگی پر کس قسم کے اثرات پڑتے ہیں اور انسان کے اندر وہ عقیدہ کیسی تبدیلی لاتا ہے۔ مسلمانوں کا پورا سرمایہ علم کلام پہلے رخ کی وضاحت کرتا ہے۔ دوسرے رُخ پر بہت کم ہی کوشش کی گئی پھر کلیات کی عقلی حیثیت پر یقیناً بہت کچھ لکھا جا چکا تھا مگر جہاں تک احکام اور ان کے عملی اثرات کا تعلق ہے اس پہلو کو کسی نے موضوع بحث نہیں بنایا۔ شاہ صاحب غالباً پہلے عالم ہیں جنھوں نے اس پہلو پر قلم اٹھایا اور نہایت خوبصورتی اور وضاحت سے موضوع بحث کا احاطہ کیا۔ شاہ صاحب کا یہ کارنامہ متقدمین اور متاخرین دونوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی شاہ صاحب کے اس کارنامہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "شاہ صاحب کے زمانہ میں علم کلام کا جو سرمایہ موجود تھا وہ صرف اشاعرہ کی تصنیفات تھیں۔ شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت بھی اسی طریقہ کے موافق ہوئی تھی۔ لیکن ان کی ایجاد پسند طبیعت پر ان چیزوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اور انھوں نے علم کلام کے مسائل بالکل نئے اصول کے موافق ترتیب دئے۔ اشاعرہ کے جو ممیزات ہیں شاہ صاحب عموماً ان کے مخالف ہیں"[2]

شاہ صاحب اور قدیم متکلمین کے کاموں میں جو فرق محسوس ہوتا ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ قدیم متکلمین کے مباحث اس خاص دور کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ان کو مخصوص عقلی مباحث اور رجحانات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور اسی کے مطابق انھوں نے مباحث اور انداز بحث بھی طے کئے تھے، بعد کے ادوار میں ان میں سے بیشتر مباحث دور از کار ثابت ہوئے کیونکہ ایسا کوئی عقلی چیلنج سامنے نہ رہا۔ جبکہ شاہ صاحب کا کام کسی وقتی چیلنج پر مبنی نہ تھا بلکہ وہ شریعت کے اعتقادی اور عملی مطالبات کو ایسے انداز میں سامنے لاتا ہے کہ وہ عام عقل کو اپیل کر سکے اور یہ بتا سکے کہ اسلام ہی عقلی اور فطری مذہب ہے۔ اس موضوع پر شاہ صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے، اس کے مقدمہ میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا معجزہ عطا ہوا تھا جس کا جواب عرب و عجم سے نہ ہو سکا اسی طرح آپ کو جو شریعت عطا کی گئی وہ بھی معجزہ تھی، کیونکہ ایسی شریعت کا وضع کرنا جو

---

[1] تذکرہ شاہ ولی اللہ ص ۱۶۷ [2] علم الکلام ص ۱۲۳-۲۴

لحاظ سے کامل ہو انسانی طاقت سے باہر ہے اس لئے جس طرح قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں لاگزیر ہے کہ اس معجزہ کے متعلق بھی مستقل تصنیف کی جائے پھر وہ لکھتے ہیں کہ اہل بدعت نے اکثر اسلامی مسائل کے متعلق یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر، حساب، پل صراط میزان وغیرہ کا عقل سے کیا تعلق ہے۔ رمضان کے آخری دن کا روزہ واجب ہو اور شوال کی پہلی تاریخ کا حرام، اس کے کیا معنی؟ ترغیبات و ترہیبات کے متعلق جو کچھ شریعت میں وارد ہے وہ مضحکہ خیز ہے۔ غرض منکرین اس قسم کے بہت سے اعتراضات کرتے ہیں ان کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ شریعت کی تمام باتیں عقل کے موافق ہیں[2]۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ از اول تا آخر شریعت کے مبادی اور احکام کی حکمتوں اور مصالح کے بیان پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں ایجاد و تخلیق، عالم دنیا اور عالم مثال، انسانی فطرت اور احکام، زندگی بعد موت اور اس کی تفصیلات ارتفاقات انسانی، سیاست، معیشت، اقتصاد، معاشرت، سعادت کی نوعیت اور اس کے حصول کا طریقہ، نیکی اور گناہ کی ماہیت، شرک و ایمان کے مضمرات، احکام کے اسرار و رموز، دین و شریعت کی مصلحت اور تفصیلات، رسوم و رواج کی ابتدا اور ماہیت۔ شریعت کی تفہیم، کتاب و سنت سے استعادہ کی شکل فقہی مکاتب کے اختلاف کی نوعیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے اسرار وغیرہ زیر بحث آئے ہیں دوسرے باب میں حج کعبہ کے مناسک اسرار و رموز اور ذیلی احکام کی تفصیلات احسان اور تزکیہ کے مباحث ذکر و فکر، مقامات و احوال، شکر توکل، صبر یقین، حسن ظن، رویا وغیرہ کے اسرار حصول رزق کے طریقے خرید و فروخت کے اسرار و احکام، خلافت، قضا اور جہاد کے مباحث شامل ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۸۶ھ میں شرکت امین دہلی سے شائع ہوئی اس کے بعد متعدد بار دہلی اور مصر سے شائع ہوئی اس کے اردو تراجم بھی متعدد ہیں۔ آج کے دور میں حجۃ کا سمجھنا گویا علم کا اعلیٰ درجہ ہے[3]۔ حجۃ اللہ البالغہ کے علاوہ شاہ صاحب نے علم کلام اور حکمت شریعت پر مزید دو اصولی انداز کی کتابیں لکھی ہیں۔ مگر ان میں احکام سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور دیگر امور الہیات اور انسان کی جبلی اور اجتماعی زندگی سے بحث کی گئی ہے ایک تو البدور البازغة ہے یہ کتاب عربی میں لکھی گئی ہے۔ اور حجۃ اللہ کے بعد دوسرے نمبر پر رکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں حجۃ اللہ البالغہ کے مقابلہ

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ [2] ایضاً [3] فقہ السنۃ کے مصنف سید سابق لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اسلامی شریعت کے اسرار و رموز کے علم میں اپنے موضوع پر ایک نادر اور اچھوتی کتاب ہے اس کا اسلوب درخشندہ ہے سلامت منطق، قوۃ عبارت، ... خالص عربیۃ اور محکم دلیل کا مرقع ہے، یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا مولف علوم عقلیہ اور علوم اسلامی کے اساطین میں سے ایک ہے۔ الانصاف صفحہ ۱۲ ترجمۃ المولف۔

میں متنوع مضامین فلسفیانہ رنگ میں بیان کئے گئے ہیں ۱۳۵۱ھ میں مجلس علمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتاب الخیر الکثیر ہے اس کتاب کے مباحث مذکورہ دو کتابوں سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اس میں، توحید رسالت، قرآن، احوال و مراتب، شریعت، شریعت کی نشو و نما اور ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ اور انداز بحث فلسفیانہ ہے۔ یہ کتاب بھی مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۵۲ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ ان کے علاوہ شاہ صاحب نے اسلام کے بنیادی عقائد کو اہل سنت کے مسلک کے مطابق قرآن و حدیث کی روشنی میں موثر طریقہ پر حسن العقیدہ میں بیان کیا ہے، یہ کتاب عربی میں ہے اور العقیدۃ الحسنہ کے نام سے بھی معروف ہے، اس کی شرح مولانا اویس نگرامی نے العقیدہ السنیہ کے نام سے کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے رسالہ رد رافض کا عربی میں شاہ صاحب نے المقدمۃ السنیۃ فی الانتصار للفرقۃ السنیۃ کے نام سے ترجمہ کیا ہے[1]۔ اس میں اہل تشیع کے گمراہ کن خیالات اور اعمال کا محاسبہ کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی شاہ صاحب کا عقلی اور استدلالی انداز نمایاں ہے مثال کے طور پر التفہیمات الالٰہیہ (دو جلدیں) کو دیکھا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب کے اس کارنامہ کی قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ مولانا شبلی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے" ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا، قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشہ دکھلانا تھا کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس واپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے"[2]

تصوف: شاہ صاحب کی علمی خدمات کا ایک وسیع میدان تصوف ہے۔ تصوف ایک متنازع فیہ اصطلاح ہے، بہت سے علماء شدت سے تصوف کے مخالف ہیں جبکہ دوسرے بعض اسی شدت سے اس کی حمایت بھی کرتے ہیں۔ ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی اس وقت تک بلکہ بعد میں بھی یہاں تصوف چودہ سلسلے رائج رہے ان میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، اور نقشبندیہ سلسلوں کو خاص طور پر وسعت اور شہرت ملی[3]۔ ان چاروں سلسلوں میں نقش بندیہ سلسلہ اس اعتبار سے ممتاز سمجھا جاتا ہے کہ اس

---

[1] یہ ترجمہ شاہ صاحب نے قیام حجاز کے دوران اپنے استاذ ابراہیم مدنی کی خواہش پر کیا تھا۔ یہ کتاب فارسی متن کے ساتھ المجموعۃ السنیہ کے نام سے شاہ ابوالخیر اکیڈمی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ [2] علم الکلام ص ۱۱۱

[3] ملاحظہ ہو مقدمہ سیر المتاخرین ص ۲۷۲

میں شریعت کی پیروی پر زور دیا جاتا ہے اور وجد و سماع وغیرہ پر پابندی ہے نیز اس سلسلہ کا شجرہ سلوک حضرت علیؓ کے بجائے ابو بکرؓ سے ملتا ہے۔ اسی سلسلہ سے خواجہ باقی باللہ، مجدد الف ثانی، شاہ عبدالرحیم، مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ولی اللہ جیسے اکابر روزگار وابستہ تھے، مذکورہ حضرات سے شاہ صاحب کا معاملہ قدرے مختلف یوں ہے کہ شاہ صاحب اگرچہ نقش بندیہ سلسلہ سے بیعت ہیں مگر ان کے نزدیک دوسرے تین سلسلوں کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے کیونکہ ان میں الگ الگ خصوصیات پائی جاتی ہیں[1] اسی لئے شاہ صاحب ان تمام سلسلوں سے استفادہ کے قائل ہیں۔

تصوف کے باب میں شاہ صاحب کا ایک contribution یہ ہے کہ انھوں نے گمراہ کن صوفیوں اور ملحد، تصوف پر سخت تنقید کی ہے اور عوام کو اس سے خبردار کیا ہے۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں گمراہ صوفیوں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی تھی جس کو شاہ صاحب نے آٹھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وہ گروہ جو عورتوں کا لباس زیب تن کرتا ہے اور پاؤں اور گلے میں زیور پہنتا ہے۔ اس گروہ کا پیشوا موسیٰ سہاگ ہے جس کی قبر احمد آباد میں ہے عوام کی بڑی تعداد اس گروہ کی پیروی کرتی ہے۔

(۲) دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جس نے بے ریش لڑکوں کے نظارہ کو پیشہ بنالیا ہے اور شراب نوشی اور دیگر منشیات کو اختیار کر لیا ہے، اس قسم کے لوگ اپنے آپ کو عراقی اور مولانا روم سے منسوب کرتے ہیں۔

(۳) تیسرا گروہ ان صوفیوں کا ہے جو ہر طرح کی منشیات کے عادی ہیں۔ اور ہمیشہ مجرد رہتے ہیں یہ قلندروں کی جماعت ہے اور سلسلہ قادریہ و سہروردیہ سے نسبت ظاہر کرتے ہیں۔

(۴) چوتھا گروہ شائخ کے وجد و سماع کو اختیار کئے ہوئے ہے اور اس کی نمائش کرتا ہے۔

(۵) پانچواں گروہ ان لوگوں کا ہے جن پر اویسی نسبت کا پرتو ہے مگر اوہام اور نفسیاتی خیالات میں غرق ہیں

(۶) چھٹا گروہ ان صوفیوں کا ہے جن کا دماغ چل گیا ہے اور اس عارضہ کی وجہ سے ان کے حواس معطل ہو گئے ہیں اس لئے ان کو بیداری میں وہ کچھ نظر آتا ہے جو لوگوں کو خواب میں نظر آتا ہے۔

(۷) ساتواں گروہ بھی وسوسہ میں گرفتار ہے

(۸) آٹھواں گروہ ترک لحم اور ترک تزوج اختیار کرنے والوں کا ہے[2]

شاہ صاحب نے اس قسم کی حرکات اور ایسے صوفیا سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ نیز تصوف کے نام پر دنیا کمانے

---

[1] التفہیمات الالٰہیہ اول ص۸۵ نیز ملاحظہ ہو شاہ صاحب کا مکتوب مشمولہ حیات ولی ص۴۹۰

[2] التفہیمات الالٰہیہ اول ص۲۱۳

والوں کو ڈاکو، کذاب، دجال اور فتنہ پرور قرار دیا ہے[1] انہوں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ
" اس دور کے مشائخ کے ہاتھ پر ہرگز بیعت نہیں کرنی چاہئے، اور علو رعام سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے
اور نہ کرامت سے اس لئے کہ عوام کا اکثر غلو رسم کی وجہ سے ہے اور رسمی امور کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں
ہوتا"[2]

اس کے باوجود شاہ صاحب نے خود تصوف سے نہ صرف اشتغال رکھا بلکہ اس پر متعدد تصانیف
بھی رقم کیں۔ اس سلسلہ میں دو باتیں شاہ صاحب کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتی ہیں ایک تو
یہ کہ شاہ صاحب جس زمانہ اور ماحول میں پیدا ہوئے اس میں ان کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ اپنے اصلاحی
اور تجدیدی کام کا آغاز ایسے طریقے سے کریں جو عوام و خواص کے لئے اجنبی بن کر رہ جائے اور لوگ اسے
قبول ہی نہ کریں چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں" مشرق و مغرب میں صوفیا کی قبولیت اور ان کی اطاعت پر
لوگوں کا اتفاق ہے یہاں تک کہ ان کے اقوال اور احوال کتاب و سنت سے زیادہ لوگوں کے دلوں سے
وابستہ ہیں، ان کی ساری چیزیں یہاں تک کہ ان کے رموز و اشارات بھی لوگوں میں رائج ہو چکے ہیں
اب جو کوئی ان کے رموز و اشارات کا انکار کرے گا اور ان سے کنارہ کش ہوگا وہ مقبول نہ ہو سکے گا اور
اس کا شمار صالحین میں نہ ہوگا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ منبر پر خطبہ دینے والا کوئی واعظ ایسا
نہیں ہے جس کے کلام میں صوفیا کے اشارات شامل نہ ہوں۔ لوگوں کو تعلیم دینے والا کوئی عالم ایسا نہیں
ہے جو صوفیا کے کلام میں اعتقاد نہ رکھتا ہو، امرا کی کوئی مجلس ایسی نہیں ہے جس میں صوفیا کے
اشعار اور نکات زبان زد نہ ہوں"[3] اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ وہ
قرآن و حدیث کے ساتھ تصوف کے پیرایہ میں بھی اپنی بات کہیں اور صوفیانہ مزاج رکھنے والوں سے تصوف کی زبان میں کلام
کریں اس کا اعتراف خود شاہ صاحب نے کیا ہے[4] دوسری طرف شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ارباب
تصوف پر گفتگو کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقہ کے اقوال و
احوال کو ان کے زمانہ کے ذوق کے مطابق جانچنا چاہئے، اس معاملہ میں یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ ہم ایک
عہد کے ارباب تصوف کے اقوال و احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں پر ناپتے پھریں[5] اس اصول کو خود
شاہ صاحب پر بھی منطبق کرنا چاہئے، اور اس صورت میں تصوف کی اصطلاح میں شاہ صاحب کی گفتگو

---

[1] التفہیمات الالٰہیہ اول ص۲۱۴ [2] ایضاً ص۲۱۴ [3] ایضاً ص۸۲ [4] ایضاً ص۸۳
[5] ہمعات ص۶

ان کی دوسری علمی خدمات سے متضاد نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ ایک وقتی ضرورت اور تقاضائے مصلحت بن جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاہ صاحب شریعت کی تمام تر پیروی کا ہی ایک حصہ احسان کو قرار دیتے ہیں اگرچہ وہ اس احسان کی تشریح کرتے ہوئے کہیں کہیں تصوف کے ان مقامات واحوال اور نظام پر آجاتے ہیں قرآن وسنت سے جن کا ثبوت نہیں ملتا۔ تاہم شاہ صاحب پھر تصوف کے اسی پہلو یعنی احسان کی طرف رجوع کرتے ہیں بلکہ وہ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ ان کی لسان جلی اشاعت حدیث کی طرف مائل ہے کیونکہ اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ بدعتی مذاہب کی جڑیں کاٹتا ہے۔ اور لسان خفی کسب احسان کی طرف مائل ہے جس کے تین درجے ہیں (۱) پہلا درجہ ان لوگوں کے لئے ہے جو کسب معاش وغیرہ میں مشغول ہیں مثلاً نوحی طالب علم۔ صنعت گر۔ یہ درجہ لسانی ذکر کا ہے مثلاً سبحان اللہ وبحمدہ اور لا الٰہ الا اللہ دوسرا درجہ ان لوگوں کے لئے ہے جو راہ حق کے سلوک میں دلچسپی لیتے ہیں یعنی جن کے پاس فرصت ہے یہ درجہ ذکر بالجہر کا صوم اور تہجد واعتکاف کا ہے مگر اس کے لئے جس کی جبلت قوی ہو، اور ذکر خفی اس کے لئے ہے جس کی جبلت کمزور ہو۔ تیسرا درجہ ان لوگوں کے لئے ہے جو فنا اور بقا کے حصول میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ان کو توحید ذات، پھر توحید افعال پھر توحید صفات پھر توحید ذات پھر یاد داشت پھر دوام کی ہدایت دی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کا نفس اس کے رنگ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے[1]

بہر صورت شاہ صاحب نے تصوف سے متعلق حسب ذیل کتابیں تصنیف کی ہیں۔

(۱) الطاف القدس (فارسی) یہ کتاب فلسفہ تصوف، مقامات نفس اور لطائف تصوف سے بحث کرتی ہے اس میں انسان کی باطنی قوتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

(۲) فیوض الحرمین (عربی) یہ کتاب حرمین کے مشاہدات منام اور روحانی معرفت سے متعلق ہے مطبع احمدی دہلی سے اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی ہے

(۳) القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی) یہ کتاب شیخ اور مرید، بیعت وغیرہ کے آداب اور تاریخ اور نظام تصوف پر لکھی گئی ہے۔

(۴) سطعات (فارسی) یہ کتاب فلسفہ تصوف اور کلام دونوں سے بحث کرتی ہے ۱۹۲۹ء میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی تھی، اب کراچی اور حیدرآباد (پاکستان) سے بھی شائع ہوئی ہے۔

---

[1] التفہیمات الالٰہیہ ص ۸۵ - ۸۶

(۵) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (فارسی) یہ رسالہ تصوف کے مختلف سلسلوں کی تاریخ اور نظام پر لکھا گیا ہے۔ ۱۳۱۱ھ میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

(۶) ہمعات (فارسی) اس میں تصوف کے نشو و ارتقا کے چار ادوار سے گفتگو کی گئی ہے شاہ صاحب نے اس میں ان ادوار کی خصوصیات بھی بتائی ہیں، کتاب تحفۂ محمدیہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷) شفاء القلوب (فارسی)

(۸) التفہیمات الالٰہیہ (فارسی و عربی) اس کتاب میں تصوف کے متفرق مباحث شامل ہیں کتاب دو جلدوں میں ہے اور المجمع العلمی ڈابھیل سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود یا المکتوب المدنی بھی شامل ہے۔

(۹) لمعات (فارسی)

(۱۰) کشف الغین عن شرح الرباعیتین (فارسی) یہ رسالہ خواجہ باقی باللہ کی دو رباعیوں کی شرح ہے ۱۳۱۰ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔

ان کے علاوہ شیخ عبداللہ بن عبدالباقی کے خط کے جواب میں اپنے کشف کے مطابق شاہ صاحب نے ایک رسالہ لکھا، نیز ابوالحسن شاذلی کی دعائیہ نظم حزب البحر کی شرح ہوامع کے نام سے لکھی ہے، یہ شرح اپنے مباحث اور اسلوب کے لحاظ سے سطعات کے مشابہ ہے۔

سیرت و سوانح: سیرت و سوانح سے متعلق شاہ صاحب کی متعدد گرانقدر کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا موضوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک، فضیلت شیخین، خلفاء راشدین کی خلافت، شاہ صاحب کے آبا و اجداد کے حالات اور شیوخ و اساتذہ کی سوانح ہے۔ ان موضوعات پر لکھتے وقت شاہ صاحب کا نقطہ نظر اور جذباتی اور تصوراتی پس منظر مختلف رہا ہے، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لکھتے وقت جس طرح ہر مسلمان عقیدت و محبت اور جذبۂ اطاعت سے سرشار ہوتا ہے ٹھیک اسی جذبہ سے شاہ صاحب نے بھی شان محمدیؐ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، سیرت کے موضوع پر شاہ صاحب کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے بلکہ اس خدمت کے لئے انھوں نے اشاعت حدیث ہی کو ذریعہ بنایا ہے البتہ ان کے نعتیہ قصیدہ کا عربی مجموعہ "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" موجود ہے۔ یہ مجموعہ مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا، دوسری کتاب، ابن سید الناس کی سیرت پر معروف کتاب "نور العیون فی سیر الامین والمامون" کا فارسی ترجمہ سرور المحزون اس میں آنحضورؐ کی حیات مبارکہ کا خلاصہ ہے یہ کتاب مطبع جیون پرکاش دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

خلفاء اربعہ پر بھی آپ نے کوئی کتاب ان کے حالات زندگی مرتب کرنے کی غرض سے نہیں لکھی بلکہ روافض نے خلفاء ثلاثہ اور دیگر اصحاب رسولؐ کی توہین و تنقیص، ان پر الزام تراشی اور ان کے سلسلہ میں

شکوک و شبہات پیدا کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا اس کے پیش نظر آپ نے قلم اٹھایا۔ اس سلسلہ کی ایک کتاب "قرۃ العین فی تفضیل الشیخین" ہے یہ کتاب فارسی میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضرت ابوبکر الصدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی فضیلت کے اثبات میں لکھی گئی ہے، شاہ صاحب حضرت عثمان اور حضرت علی کی فضیلت کے بعض وجوہ سے قائل ہیں مگر فی الجملہ شیخین کی فضیلت کے اثبات کو ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسری مشہور زمانہ کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" ہے یہ کتاب بھی فارسی میں ہے اور اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اس میں نہ صرف خلفاء اربعہ کے حالات اور ان کے خصائص کو سمیٹا ہے بلکہ نظریہ خلافت، استحقاق خلافت، خلیفہ کے شرائط قرآن و حدیث سے خلافت اور خلفاء کے ثبوت اور طریقہ خلافت پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اہل اسلام کا یہ اہم ادارہ جس کے اثبات کو شاہ صاحب نے اصول دین میں سے قرار دیا ہے، اچھی روشنی پڑتی ہے۔ خلافت اسی کی نیابت ہے اور یہ اسلامی نظام حیات کی قوت نافذہ ہے، اس کے تحت اسلام کا پورا نظام گردش کرتا ہے شاہ صاحب نے خلافت کی تعریف کرتے ہوئے خلافت جمہوری ریاست (الریاسۃ العامہ) کا نام ہے، جو اقامت دین کے کام کی تکمیل کے لئے وجود میں آتی ہے، اس اقامت دین کے دائرہ کار میں علوم دینیہ کا احیاء ارکان اسلام کا قیام جہاد اور اس کے متعلقات کا انتظام، مثلاً لشکروں کی ترتیب، جنگ میں حصہ لینے والوں کے حقوق اور مال غنیمت میں ان کے حصے، نظام قضا کا قیام، حدود کا اجراء، مظالم کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور جانشینی کا اقتضا ہے۔

[illegible] سول صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کیا ہے، اور خلفاء راشدین کس طرح سے نائب ہوئے، شاہ صاحب اس کے متعلق وضاحت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا اور اس کے مطابق مختلف دینی شعبے میں منصب خلافت و نیابت پر فائض ہوئے، مثلاً فقہ و قرات میں عبداللہ بن مسعودؓ قضا میں معاذ بن جبل، علم فرائض میں زید بن ثابت اور ان میں جو قریش تھے اور ریاست کا بار اٹھانے کی اہلیت رکھتے تھے وہ خلافت مطلقہ کے مستحق ہوئے"

ازالۃ الخفاء اپنے موضوع، مباحث، استدلال اور نتائج کے لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے اور حجۃ اللہ البالغہ کے بعد شاہ صاحب کا دوسرا شاہکار ہے یہ کتاب مطبع صدیقی بریلی سے شائع ہوئی تھی اور اب سہیل اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے آباء و اجداد اور اساتذہ کی سیرت و سوانح پر "انفاس العارفین" لکھی اس کتاب میں حسب ذیل سات رسالے ہیں۔

(۱) بوارق الولایۃ (۲) شوارق المعرفۃ (۳) امداد فی ماثر الاجداد (۴) النبذۃ الابریزیہ فی

اللطیفۃ العزیزیہ۔ (۵) العطیۃ الصمدیہ فی انفاس المحمدیہ (۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین
(۷) الجزء اللطیف فی ترجمۃ عبد الضعیف۔

یہ کتاب اگرچہ تذکرہ نویسی میں ان کے اسلوب نگارش کا پتہ دیتی ہے۔ مگر اس میں شاہ صاحب کا معروف محدثانہ اور محققانہ انداز نہیں تھا۔ اسی وجہ سے یہ کتاب آج تک علما میں مقبول نہیں ہوئی ۱۹۱۷ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی۔ [۱]

تدوین علم: شاہ صاحب کی بعض کتابیں علوم و فنون کی تدوین اور طریقہ تعلیم سے متعلق ہیں۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا جو نصاب رائج تھا اس میں قرآن و حدیث کے علاوہ ان علوم کی کثرت تھی جن کو امدادی علوم کہا جا سکتا ہے۔ قرآن و حدیث پر زور دینے کی تحریک کا تقاضا یہ تھا کہ شاہ صاحب مروجہ علوم کی تاریخ اور مسائل پر بھی گفتگو کریں۔ تاکہ یہ واضح ہو کہ علوم اسلامیہ کی تشکیل نو میں کس ترتیب کے مطابق مطالعہ اور تدریس کا رخ اور نہج متعین کیا جائے۔ اس سلسلہ کی ایک اہم تصنیف عربی زبان میں "الخیر الکثیر فی اسباب تدوین العلوم" ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے تمام مدونہ علوم کو چار خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) علوم عربیہ (۲) علوم شرعیہ (۳) علوم فلسفہ (۴) علوم محاضرہ۔

علوم عربیہ کی بابت شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ اس لئے مدون کئے گئے کہ ان کے ذریعہ کلام عرب کی معرفت حاصل ہو ان علوم میں علم حروف مفردات، یعنی لغت اور علم المخارج، علم صرف، علم الاشتقاق، علم المرکبات علم الاعراب، علم التالیف، علم البدیع آتے ہیں۔ اور احوال شعر کا علم یعنی علم العروض، علم القافیہ علم الخط وغیرہ بھی ان میں شامل ہیں۔ پھر ان علوم کو مدون کرنے والوں کے نام اور کام کا تذکرہ کیا ہے۔

علوم شرعیہ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اس کی تدوین اس لئے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن امور کے ساتھ مبعوث کیا ان کی معرفت حاصل ہو۔ ان علوم کا مرجع قرآن و سنت ہے۔ اسلاف نے علوم شرعیہ میں چار اصناف کے تحت کتابیں ضبط قلم کیں (۱) فقہ جس میں عبادات، بیوع میراث، خانہ

---

[۱] ہمارے علماء محدثین کے یہاں یہ عجیب تضاد پایا جاتا ہے کہ جس طرح وہ احادیث، عقائد و احکام اور امور دین کی چھان بین کرتے ہیں اور تحقیق و تنقید کے بعد احتیاط کی زبان سے ان کو بیان کرتے ہیں وہ اپنے بزرگوں اور آباؤ اجداد کے سلسلہ میں بالکل اس طرز تحقیق کو اختیار نہیں کرتے بلکہ سنی سنائی بات کو عقیدت کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ —— چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے یہاں بھی اخبار الاخیار کا مواد اور انداز ان کی دوسری علمی کتابوں سے یکسر مختلف معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر کتاب کا پہلا باب جس میں انھوں نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات اور واقعات لکھے ہیں۔ اور یہی طرز فکر شاہ صاحب کا اپنے آباؤ اجداد کے سلسلہ میں ہے۔

داری، شہروں کی سیاست، اور آداب بعثت کا ذکر ہے (۲) تفسیر جس میں نادر الفاظ کی شرح، اسباب نزول آیات میں تطابق، ناسخ و منسوخ کا بیان وغیرہ آتے ہیں۔ (۳) سیر، اس میں آنحضورؐ کے عادات و اخلاق غزوات و سرایا اور دیگر باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ (۴) رقائق۔ یہ مواعظ و نصائح، جنت و دوزخ، فضائل اعمال، مناقب صحابہ، ذکر و اذکار اور دیگر پر مشتمل ہے۔ علوم شرعیہ کے ضمن میں شاہ صاحب نے مفسرین و محدثین، فقہا، واعظین، اور سیرت نگاروں کے کام کا جائزہ لیا ہے علوم فلسفہ یا حکمیہ کی تدوین کا سبب شاہ صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ اولاد نوح جب زمین پر پھیلی تو ان کے معاشی، تمدنی، سماجی اور سیاسی حالات ان علوم کی تدوین کا سبب ہوئے اور ان کے ارتقا میں یونان و روم اور فارس وغیرہ نے حصہ لیا۔ شاہ صاحب نے اس ضمن میں اسلامی عہد کے علوم عقلیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علوم محاضرہ، یعنی ملکی قوانین، مفید صنعتوں اور عجیب حکایات وغیرہ کے علوم ہیں جن کی لوگوں کو ضرورت پڑتی ہے۔ ان علوم میں پیشین گوئی، فال، کہانت، تعبیر رویا، طب، جھاڑ پھونک، وغیرہ شامل ہیں نیز مفید ہنر بھی ہیں جیسے تیر اندازی خوش خطی کیمیا، موسیقی۔ طباخی، کاشت کاری وغیرہ

یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع پر جامع ہے۔ یہ کتاب اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۲۲ھ میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

تعلیم سے متعلق شاہ صاحب کی دوسری کتاب 'رسالہ دانشمندی' ہے فارسی کا یہ مختصر رسالہ بھی اپنی جگہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ دانشمندی سے ان کی مراد کتاب دانی ہے، انھوں نے اس کے تین درجے بتائے ہیں (۱) کتاب کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی ماہیت بدرجہ تحقیق حاصل کی جائے۔ (۲) استاذ کتاب کو پڑھائے اور اس کی حقیقت شاگردوں کو سمجھائے، (۳) کتاب پر شرح یا حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت پورے طور پر واضح کرے لہ شاہ صاحب اس فن کو حاصل کرنے کے مختلف فوائد بتاتے ہیں جس سے علم کے حصول کی راہ آسان ہوتی ہے۔ مثلاً اس فن کے دوسرے درجہ یعنی 'تدریس' کے ضمن میں لکھتے ہیں کتاب پڑھاتے وقت استاد کو پندرہ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ (۱) مشکل الفاظ کی نشاندہی، (۲) نامانوس الفاظ کی تشریح (۳) مغلق مقامات کی وضاحت (۴) زیر بحث مسئلہ کی مثالوں اور مختلف صورتوں سے وضاحت (۵) دلائل کو ذہن سے قریب کرکے پیش کرنا (۶) تعریفات کے قیود اور فوائد بیان کرنا (۷) جامع اور مانع تعریف کرنا (۸) دلیل حصر واضح کرنا (۹) دو مشتبہ چیزوں میں تفریق کرنا

لہ گویا من دانشمندی کا مطلب مطالعہ، تدریس اور تصنیف کی تینوں مراحل سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔

(۱۰) مختلف چیزوں میں تطبیق دینا (۱۱) وارد ہونے والے شبہات کا ازالہ (۱۲) حوالہ جات اور مصنف کے اشاروں کی وضاحت (۱۳) اگر شاگرد کی مادری زبان وہ نہیں جو کتاب کی ہے تو کتاب کا اس کی زبان میں ترجمہ کرنا (۱۴) مختلف توجیہات کی تنقیح اور صحیح تر توجیہ کا تعین (۱۵) تقریر آسان اور قابل فہم کر لی جائے۔

شاہ صاحب کے نزدیک اس فن دانشمندی کا اطلاق، کتب معقول و منقول، علوم برہانیہ اور خطابیہ سب پر ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی علمی خدمات میں، ان کے مکاتیب کو بھی کسی حد تک شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان خطوط میں بالعموم شاہ صاحب نے علمی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحب کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) مکتوبات مع مناقب ابی عبداللہ و افضلیت ابن تیمیہ (۲) مکتوب المعارف مع ضمیمہ مکتوبات ثلاثہ[1] (۳) مکتوبات فارسی (یہ کلمات طیبات میں شامل ہیں) (۴) مکتوبات عربی (یہ حیات ولی میں درج ہیں) (۵) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ یہ کتاب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مرتب کی ہے اور علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

تطبیق: شاہ صاحب کے پسندیدہ علمی موضوعات میں ایک موضوع "تطبیق" ہے گو کہ انھوں نے اس موضوع پر باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی تاہم ان کی بیشتر تصانیف میں اس فن سے متعلق تھوڑا بہت مواد موجود ہے، شاہ صاحب اس موضوع کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ اس کو اپنے دور کا خاص علم قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیں اس دور میں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ ہمارے سینہ میں اس امت کے علماء کے سارے علوم جمع ہو گئے ہیں۔ جن میں معقولیت و منقولات اور کشف و وجدان کے علوم ہیں۔ ہمیں خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ ایک علم کو دوسرے پر تطبیق دے سکتے ہیں اور اس طرح بظاہر ان میں جو اختلافات ہوتے ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں ہر بات اپنی جگہ فٹ ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ مختلف اور متعارض اقوال میں تطبیق کا یہ اصول علم کے تمام فنون پر حاوی ہے، اس کے تحت فقہ، کلام اور تصوف وغیرہ سبھی آجاتے ہیں[2] نظریہ تطبیق کے تحت شاہ صاحب نے قرآن و حدیث، مختلف احادیث، حدیث اور فقہ، فقہی مکاتیب، اقوال صحابہ، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ قرآن اور سنت ایک ہی حقیقت کی اجمالی اور تفصیل ہیں اور فقہ قرآن و سنت ہی کی تفریع ہے تو ظاہر ہے کہ

---

[1] یہ مکاتیب شاہ ابوسعید اور مولوی امین کے نام ہیں۔ مطبع الانوار سہارنپور سے ۱۳۰۰ھ میں شائع کیا تھا [2] التفہیمات الالہیہ دوم ص ۲۴۵

ان میں باہم تطبیق کا کام ایک اہم اور قابل قدر کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ فقہ کے مختلف مکاتیب میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی وجہ سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ خود فریبی اور تنگ نظری نے جنم لیا ہے۔ اپنے آپ کو اقرب الی الصواب اور دوسرے مکتب فکر کو اقرب الی الخطا سمجھنے کا رجحان عام ہوا ہے۔ اگر ان مکاتیب میں سررشتہ تلاش کیا جائے اور اختلافات کے اسباب کا سراغ لگا کر ان کی نوعیت واضح کی جائے تو بلاشبہ یہ بھی عظیم الشان کام ہے۔ اسی طرح مختلف صوفیانہ سلسلوں میں نقطۂ اتحاد تلاش کرنا اور ایک کو دوسرے سے ہم آہنگ کرنا بھی مفید عمل ہے۔ مگر یہ تطبیق اس وقت درست اور قابل قدر ہو سکتی ہے جبکہ یہ طے ہو چکا ہو کہ جن چیزوں میں تطبیق دی جا رہی ہے وہ اپنی جگہ برحق اور جواب ہیں۔ مگر جب ان میں سے ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہو تو ظاہر ہے وہاں تطبیق بے معنی ہوگی۔

شاہ صاحب کے پیش رو میں امام غزالی کی ذات واحد نظر آتی ہے جنہوں نے شریعت اور تصوف میں تطبیق کا کام انجام دیا ورنہ ان سے پہلے شریعت کے مباحث طریقت کے مباحث بالکل الگ کر دیے گئے تھے[1] شاہ صاحب امام غزالی کی پیروی کرتے ہوئے اس کام کو صرف تصوف تک محدود نہ رکھا بلکہ اس کا دائرہ پوری شریعت اور اس کے تفرعات تک وسیع کر دیا۔ شاہ صاحب کے تطبیق کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ "حضرت عمرؓ نے حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے کہا میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے اور نفع ونقصان کی صلاحیت سے محروم ہے اگر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں ہرگز تجھے بوسہ نہ دیتا۔ اور حضرت علیؓ نے کہا حجر اسود نفع ونقصان پہونچا سکتا ہے اور اپنے بوسہ دینے والے اور ترک کرنے والے پر گواہ ہے" ان دونوں اقوال میں شاہ صاحب نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ یہ اختلاف مقامات کے اختلاف سے متعلق ہے حضرت عمرؓ نے شریعت کی تحریف سے حفاظت کے پہلو سے فرمایا۔ ان کا مقصد بت پرستوں کی تردید تھی، مبادا یہ سنت کہیں اپنے محل سے ہٹ کر نہ سمجھی جائے اور حضرت علیؓ کا کلام عالم میں موجود اسرار کی معرفت کے پہلو سے ہے انھوں نے پہچانا کہ پتھر میں جو انی ہئیت ہے اور اسی طرف اشارہ ہے اس بات میں کہ وہ حست کا پتھر ہے تو یہ ہئیت قیامت کے دن انبیاء کی طرح شاہد ہوگی[2]

شاہ صاحب نے خاص طور پر ابن عربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود اور مجدد الف ثانی کے نظریۂ وحدۃ الشہود

---

[1] ملاحظہ ہو سعید نفیسی کی کتاب "سرچشمۂ تصوف در ایران"

[2] تفہیمات الالہیہ دوم ص ۱۷۱

میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے یہ بحث اسماعیل بن عبداللہ رومی مدنی کے خط کے جواب میں ایک مختصر رسالہ میں کی ہے جو "فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود" اور مکتوب مدنی کے نام سے متعارف ہے[1] انھوں نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق دے کر مجددؒ اور ابن عربی کے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش ہے۔ مگر بعد کے ناقدین نے اس تطبیق کو اس لئے تسلیم نہیں کیا ہے کہ یہ دو ایسی چیزوں میں تطبیق دینا ہے جو بنیادی طور پر مختلف ہیں[2]

---

[1] یہ رسالہ التفہیمات الالہیہ دوم میں شامل ہے۔

[2] A HAQUE ANSARI, SUFIISM AND SHARIAH, LONDON, 1982

تراجم واقتباسات

امریکہ میں اسلام اور مسلمان

مولانا محمد رضی الاسلام ندوی

(امریکن یونیورسٹی واشنگٹن American Institute for Islamic Affairs کے زیر اہتمام عالم اسلام عصر حاضر میں کے عنوان سے لیکچرز کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا تھا پیش نظر مقالہ A Century of Islam in America (امریکہ میں اسلام کی ایک صدی) اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے جسے ایک خاتون ایوون وائی حداد (YVONNE Y HADDAD) نے پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کے بارے میں بعض قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ وزارۃ الاوقاف کویت کی جانب سے اس کا عربی ترجمہ کرکے شائع کیا گیا۔ ذیل میں تلخیص کے ساتھ اس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔)

اسلام باوجودیکہ دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ہے اور اس کے متبعین کی تعداد تقریباً ایک ارب (یعنی پوری دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ) ہے لیکن عموماً اس کا تذکرہ امریکہ کے تعلق سے نہیں ہوتا، حالانکہ وہ امریکہ میں بھی قابل قدر اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً تیس لاکھ ہے[1] جس کی اکثریت ساحل مشرقی، وسط مغربی اور کیلیفورنیا میں سکونت پذیر ہے اور جہاں ملک کے مختلف کونوں میں بہت سارے مساجد اور اسلامی مراکز تبلیغ اسلام کا کام انجام دے رہے ہیں۔

گذشتہ صدی کے نصف سے امریکہ میں ہجرت، افزائش نسل اور قبول اسلام کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں سب سے اگلے طور پر اضافہ ہوا۔ ان کی دو تہائی آبادی شرق اوسط اور دوسرے ممالک سے ہجرت کرکے

---

[1] مالس لیسرل اما بنال نے امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد چھ لاکھ بتلائی ہے۔ وریث الدین محمد (لیڈر امۃ الاسلام) نے نو لاکھ کا اندازہ لگایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر عارف غیور (سنٹ لورانس یونیورسٹی) اور ڈاکٹر رجیب الرحمن (الیا کالج) نے الگ الگ سروے کے مطابق وہاں مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ ہے

وہاں پہنچی ہے۔ بقیہ آبادی میں سے عظیم اکثریت مقامی باشندوں کی ہے جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے ان میں سے اکثریت افرو امریکیوں کی ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعداد میں اس تناسب سے اضافہ ہوتا رہا تو ۲۰۱۵ء تک ولایتہائے متحدہ امریکہ میں اسلام دوسرا سب سے بڑا مذہب ہوگا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ امریکہ کے مسلم علماء اور طلبہ اور مشرق اوسط سے تعلق رکھنے والے تجزیہ نگار اور مبصرین جو امریکہ کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں، تمام لوگ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات سے چشم پوشی برتتے رہے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اسلام کا تعارف شرق اوسط میں ہونے والی دہشت گردی کے ذریعے کراتے ہیں۔ اس کے باوجود امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات لائق توجہ ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کا وجود:

امریکہ میں مسلمانوں کا وجود کب سے ہوا؟ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ امریکہ میں کولمبس کے پہنچنے سے پہلے سے ہیں۔ بعض تاریخی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۱۷ء میں امریکہ میں کچھ ایسے غلام پہنچے جو عربی زبان بولتے تھے اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے تھے اور خنزیر کا گوشت کھانے سے احتراز کرتے تھے۔ اسی طرح بعض اندازوں کے مطابق اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں افریقہ سے غلاموں کے جو گروپ شمالی اور جنوبی امریکہ لے جائے گئے ان میں سے تقریباً پانچ گروپ مسلمانوں کے تھے ان میں سے جو لوگ امریکی نوآبادیات میں گئے انھوں نے بہت جلد نصرانیت قبول کرلی۔ اس زمانے کے مسلمانوں کے بہت کم آثار پائے جاتے ہیں مثال کے طور پر اس زمانے کا قرآن کا ایک نسخہ محفوظ ہے جو بظاہر حافظہ سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

گزشتہ صدی میں ہجرت:

تقریباً ۱۸۷۵ء سے مسلمان شرق اوسط سے امریکہ ہجرت کرنے لگے۔ ان کی پہلی ہجرت قدیم شام سے ہوئی (جو بعد میں شام، لبنان، اردن اور فلسطین میں تقسیم ہوگیا) پہلی مرتبہ ہجرت کرنے والوں میں سے بیشتر لوگ غیر تعلیم یافتہ بے ہنر اور کاشت کار تھے۔ جنھوں نے امریکہ جانے والے لبنانی عیسائیوں سے خوشحالی اور فارغ البالی کے قصے سن رکھے تھے۔ انھیں امید تھی کہ وہاں جاکر معاشی اعتبار سے خوشحال ہوکر واپس آئیں گے۔ چنانچہ بہت سے لوگ وہاں پھیری لگاکر اشیاء فروخت کرنے لگے بعض لوگ دوکانوں، کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے لگے اور بعض سبزی فروش بن گئے یا قہوہ خانے چلانے لگے۔ یہ ہجرت پہلی جنگ عظیم تک جاری رہی اس کے بعد اس میں توقف آگیا، لیکن بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اس کا پھر آغاز ہوگیا اور لوگ کثیر تعداد میں امریکہ ہجرت کرنے لگے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی تعداد گھٹ کر

نصف رہ گئی اس لئے کہ اس مدت میں ہجرت کے قوانین میں واضح نسلی امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا اسی بنا پر بہت سے مہاجروں کو امریکی جزیرۂ ایلس سے واپس کر دیا گیا۔ ہجرت میں کمی آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہت سے لوگوں کو وہاں شہریت حاصل کرنے میں دشواریاں لاحق ہوئیں اور بسا اوقات وہ حقوق شہریت سے محروم کر دیئے گئے۔

ہجرت کی تیسری لہر اجو ۱۹۴۷ء سے چھٹی دہائی کے نصف تک جاری رہی) اسلامی ممالک کے بدلے ہوئے حالات کے ردِ عمل کا نتیجہ تھی۔ ہجرت کرنے والوں میں سے اکثریت نے سیاسی مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنا وطن چھوڑا تھا۔ یہ لوگ قدیم مہاجرین کے برعکس تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بڑی تعداد فلسطینیوں کی تھی جنھیں اسرائیل نے جلا وطن کر دیا تھا۔ کچھ لوگ دوسرے ممالک سے بھی تعلق رکھتے تھے مثلاً کچھ مصری تھے جن کی جائیدادوں کو جمال عبدالناصر نے قومیا لیا تھا۔ یا عراقی تھے جنھوں نے ۱۹۵۹ء کے انقلاب کے بعد وطن سے راہ فرار اختیار کی تھی۔ یا شام کے اعلیٰ حکومتی مناصب کے لوگ تھے جنھیں حکومت میں شرکت سے محروم کر دیا گیا تھا یا یوگوسلاویا، البانیا، سوویت یونین اور دوسرے مشرقی یورپ کے ممالک کے وہ باشندے تھے جنھوں نے کمیونسٹ حکومت کے تحت رہنا گوارا نہ کیا تھا۔

ہجرت کی چوتھی لہر کا آغاز ۱۹۶۷ء سے ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اس میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو انگریزی زبان اچھی طرح جانتے ہیں اور مغربی تہذیب سے متاثر ہیں۔ ان کا تعلق مشرق اوسط اور دوسرے ممالک سے ہے ان مسلمانوں نے مال و دولت کمانے اور خوشحالی حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس ہونے کے لئے امریکہ کا رخ نہیں کیا ہے بلکہ یہاں اعلیٰ تعلیم اور ترقی یافتہ ٹیکنیکل تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں البتہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی شامل ہیں جو اپنے وطن میں مختلف ناپسندیدہ نظریوں کی وجہ سے آزادی کی تلاش میں آئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جنھیں اپنے ممالک سے جلا وطن کر دیا گیا ہے۔

اب تک جو لوگ مختلف ممالک سے ہجرت کر کے امریکہ آئے تھے ان کا مقصد یا تو اقتصادی خوشحالی کا حصول ہوتا تھا یا وہ عارضی قیام کے لئے آتے تھے دوسرے یہ کہ ان کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اسی وجہ سے تنظیم کے پیمانے پر اشاعت اسلام کا کام نہ ہو سکا تھا۔ لیکن مستقل قیام کرنے والے مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ احساس وشعور بھی پروان چڑھتا رہا کہ عقیدہ کی حفاظت کے لئے امریکہ میں پیدا ہونے والی نئی نسل کی اسلامی تربیت ناگزیر ہے اسی وجہ سے تبلیغ اسلام کے لئے تنظیموں اور اداروں کا قیام عمل میں آنے لگا۔

اسلام افرو امریکیوں کے درمیان :۔ امریکہ میں مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی افرو امریکیوں کی

ہے جو اسی صدی میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں۔ تیموتی درو نجی (ولادت ۱۸۸۶ء) پہلا شخص ہے جس نے افریقی النسل امریکیوں کو متحد کرنے کی غرض سے ایسے اصولوں کی طرف دعوت دی جو اس کے نزدیک اسلامی تھے اس نے اپنا نام بدل کر شریف درو رکھ لیا اور نیو یارک/ نیو جرسی میں ۱۹۱۳ء میں ایک مرکز قائم کیا۔ اس کا خیال تھا کہ سیاہ فام نسل کا وطن ایشیا ہے اور ایشیا کے باشندوں کا دین اسلام ہے جبکہ مسیحیت سفید فام نسل کا مذہب ہے۔

درو تحریک کی بنیاد اسلام سے زیادہ مشرقی فلسفوں کے مخلوط پر مبنی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے ایک مظلوم و مقہور قوم کو متحد کر کے اسے عزت و احترام اور شخصی آزادی کے مقام پر فائز کیا جا سکے۔ یہ تحریک شمالی امریکہ کے متعدد بڑے شہروں مثلاً فلاڈیلفیا، ڈیٹرائٹ اور بعض جنوبی شہروں تک وسیع ہو گئی۔ اب بھی مشرقی ساحل پر متعدد شہری علاقوں میں اس تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔

درو علی کی وفات (۱۹۲۹ء) کے کچھ عرصہ کے بعد ڈیٹرائٹ میں ایک ترکی یا ایرانی النسل شخص کے ہاتھوں ایک دوسری تحریک برپا ہوئی۔ یہ شخص متعدد ناموں سے معروف تھا مثلاً و دفارد، ولی فارد والاس فارد اور روف فارد وغیرہ، وہ کہتا تھا کہ وہ مکہ مکرمہ میں عربی باپ اور یورو پین ماں سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے یہ خیال پیش کیا کہ افریقی النسل امریکی باشندے درحقیقت مسلمان تھے جو اپنے حقیقی تشخص سے دور ہو گئے ہیں اس لئے انھیں دوبارہ اسلام کی طرف لانا چاہئے۔ اس تحریک کا نام امۃ الاسلام رکھا گیا۔ اس کی قیادت ایلیا محمد (سابق ایلیا پول ولادت ۱۸۹۷ء) کے ہاتھوں میں آئی۔ اور فارد نے اعلان کیا کہ ایلیا محمد اللہ کا فرستادہ ہے جو سیاہ فام نسل کو معرفت فطرت بخشنے آیا ہے۔ جن اصولوں کی طرف یہ تحریک دعوت دیتی تھی ان میں سے بیشتر اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض تھے۔ اس نے سفید فام نسل کو شیطان قرار دیا۔ اس تصور میں نسلی امتیاز کی بنیاد پر سیاہ فاموں پر سفید فاموں کی طرف ہونے والے مظالم کی واضح جھلک موجود تھی۔ اسی لئے لاکھوں انسانوں نے ایلیا محمد کی دعوت پر لبیک کہا اور اس کی تحریک کو ماضی کے ظلم و تعذیب سے نجات پانے اور اپنا تشخص قائم کرنے کا ذریعہ سمجھا۔ ایلیا محمد کی دعوت قبول کرنے والوں میں گرے پڑے اور نچلے طبقے کے لوگ ہی نہ تھے بلکہ امریکہ کے بہت سے معزز تعلیم یافتہ اور پیشہ ور لوگوں نے بھی اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ جن میں ایک بڑی تعداد افرو امریکی قائدین کی تھی۔

لیکن امریکہ کی اکثریت نے اس تنظیم کو تسلیم نہیں کیا۔ سفید فام عیسائیوں، افرو امریکی لیڈروں اور مہاجر مسلمانوں سب نے براہ راست یا بالواسطہ اسے اپنے ذاتی مصالح کے خلاف سمجھا۔ مہاجر مسلمانوں نے اسے ایک مخصوص فرقہ خیال کیا جس کے خیالات اگرچہ بظاہر اسلام سے مشابہت

رکھتے ہیں مگر وہ بہت سے ایسے نسلی اور فرقہ وارانہ اصولوں پر مبنی ہے جو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے براہ راست متصادم ہیں۔ اس تنظیم کی مخالفت صرف بیرونی طور پر ہی نہیں ہوئی بلکہ اندرونی طور پر بھی اسے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مالکولم ایکس ایلیجا محمد کے ممتاز شاگردوں میں سے تھا۔ اس نے قید خانہ میں اسلام کا شعور حاصل کیا تھا پھر ایلیجا محمد کے سرگرم کارکنوں میں شامل ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مالکولم نے حج کے لئے مکہ کا سفر کیا تو وہاں اسے ایلیجا محمد کے اسلام سے مختلف ایک دوسرا ہی اسلام نظر آیا۔ رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر اہل ایمان کے باہمی برتاؤ نے اس کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا کہ سفید فام نسل فطری طور مجسمہ شر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ایلیجا محمد کی تحریک سے الگ ہو گیا اور اسی وجہ سے ۱۹۶۶ء میں ایک دینی جلسہ کے دوران امۃ الاسلام کے دو کارکنوں نے اسے قتل کر دیا۔

ایلیجا محمد کی وفات (۱۹۷۵ء) کے بعد تحریک کی قیادت اس کے بیٹے (والاس) وریث الدین محمد کے ہاتھوں میں آئی اس نے امۃ الاسلام کو صحیح اسلام کے دھارے میں لانے کی کوشش کی نسلی اصولوں کی جگہ قرآنی تعلیمات کو پیش کیں اور اپنے باپ کے اصولوں اور صحیح اسلام کے درمیان خلیج کو پُر کرنے کی تدبیریں کیں۔ وریث الدین نے کئی سال عربی زبان قرآن اور اسلامی شریعت کی تعلیم حاصل کی تھی اس نے اپنے لئے مجدد کا لقب پسند کیا اور تحریک کے نام میں بھی کئی تبدیلیاں کیں۔ چنانچہ پہلے امۃ الاسلام سے، عہد نبوی میں پہلے حبشی مسلمان حضرت بلالؓ کی طرف نسبت کرتے ہوئے، الجماعۃ الامریکیہ البلالیہ نام رکھا گیا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں اس کا نام امۃ الاسلام العالمیۃ ہوا پھر ۱۹۸۰ء میں لت البعثۃ الاسلامیہ الامریکیہ سے موسوم کیا گیا۔ آخر کار ۱۹۸۵ء میں الجالیۃ الاسلامیہ العامہ کے ساتھ اس کا انضمام ہو گیا مہاجر مسلمانوں کی جانب سے اس تحریک کا خیر مقدم ہونے لگا یہاں تک کہ ۱۹۷۶ء میں جب ایک جلسے میں وریث الدین نے اعلان کیا کہ اس کے باپ کی تمام تعلیمات غلط تھیں تو اس وقت سے اس تحریک کا بین الاقوامی پیمانے پر اعتراف کیا جانے لگا۔ وریث الدین کو ادائیگی حج کے لئے مکہ آنے کے خواہشمند امریکی مسلمانوں کی سفارش کا کام سونپا گیا اور امریکہ میں دعوت اسلامی کا کام کرنے کے لئے متعدد خلیجی ممالک کے قائم کردہ فنڈ کا اسے ذمہ دار بنایا گیا۔

لیکن وریث الدین کی یہ تبدیلیاں امۃ الاسلام کے تمام کارکنوں کے لئے قابل قبول نہ ہوئیں چنانچہ ایک گروہ نے لوئیس فراخانہ کی قیادت میں امۃ الاسلام کے نام سے اپنی جماعت قائم رکھی اور سیاہ فام نسل پر سفید فام کے مظالم کی بنیاد پر افرو امریکیوں کے لئے مستقل حکومت کے قیام کا مطالبہ اپنا نصب العین بنایا۔ دونوں تنظیموں کے بنیادی مقاصد اگرچہ قریب قریب ہیں لیکن ان کے دائرۂ کار اور طریقۂ عمل میں بین اختلاف ہے۔ دونوں تنظیمیں افریقی النسل امریکی مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندگی کر رہی ہیں لیکن باوجود یکہ وریث الدین نے

۱۹۸۳ء میں تنظیم کی قیادت سے علیحدگی اختیار کرلی ہے مگر چونکہ یہ تنظیم دوسری اسلامی جماعتوں کے ساتھ تعاون کر رہی ہے اس لئے اسے فرا خان کی جماعت امۃ الاسلام پر واضح برتری حاصل ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے مالی تعاون سے شمالی نیوجرسی میں ایک اسلامی مرکز بھی قائم ہو گیا ہے اور ایک اسلامی درس گاہ کے ذریعہ نئی نسل کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اس کے علاوہ افرو امریکیوں میں سے ہدایت یافتہ مسلمانوں نے متعدد چھوٹی چھوٹی تنظیمیں قائم کر لی ہیں مثلاً الحرکۃ الحنفیہ، انصاراللہ اور الحزب الاسلامی شمالی امریکہ وغیرہ۔ ان کی قیادت الیجاہ محمد کے سابق متبعین کر رہے ہیں۔

سفید فام مسلمان :۔ امریکہ میں قبول اسلام صرف افریقی باشندوں ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ سفید فام نسل بھی اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہے چنانچہ بہت سے مسلم قائدین کا خیال ہے کہ اس وقت امریکہ میں سفید فام مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار سے پچھتر ہزار ہے اس میں اکثریت عورتوں کی ہے۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ عورتوں کی بڑی تعداد شادی کے دوران یا شادی کرنے کے لئے اسلام قبول کرتی لیکن اعداد و شمار کی روشنی میں یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ وہ شادی سے قبل ہی اسلام قبول کر چکی ہوتی ہیں۔ بہت سی عورتوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا سبب یہ بتلایا ہے کہ وہ اسلام میں عورت کا کردار اور مرتبہ اس سے کہیں بلند و برتر پاتی ہیں جو انھیں امریکی معاشرہ میں حاصل ہے۔

امریکی مسلمانوں کی مشکلات :۔ امریکہ میں مسجد کی حیثیت چرچ کی سی ہو گئی ہے۔ مسجد ہی میں نکاح وطلاق معاملے انجام پاتے ہیں۔ وہیں نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے اسی میں دینی محفلوں اور جلسوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ چندے جمع کئے جاتے ہیں امداد و خیرات طلب کی جاتی ہے اجتماعی دعوتیں ہوتی ہیں امریکہ میں ائمہ مساجد کا کام صرف نماز پڑھانا اور قرآن وسنت کی تعلیم دینا ہی نہیں ہے بلکہ وہ پادریوں کی طرح معاشرہ میں بہت سرگرم کردار انجام دیتے ہیں۔ بہت سی مسلم جماعتوں نے سودی قرض لے کر مسجد کی تعمیر کی ہے جو اسلام میں جائز نہیں۔ امریکی مسلمانوں کو اس وقت متعدد مشکلات کا سامنا ہے مثال کے طور پر امریکی سول قانون اور اسلامی شریعت میں طلاق، نفقہ، میراث، اسقاط اور دوسر قوانین میں تعارض ہے۔ امریکی قانون ان چیزوں کو مذہب سے الگ سمجھتا ہے۔ جبکہ اسلام میں وہ مذہبی تعلیمات کا جزو ہیں۔ اس لئے دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

امریکہ میں کام کے دوران مسلمانوں کو پنجوقتہ نمازوں کی ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے۔ جمعہ کی نماز، امریکی لباس، غیر مسلموں سے نکاح، خنزیر کا گوشت اور اس سے تیار شدہ چیزیں۔ ان چیزوں کے سلسلہ میں امریکی

مسلمان مشکلات کا شکار ہیں۔ یہ تو علمی پہلو سے ہوا۔ فکری اعتبار سے مسلمان اپنے آپ کو ایسے خالص مادی نظریۂ حیات کے درمیان پاتے ہیں جو معاشرہ کے بجائے فرد کو اہمیت دیتا ہے اور جہاں آوارگی کے سبب خاندانی نظام کی چولیں ڈھیلی ہو رہی ہیں۔ انھیں مشکلات پر قابو پانے کے لیے مسلمانوں نے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لئے متعدد مدارس قائم کر رکھے ہیں۔

امریکی مسلمان ذرائع ابلاغ کے زبردست پروپیگنڈا کا بھی شکار ہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ اسلام کو دہشت گردی کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ امریکہ میں مسلمانوں کے ساتھ واضح امتیاز برتا جاتا ہے اعلیٰ مناصب پر فائز لوگ امریکہ کو یہودیوں اور عیسائیوں کا ملک قرار دیتے ہیں۔ مشنریاں کہتی ہیں کہ اسرائیل کی صورت میں مسیح علیہ السلام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے اسی وجہ سے مسلمان اسرائیل کی مدد کو یہودیوں اور عیسائیوں کی مشترکہ سازش کا ایک حصہ سمجھتے ہیں انھیں شدید احساس ہے کہ وہ دینی معاشرہ پر عمل کرنے کی پوری آزادی سے محروم ہیں اور ان کے ساتھ دوسروں کے مساوی سلوک نہیں کیا جاتا۔ امریکہ میں مذہبی اداروں کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو اپنے عقیدہ پر عمل کرنے کے تمام مواقع حاصل ہیں اور انھیں پوری آزادی حاصل ہے۔ باوجود یہ کہ امریکہ میں مذہب کا احترام کیا جاتا ہے لیکن مسلمان اپنے دین پر عمل کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرتے ہیں۔ امریکی یونیورسٹیوں میں غیر ملکی طلبہ کے ساتھ ظلم و زیادتی کا رویہ اپنایا جاتا ہے جس کے ردعمل میں وہ بسا اوقات بعض دہشت گرد تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مسلم تنظیمیں :۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ میں مسلم مہاجرین نے متعدد تنظیمیں قائم کیں ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں۔

(۱) اتحاد الجمعیات الاسلامیہ (FEDRATION OF ISLAMIC ASSOCIATIONS) یہ ان ابتدائی تنظیموں میں سے ہے جو پورے امریکہ میں کام کرتی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں امریکہ اور کینیڈا کے مختلف اسلامی مراکز سے مسلمان شریک ہوئے اس جلسہ میں اسلامی عقیدہ کی حفاظت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی اشاعت کی غرض سے اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ آج کل یہ تنظیم سالانہ کانفرنس منعقد کرتی ہے STAR نامی ایک رسالہ نکالتی ہے اور مذہب اور مسلمانوں کے خلاف پیدا کئے جانے والے شبہات کا جواب دیتی ہے۔

(۲) رابطہ عالم اسلامی (جس کا قیام ۱۹۶۲ء میں مکہ مکرمہ میں ہوا تھا) اس نے اپنا ایک مرکز نیویارک میں قائم کیا ہے جو امریکہ میں بہت سرگرم عمل ہے۔ یہ مرکز قرآن کریم اور اسلامی لٹریچر مفت تقسیم کرتا ہے۔ مسلمان قیدیوں کی دینی ضرورتیں پوری کرتا ہے، مختلف اسلامی تنظیموں کی مالی امداد کرتا ہے اور مساجد کے لئے ائمہ بالخصوص عرب ائمہ کا انتظام کرتا ہے۔

(۳) جمعیۃ الطلبۃ المسلمین (MUSLIM STUDENTS ASSOCIATION) اس وقت یہ امریکہ

کی سب سے بڑی اور سب سے سرگرم تنظیم ہے۔ اس کا قیام ۱۹۶۳ء میں سعودی حکومت کے تعاون سے اس وقت ہوا تھا جب جمال عبدالناصر کے تعاون سے امریکی یونیورسٹیوں میں عرب قومیت کے نظریہ پر مبنی جمعیۃ الطلبۃ العرب ARAB STUDENTS ASSOCIATION) کا قیام عمل میں آیا تھا۔ خلیجی ممالک میں پٹرول کی آمدنی کے بڑھ جانے کے سبب ان ممالک سے کثیر تعداد میں طلبہ امریکہ آنے لگے تو یہ تنظیم بھی وسعت اختیار کر گئی۔ اس وقت یہ تنظیم اسلامی تعلیمات کی اشاعت میں سرگرم ہے اسلامی ادارے قائم کرتی ہے۔ ان میں مسلم طلبا کی ٹریننگ کرتی ہے اور تمام مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشاں ہے۔ ان کے علاوہ دوسری متعدد تنظیمیں اور ادارے (مثلاً الاتحاد الاسلامی امریکہ (ISNA) الجمعیۃ الاسلامیہ الطبیۃ، جمعیۃ علماء الاجتماع المسلمین جمعیۃ العلماء والمہندسین، مجلس المساجد، المعہد العالمی للفکر الاسلامی وغیرہ) سرگرمی سے کام کر رہے ہیں

غیر ملکی مسلم طلبہ : امریکہ میں ایک بڑی تعداد غیر ملکی طلبہ کی ہے۔ یہ اگرچہ امریکی مسلمانوں میں سے نہیں ہیں لیکن ان کی زندگی میں اہم کردار انجام دیتے ہیں اور ان میں اسلامی تشخص پیدا کرنے کا موثر ذریعہ بنتے ہیں۔ کچھ ممالک کے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ۱۹۸۲ء میں تقریباً دس ہزار سعودی عرب اور تیس ہزار ملیشیا کے طلبہ تھے اور ۱۹۸۰ء میں پچاس ہزار ایرانی طلبہ تھے۔ امریکہ میں غیر ملکی مسلم طلبہ کا مجموعی تخمینہ کم از کم ڈیڑھ لاکھ اور زیادہ سے زیادہ سات لاکھ پچاس ہزار ہے۔

موجودہ صدی کی پانچویں دہائی سے تیسری دنیا کے مختلف ممالک سے کثیر تعداد میں مسلم طلبہ ولایات ہائے متحدہ میں ٹریننگ اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں اس طرح مساجد اور ان سے ملحق اسلامی مراکز کے ساتھ ساتھ متعدد یونیورسٹیاں مختلف مذاہب اور نقطہائے نظر کے درمیان غور و فکر اور مناظروں کا اسٹیج فراہم کرتی ہیں۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ متعدد تنظیموں سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ان تنظیموں میں سے کچھ ملیشیا کی آبیم (حرکۃ الشباب المسلم) کویت کی جمعیۃ الاصلاح پاکستان کی جماعت اسلامی اور سوڈان کی اخوان المسلمون کے مثل معتدل ہیں اور کچھ جماعۃ التکفیر والہجرۃ اور حزب اللہ کی طرح انتہا پسند ہیں۔ ان طلبہ نے امریکہ میں مختلف قومیتوں کے طلبہ کے درمیان روابط قائم کر رکھے ہیں اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر اسلامی حکومت یا عالمی اسلامی نظام کے لئے کام کرنے والوں سے تعلق استوار کر رکھا ہے۔

امریکی مسلمانوں کو جوں جوں اپنے تشخص کا احساس ہوتا جا رہا ہے وہ اس دن تک انتظار کرنے لگے ہیں۔ —— —— جب لوگ امریکہ کو پروٹسٹنٹ، کیتھولک، یہود اور مسلمانوں کا برابر درجے کا پناہ دہندہ سمجھنے لگیں گے۔ اس وقت تک مسلمان امریکی سیاست میں بحیثیت ایک گروہ کے کوئی فعال کردار ادا نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن وہ ان قوتوں کو سمجھنے لگے ہیں جو امریکہ کے جمہوری نظام کو چلاتی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب انھیں اس نظام میں شرکت حاصل ہوگی اور ان کا وجود تسلیم کیا جانے لگے گا۔

اسلامک سینٹر ویلور

ریاست تامل ناڈو میں اشاعتِ اسلام کا نقیب

اسلامک سینٹر ویلور گذشتہ ۹ سالوں سے ریاست تمل ناڈو کے طول وعرض میں اسلام کے پیام رحمت کو عام بندگانِ خدا تک پہنچا رہا ہے۔ نومسلم بھائیوں کی تعلیم وتربیت کرنے اور انھیں سماجی اور اخلاقی لحاظ سے اونچا اٹھانے کی خدمت میں مصروف ہے۔ خدا کے فضل سے دسمبر ۱۹۹۶ء تک دو ہزار سے زائد نومسلم مردوں عورتوں اور بچوں کو سینٹر میں داخلہ دیا گیا۔ تعلیم وتربیت کے علاوہ ان کے قیام وطعام اور دیگر ضروریات کا بھی سینٹر نے نظم کیا ہے۔ ۵۰۰ سو سے زائد طلبا نے سینٹر میں چھ ماہ قیام کرکے مکمل استفادہ کیا ہے۔ بقیہ طلبہ نے بھی دو چار مہینے قیام کرکے بڑی حد تک فکری اور عملی تربیت پائی ہے تقریبا ۱۵۰ ڈیڑھ سو طلبہ دیگر مدارس دینیہ میں داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

نیز امسال ہائی اسکول میں پڑھتے ہوئے طلبہ کو دینی تعلیم دلانے کا نظم کیا گیا اور ان کی تعلیم اور قیام وطعام وغیرہ کے اخراجات سینٹر نے برداشت کئے اس نظم کے تحت بحمداللہ ۵ طلبہ ۱۰۳۰۱ میں زیر تعلیم ہیں وکیشن میں ہائی اسکول اور 2+ کے مسلم ونومسلم طلبہ کے لئے خصوصی تربیتی کیمپ کا نظم کیا گیا۔ علاوہ ازیں طالبات کو ٹیلرنگ سکھانے کا نظم کیا گیا ہے اور چند مستحق طالبات کو مشین بھی دلائی گئی ہے۔ اسلام کے سایۂ رحمت میں جگہ پانے والی بستیوں میں سے ۱۴ چودہ نومسلم بستیوں میں مساجد کا انتظام اور اماموں کے تقرر کی ذمہ داری سینٹر نے قبول کی ہے۔ یہ امام ان بستی والوں کی علمی اور اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے کام میں مصروف ہیں۔

ہمارے کارکنوں نے (مرد اور خواتین نے) کبھی فرداً فرداً کبھی وفد کی شکل میں مختلف بستیوں کے دورے کئے اور حق پسندوں سے روابط رکھے خدا کا فضل کہ ان کوششوں کے اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اور ہزاروں اللہ کے بندے دینِ حق سے واقف اور متاثر ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ خدا انھیں دینِ حق کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے۔

دردمندانِ انسانیت اور محبانِ اسلام سے درخواست ہے کہ اس دینی خدمت میں سینٹر کا ہر ممکن تعاون فرماکر اجرِ آخرت کے اور خوشنودیٔ رب کے مستحق ہوں۔ آنے والے مبارک ماہ "رمضان" میں زکوۃ وصدقات اور عطیہ جات روانہ کرنے کی آپ سے درخواست ہے۔

فقط والسلام عبدالحفیظ رحمانی عفی عنہ

ڈرافٹ اس نام سے بنائیں:

ISLAMIC CENTER VELLORE

رجسٹری ڈاک سے سینٹر کے پتہ پر روانہ فرمائیں

ISLAMIC CENTER 4. M
4 MADAR SAHIB STREET R.N PALAYAM
VELLORE 632003

اخبار و افکار:-

افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

محمد سعود عالم قاسمی

افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کا مسئلہ عالمی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے، اخبار کے کالم سے لے کر عالمی ایوان سیاست تک اس آٹھ سالہ خونی ڈرامہ کے اختتام کے بارے میں قیاس آرائیوں تبصروں، مذاکروں اور تجاویز کا سلسلہ زور شور سے جاری ہے، پوری دنیا چشم تماشا بنی ہوئی ہے کہ اگلا سین کیا ہے ؟ افغانستان کے لاکھوں معصوم بچوں بے گناہ عورتوں بوڑھوں اور بے بس عوام کو گولہ بارود کے حوالہ کرنے اور لاکھوں کو دردناک مہاجرت کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دینے کے بعد، روس کا یہ اعلان کہ وہ اپنی فوجیں واپس بلائے گا، بہت سے شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سفید ریچھ نے جس سرزمین پر اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے وہاں سے اس کا نکلنا ناممکن ہو گیا۔ مگر اس قابل نفرت قومی روایت کے برخلاف خداوندانِ روس نے یقین دلایا ہے کہ وہ درحقیقت مسئلہ افغانستان کے حل سے دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ اس کے سیاسی اور اقتصادی مضمرات پر سنجیدگی سے غور کرتے رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ۱۵ مئی ۱۹۸۸ء کے بعد وہ افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلالیں گے۔ وہ چیخ چیخ کر عالمی برادری کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ ان کی نیت آئینہ سے زیادہ صاف ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اب انھوں نے اپنی فوجوں کی واپسی کو جنیوا مذاکرات سے وابستہ نہیں کیا ہے۔ جنیوا مذاکرہ ہو یا نہ ہو بہرحال وہ اپنی فوجیں واپس بلا کر ہی رہیں گے۔ ع کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔

مگر معاملہ اتنا سیدھا اور سادہ نہیں ہے جتنا کہ باور کرایا جاتا ہے۔ ابھی بہت سے راز ہائے سربستہ ہیں جن کی نقاب کشائی مناسب وقت پر ہی ہو سکتی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات دو اور دو چار کی طرح درست ہے کہ جس بھیڑیئے کو ایک مرتبہ خون کی چاٹ لگ جائے پھر موت ہی اس کو اس لذت آزار سے آزاد کر سکتی ہے، روسی افواج کا افغانستان سے انخلا ایک ناگزیر عمل ہے

اور روس بے آبرو ہوکر نکالے جانے سے پہلے باعزت اور سرخرو ہوکر نکلنا چاہتا ہے مگر اسے روس کی نیک نیتی پر محمول کرنا ایک احمقانہ خیال ہوگا۔ افغانستان سے روس کی واپسی اس کی داخلی مجبوری بھی ہے اور سیاسی بازیگری بھی۔ کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا۔ کے جی بی کی شہرت یافتہ منصوبہ سازوں، تجربہ کار کمانڈروں، تربیت یافتہ فوجوں، لڑاکا طیاروں اور آتشی اسلحوں کے انبار کے ساتھ جب روس افغانستان میں ترقی کی مشعلیں جلانے کو گھسا تھا تو اس کا حتمی اندازہ یہ تھا کہ ان دیو ہیکل اسباب حرب اور افغانستان میں غلامان روس کی مدد سے وہ جلد ہی افغانستان کو سمرقند و بخارا اور تاجکستان کا ہم قسمت بنا دیگا، اس طرح افغانستان پر سرخ پھریرا لہرا کر عظیم روس کی سرحدیں بحیرۂ عرب تک پھیلا دے گا، اور پوری دنیا سرخ ایشیا کا وجود تسلیم کرے گی۔ مگر اس نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ وہ جس طور پر عظمتوں کو تاراج کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے وہ اگر ٹوٹ کر شکستہ بھی ہو جائیں تو ان کی کرچیاں بدادۂ روس کی آرزوؤں اور امنگوں کو لہولہان کردیں گی۔ احساس برتری کے اندھے دشمن روس نے [illegible] اور ترہ کی اور امین جیسے وفادار غلاموں کی خدمات کو موقوف کرکے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء میں براہ راست کابل کا زمام کار سنبھال لیا۔ اور اس اقتدار کو افغانستان کے عوام سے منوانے کے لئے اپنے روایتی طریقۂ کار پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ علماء اور عوام کا قتل عام ہوا، مکانات اور باغات نذر آتش ہوئے۔ مذہبی اور ثقافتی ادارے بند ہوئے۔ اور کوہسار جلنے لگے۔ لیکن عوام کو زیر کرنے کے یہ سارے توی تجربے ناکام ہوگئے، اور غیور افغان بے سروسامانی اور تنگ دامانی کے عالم میں ظالم روس سے ٹکرانے لگے۔ آگ اور خون کے اس قضیہ کو روسی حکمرانوں نے گھڑی، دو گھڑی کا کھیل سمجھا تھا مگر جب کوہساروں سے صدائے بازگشت تیز ہوئی، مزاحمت طویل اور سخت ہوئی۔ روس کے آتشیں اسلحے حیرت ناک طور پر کم ہونے لگے، تربیت یافتہ روسی افواج کو سرزمین افغانستان نگلنے لگی، اور کمانڈروں کو عقاب اچکنے لگے تو خود روسی علاقوں میں بیداری کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ اور روسی عوام میں اضطراب آیا کریملن میں زلزلہ رونما ہوا، اور حلق میں پھنسی ہوئی اس ہڈی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے مطالبات زور پکڑنے لگے، چنانچہ ارباب حل وعقد نے عواقب پر غور کرکے اپنی فوجوں کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔

فوجوں کی واپسی کا یہ فیصلہ ایک ناگزیر ضرورت ہی سہی مگر ایک بڑی گہری سازش بھی ہے، دراصل روس یہ چاہتا ہے کہ جس ملک کو وہ بذات خود فتح کرنے سے عاجز رہا ہے اب اسے اپنے وفادار غلاموں کے ذریعہ حاصل کرلے اس طرح کہ فوجیں تو واپس بلالے، مگر مشیروں اور سیاسی طالع

آزماؤں کی لمبی قطار چھوڑ جائے، اپنے سارے اسلحے کٹھ پتلی حکومت کے حوالے کر جائے، اور ماسکو میں بیٹھ کر کابل کی تقدیر کا مالک بنا رہے، اس طرح اسلامی افغانستان کو کبھی نہ پنپنے دے اور افغانستان روسی نظام میں بدستور کراہتا رہے جس کے فرمانروا خود افغانستان کے لینن ہوں اور ایک ایسی حکمت عملی کے ذریعہ اپنے مقاصد حاصل کرے جس میں نہ رسوائی کا سامنا ہو اور نہ بدنامی کا خطرہ مول لینا پڑے یعنی ؎ سانپ مرے لاٹھی نہ ٹوٹے

جن لوگوں نے مسلسل آٹھ سال تک روسی غارتگروں کا سامنا کیا اور بارہ لاکھ شہیدوں کی قربانی دیکر اپنی اسلامی غیرت کا تحفظ کیا ہے وہ اس چال کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اب وہ ایسی کوئی غلطی کرنے کے حق میں نہیں ہیں جو اس جہاد مقدس کے آٹھ سالہ دور کو رائیگاں کر دے۔ اور ان لاکھوں شہیدوں کے لہو کو غیر معتبر بنا دے چنانچہ مجاہدین افغانستان نے جہاں روسی فوجوں کی واپسی کے اعلان کا خیر مقدم کیا ہے وہاں انھوں نے ایسے مطالبات بھی رکھے ہیں جو فریقین کی جنگ بندی، مہاجروں کی باعزت اپنے گھروں کو واپسی اور نمائندہ اسلامی افغانستان حکومت کے قیام میں مددگار ہو ورنہ آزادی اور استقلال کی یہ جنگ اس وقت تک وہ لڑتے رہیں گے جب تک ان کے رگوں میں لہو باقی ہے۔ چنانچہ مجاہدین افغانستان کی سات نمائندہ پارٹیوں کے واقعی اجلاس میں واضح طور پر اس کا اعلان کیا گیا کہ روس افغانستان چھوڑنے سے پہلے عبوری حکومت قائم کر دے جو نجیب سرکار کو برطرف کرکے پرامن طریقہ پر اقتدار افغانستان کے منتخب نمائندوں کے حوالہ کر دے۔

روس کے نزدیک عبوری حکومت کے قیام کا مطالبہ ایک غیر ضروری اور جنیوا معاہدہ کو معرض التوا میں ڈال دینے والا قضیہ ہے۔ چونکہ پاکستان اب تک مجاہدین کے اس مطالبہ کی تائید و ترجمانی کرتا رہا ہے اس لئے روس بار بار پاکستان کا حوالہ دیکر اس دخل مقدر سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا رہا ہے اور جنیوا مذاکرات کو امن مذاکرات اور اپنی مبینہ دھاندلیوں کی نشاندھی کو امن مخالف سرگرمیاں قرار دیتا رہا ہے۔ اصل میں روس کی نیت یہ ہے کہ جنیوا معاہدہ کے ذریعہ مجاہدین و مہاجرین کی معاشی اور دفاعی امداد بند کر دی جائے اور نجیب سرکار کو وہ بدستور ترقی یافتہ اسلحوں سے لیس کرتا رہے تاکہ مجاہدین کی مزاحمت رفتہ رفتہ دم توڑ دے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان نے مجاہدین کے موقف کی حمایت کی نوعیت پر نظر ثانی کر لی ہے، اور تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب وہ بھی عبوری حکومت کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر اس پر راضی ہو گیا ہے کہ دونوں فریقوں کی جنگی امداد بند ہو جائے اور مہاجرین باعزت اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ارباب

سیاست کے نزدیک قیام امن کی یہ ناگزیر صورت ہو تاہم یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کے نتائج کسی بھی صورت میں ہمت افزا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ اس معاملہ کو حل کرنے کا اختیار نہ پاکستان کو ہے اور نہ امریکہ کو بلکہ ان مجاہدین کو ہے جو روسی جارحیت کا سامنا کر رہے ہیں۔ مجاہدین روسی حکام اور روسی نظام دونوں کا انخلا چاہتے ہیں اور اس صورت میں حکام تو چلے جائیں گے مگر نظام باقی رہے گا اور یہ ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا اور اگر وہ اس پر راضی ہو جائیں تو اس آٹھ سالہ خونریز تصادم کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ کوئی جواز۔ یا یہ کہا جائے کہ مسئلہ افغانستان کے دو فریق ہیں ایک روسی فوج اور اس کی ضمنی بجبھ حکومت اور دوسرے مجاہدین افغانستان اگر روس واپس جانا چاہتا ہے تو اسے اپنے ضمیمہ کو بھی ساتھ لے جانا ہوگا اس لئے کہ آدھے روس کی واپسی اور آدھے کی موجودگی افغانستان کے تصفیہ کو قیامت تک حل نہیں ہونے دے گی۔ یہ جتنے مکروہ روس کے عزائم ہیں اتنی ہی گہری امریکہ کی چالیں بھی ہیں۔ اور یہ دونوں مل کر ایک ایسی سازش کو وجود دے سکتے ہیں جو مجاہدین کی محنت و مشقت کی میعاد بڑھا دیں افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے خوف سے جتنی گھبراہٹ روس پر طاری ہے اس سے کچھ زیادہ امریکہ پر طاری ہے، امریکہ کی حمایت صرف اور صرف اس معنی کر ہے کہ روس امریکہ کے اثر و رسوخ اور اس کی سرپرستانہ حیثیت کو تسلیم کر لے، اور یہ اسے جنیوا مذاکرات نے عطا کر دیا ہے ورنہ وہ خود بھی نہیں چاہتا کہ افغانستان میں مجاہدین، مہاجرین اور عوام کی مرضی کے مطابق حکومت بنے اس کے مقابلہ میں وہ روس نواز قومی حکومت یا غیر مستحکم مخلوط حکومت کے قیام کو ترجیح دے گا۔ اس لئے جنیوا معاہدہ کا سوانگ قطعی لائق التفات نہیں ہو سکتا۔ روس اگر اس مصیبت سے نجات چاہتا ہے تو وہ مجاہدین سے مذاکرات کرے نہ کہ اس طاقت سے جس کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہ ہو، نیز روس کو چاہئے کہ وہ اپنی فوج، اختیارات، مشیر اور اثرات سب کچھ کے ساتھ واپس جائے اور چونکہ تباہی افغانستان کے آٹھ سالہ تاریک دور کا وہ ذمہ دار ہے اس لئے اس کی یہ ذمہ داری بھی قبول کرے، افغان کا مقبوضہ علاقہ واپس کرے، اور افغانستان کی تعمیر نو کی راہ سے ہٹ جائے اسی میں اس کی نجات ہے۔

اگر "افغانیوں" پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تنقید و تبصرہ :-

دعوت اسلام ایک اہم فریضہ ، مصنف مولانا عتیق احمد قاسمی ،

صفحات ۳۲ ، قیمت پانچ روپیہ ، مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی ۔

مولانا عتیق احمد قاسمی ، صاف ستھرے ذوق کے ابھرتے ہوئے عالم دین ہیں اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں استاذ ہیں ۔ زیر تبصرہ کتابچہ "دعوت اسلام ایک اہم فریضہ" ان کا ایک مقالہ ہے جو کتابچہ کے اکیس صفحات پر مشتمل ہے ، شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ اور قاری محمد طیب صاحب کی کتاب دینی دعوت کے قرآنی اصول سے ایک طویل اقتباس شامل ہیں مولف نے ترغیب دی ہے کہ مسلمان اسلام کی دعوت جیسی اہم ذمہ داری کو محسوس کریں اور دعوتی کام میں لگ جائیں ، انھوں نے بتایا ہے کہ دعوت کی ذمہ داری فرض کفایہ ہے مگر جب کوئی گروہ اس کام کے لئے نہ اٹھے تو پوری امت پر اس کا وبال ہوگا ۔

دعوت دین کے موضوع پر تحریک اسلامی نے ایک بڑا قیمتی لٹریچر فراہم کیا ہے ، دعوت اسلامی ، شہادت حق ، دعوت دین اور اس کا طریق کار ، اسلام کی دعوت ، امت مسلمہ کا نصب العین ، دعوت اسلامی اور مسلمانوں کے فرائض ، معروف و منکر وغیرہ ۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً مولف کی نظر سے یہ کتابیں نہیں گذریں ، کیونکہ مولف نے موضوع بحث کے جن پہلوؤں کو نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے ان کو مذکورہ کتابیں نہایت وضاحت اور تجزیاتی و ترغیبی انداز میں پیش کرتی ہیں خاص طور پر معروف و منکر میں فریضہ دعوت کی نوعیت ، اہمیت اور جامعیت وغیرہ پر تحقیقی انداز میں سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے ، اسے ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے ۔

جن لوگوں نے یہ کتابیں نہیں پڑھیں ہیں ان کے لئے زیر تبصرہ کتابچہ سود مند ہے ۔ اور جنھوں نے پڑھی ہے وہ اسے قند مکرر کے طور پڑھ لیں ۔ خدا کرے جس امید کے ساتھ یہ کتابچہ لکھا گیا ہے وہ پوری ہو اور امت اپنے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی فکر کرے ۔

اتحاد ملت نمبر ، نشاۃ ثانیہ ، اگست و ستمبر ۱۹۸۶ء مدیر عثمان غنی عادل ، صفحات ۱۶۰

قیمت بیس روپے ، مقام اشاعت ۲۰ فرحت اپارٹس جوگیشوری ویسٹ بمبئی (مہاراشٹرا)

نشاۃ ثانیہ بمبئی کا خصوصی شمارہ اتحاد ملت نمبر پیش نظر ہے ۔ اس نمبر میں بہت سی مشہور شخصیات مثلاً

امام ابو حنیفہ، شیخ عبدالقادر جیلانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا الیاس، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا منظور نعمانی، قاری محمد طیب اور آیت اللہ خمینی وغیرہ کے رشحات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ امت کے اختلافات کی حقیقت ان کے اسباب اور دور کرنے کی ضرورت پر متعدد اہل علم کے مقالات، انٹرویوز اور احساسات و تاثرات شامل ہیں۔ قرآن و حدیث کے حسن انتخاب نے شمارہ کو خاص طور پر وقیع بنا دیا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے مدیروں کا یہ کام قابل ستائش ہے۔

ملت کے بکھرے ہوئے شیرازوں کو یکجا کرنے اور مسلمانوں کو باہم متحد کرنے کا کام بہت مقدس ہے۔ اتحاد ملت کا احساس اس قدر فرحت بخش اور وجدانگیز ہے کہ اس لذت سے منافق اور انتشار پسند طاقتیں کبھی آشنا نہیں ہو سکتیں۔ فی الواقع آج مسلمانوں کو جسمانی غذا سے بھی کہیں زیادہ ضرورت باہمی اتحاد کی ہے اس لئے کہ اسی پر ان کی قومی اور اجتماعی زندگی کا انحصار ہے گو یہ ملت کے ہر طبقہ کو اس ضرورت کا احساس ہے مگر اتحاد کا نعرہ لگانے کے باوجود اتحاد کی طرف عملاً کوئی پیش رفت نہیں ہوتی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر گروہ اپنے آپ کو برحق اور دوسرے کو گمراہ یا کم از کم حق سے دور سمجھتا ہے اسی لئے آج مذہبی اور گروہی پیشواؤں کے ہونٹوں پر اتحاد و اتفاق کی پکار ہے مگر ہاتھ میں بے اعتمادی، دل آزاری، دشنام طرازی اور افتراق و انتشار کی تلوار ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اتحاد کا مطالبہ بے سود ہے۔ اتحاد کی واحد شکل یہ ہے کہ ہر گروہ قرآن و سنت کی بنیاد پر اصولی چیزوں میں اتحاد پیدا کرے اور فروعی چیزوں میں آزادی اور فراخ دلی کا طریقہ اپنائے، اپنے فروعی نظریات کا اظہار کرے تو بنیادی شرافت اور احترام آدمی کی سطح سے نیچے نہ اترے اور ایک دوسرے کی موافقت و مخالفت میں عدل اور اعتدال سے کام لے اتحاد ملت میں بعض ایسے قلم کار موجود ہیں جن کے خیالات اور ذاتی رویوں میں صریح تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ دوسروں سے جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں اپنے آپ کو اس کا مخاطب نہیں سمجھتے۔

مسعود عالم ندوی

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب	آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں
ہیچ ہے میری نظر میں آشیاں اور گلستاں	آدمی ہوں عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

(حفیظ میرٹھی)

جلد ۹ | مئی ۱۹۸۸ء رمضان المبارک، شوال ۱۴۰۸ھ | شمارہ ۵

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط وکتابت کا پتہ: مدیر "زندگی نو" پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے: منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا فون: ۲۷۳۳۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

اشارات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلط فہمیاں فسادات کو جنم دیتی ہیں

سید جلال الدین عمری

ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہماری ملکی زندگی کا ایک معمول بن گئے ہیں۔ ہر چند دن بعد اس نوعیت کا کوئی نہ کوئی فسادہ ورہوتا ہے۔ ان فسادات کے نتیجہ میں مجرم اور غلط کار تو شاید ہر طرح کے نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں البتہ بہت سی بے قصور اور معصوم جانیں ضائع جاتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے معصوم بچے یتیم ہو جاتے ہیں، ماؤں کی بھری گودیں خالی ہو جاتی ہیں، جوان عورتوں کا سہاگ لٹ جاتا ہے، بوڑھے ماں باپ بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ عفت وعصمت داغ دار ہو جاتی ہے اور عزت وآبرو لٹتی ہے جہاں تک مالی نقصان کا تعلق ہے وہ کروڑوں اور اربوں کا ہوتا ہے۔ فسادات کے بعد کے اثرات زیادہ تر اس طبقہ کو بھگتنے پڑتے ہیں جس کا فسادات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جو ان سے دور رہنا چاہتا ہے اور عملاً دور رہتا ہے۔

حکومت پر امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن اس نے ہمیشہ اس معاملہ میں مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ فسادات پر قابو پانے کی اس کی طرف سے بروقت کوشش نہیں ہوتی۔ مقامی حکام پر غفلت اور جانب داری کے الزامات بار بار لگائے جاتے رہے ہیں، لیکن عام طور پر اس کی تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی پی۔ اے سی امن بحال کرنے کے لیے متعین کی جاتی ہے لیکن وہ صاف طور پر جانب داری برتتی ہے اس کے ظلم اور بربریت کے واقعات اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ اس پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ فسادات سے متعلق تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جاتے ہیں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

ان فسادات کو بہت سے نادان افراد اور خود غرض سیاسی لیڈر مستقل ہوا دیتے رہتے ہیں اخبارات اور پریس کا رویہ بھی کچھ کم اشتعال انگیز نہیں ہوتا بلکہ اس کا ماحول تیار کرنے اور بوقت ضرورت بارود کو فتیلہ دکھلانے میں وہ پیش پیش رہتا ہے۔ ان ہی سب اسباب کی وجہ سے فسادات بار بار بھڑکتے ہیں اور دونوں قوموں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فسادات اپنی

کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بڑھ رہے ہیں اور اسی تناسب سے ان کے بھیانک نتائج بھی سامنے آچکے ہیں۔ ان فسادات کو روکنے کی کوشش نہیں کی گئی تو یہ دونوں قوموں کے لیے سخت تباہ کن ہوں گے۔ آئندہ کا مؤرخ ہندوستان کی تاریخ کو باہمی کشمکش اور تصادم کی تاریخ کی حیثیت سے پیش کرے گا اور اس بات پر اپنے صدمہ اور دکھ کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس ناسور نے اتنے بڑے ملک کو زہر آلود کر رکھا تھا اور اس کا ایک ایک گوشہ اس کے اثرات سے کراہ رہا تھا لیکن وہ اس کا علاج ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ اسے ساری دنیا کی فکر تھی اور وہ ہر ایک کے غم میں بے چین نظر آتا تھا لیکن اس نے اس سنگین مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جس سے اس کا اپنا گھر اجڑ رہا تھا۔

فسادات میں جان، مال اور عزت و آبرو جس طرح لٹتی ہے، اس سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی، مذہب، اخلاق اور تہذیب و شرافت کی توہین ہے۔ یہ وہ کوتاہی ہے جس کی تلافی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اس پر تو ہر باضمیر انسان کو تڑپ اٹھنا چاہئے اور اس بات کا حلف لینا چاہئے کہ وہ اپنے حدود میں آئندہ کبھی فساد ہونے نہیں دے گا اور اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار رہے گا۔ لیکن افسوس کہ اس ملک کے معاشی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی غرض ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر سوچنے اور لکھنے بولنے والے تو بہت ہیں لیکن فسادات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہی پر صحیح رخ سے سوچنے والے بھی کم ہی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جن میں اظہار حق کی جرأت ہو اور جو صحیح بات کہہ سکتے ہوں۔

ہندو مسلم فسادات اس ملک کی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے درمیان ہوتے ہیں۔ اکثریت اس بات پر خوش ہوتی ہے کہ ان فسادات میں اقلیت کا زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ کبھی اکثریت کا زیادہ نقصان ہوتا ہے تو اقلیت خوشی محسوس کرتی ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ نہیں پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ مرنے والوں میں ایسے استاد ڈاکٹر، وکیل، تاجر، صنعت کار اور ماہرین علم بھی ہو سکتے ہیں جو صرف اپنے گروہ کے لئے نہیں پورے ملک کے لیے سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہوں، اور ان کے وجود سے پورے معاشرہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ کیا ان کی جان لے کر اس لیے خوشی منائی جا سکتی ہے کہ ان کا کسی خاص گروہ سے تعلق ہے؟ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں کمانے والے ایک ایک فرد کی اہمیت ہے۔

خاندان میں ایک فرد کماتا ہے اور پانچ دس افراد کا اس پر معاشی انحصار ہوتا ہے۔ اس ایک فرد کے ختم ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ پورا خاندان بے سہارا ہو گیا اور ذمہ داریوں میں اسی تناسب سے اضافہ بھی ہوا۔ اگر ملک ان ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے تو اس کے اور زیادہ شدید نتائج نکل سکتے ہیں۔ ہندو مسلم دشمنی کے جذبہ کی وجہ سے بعض اوقات آدمی یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا کہ ان فسادات کا ملکی معیشت پر کتنا تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ مکانوں اور دکانوں، کارخانوں اور ضروریات زندگی کے ذخیروں کو نذر آتش کرنا، ملکی دولت کو آگ لگانے کے ہم معنی ہے۔ اس پر وہی شخص مسرت محسوس کر سکتا ہے جو جذبات میں اندھا ہو چکا ہو اور جسے ملکی مفاد سے کوئی دل چسپی نہ ہو۔

دونوں قومیں شدید غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے ماحول میں جی رہی ہیں۔ ہر فریق دوسرے سے خوف وہراس محسوس کرتا ہے۔ اس ماحول میں کسی بھی طرف سے ذرا سی اشتعال انگیزی بسا اوقات بڑے بڑے فساد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

جب تک یہ غلط فہمیاں دور نہ ہوں، فسادات کا سلسلہ شاید رک نہیں سکتا۔ مسلمانوں کو یہاں کے ہندو بھائیوں کے بارے میں جو شبہات اور خدشات ہیں انھیں ان کا کوئی نمائندہ ہی دور کر سکتا ہے البتہ مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کے ذیل میں بعض باتیں عرض کی جارہی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی بعض شکایات کا بھی ذکر کیا جارہا ہے تاکہ سنجیدگی سے ان پر غور کیا جا سکے۔

ایک بڑی غلط فہمی، جسے صریح الزام کہنا چاہئے یہ ہے کہ سارا بگاڑ اسلام کا ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی ہے۔ وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف ابھارتا ہے اور رواداری اور محبت کی جگہ تعصب، نفرت اور بے زاری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو مستقل حالت جنگ میں رکھتا ہے اور تصادم اور ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس بارے میں قرآن و حدیث میں واضح ہدایات ہیں۔ ان ہدایات کے رہتے ہوئے دونوں قومیں اتحاد و اتفاق اور محبت و یگانگت کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔

یہ الزام اس کتاب پر لگایا جاتا ہے جس نے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگزر کی تعلیم دی ہے، جو اپنے ماننے والوں کو صبر کی تاکید اور تحمل و برداشت کی تلقین کرتا ہے۔ صبر کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی حق و صداقت پر ثابت قدم رہے اور مخالفین کے سخت سے سخت رویہ کے باوجود جذبات میں مشتعل یا بے قابو نہ ہو۔ یہ تعلیم قرآن مجید کے صفحات پر اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ

ایک عام قاری کی نگاہ سے بھی اوجھل نہیں رہ سکتی، لیکن اس کے باوجود اسلام سے بدگمان کرنے اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے ان احکام کا سہارا لیا جاتا ہے جو خاص حالات میں اسلامی ریاست کو دیے گئے ہیں۔

ایک اسلامی ریاست امن اور جنگ دونوں حالتوں سے دوچار ہو سکتی ہے، ان دونوں کے احکام الگ ہیں۔ اگر اسلامی ریاست کے لیے جنگ ناگزیر ہو جائے ——— قرآن مجید نے جنگ کے اسباب سے بھی بحث کی ہے اور امن کے شرائط سے بھی ——— تو اس کی ہدایت ہے کہ بامردی اور ہمت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور بزدلی اور پست ہمتی نہ دکھائی جائے اسلامی ریاست کو حالت جنگ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے بارے میں یہ سمجھنا یا سمجھانے کی کوشش کرنا بڑی زیادتی ہے کہ ہر فرد ان کا مخاطب ہے اور جس کا جی چاہے اور جب چاہے، جنگ کا اعلان کر سکتا ہے۔ دنیا کے ہر دستور میں جنگ سے متعلق ہدایات ہوتی ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنا ریاست کا کام ہوتا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہ کی جائے اور کی جائے تو کب کی جائے اور کب ختم کی جائے! ریاست کے اس اختیار کو افراد اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں احساس برتری ہے اور یہی چیز ان کو اتحاد اور یگانگت سے دور رکھتی ہے۔

مسلمانوں کے احساس برتری کا مطلب اگر یہ ہے کہ انھیں اسلام کی تعلیمات اس کے اقدار، اس کی تہذیب، اس کے علوم و فنون اور دنیا پر اس نے جو احسانات کیے ہیں ان پر ناز ہے اور وہ انھیں برتر سمجھتے ہیں تو اس کی کسی کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ ہر قوم کو اپنے مذہب اور تہذیب پر ناز ہوتا ہے۔ ہندو قوم کو بھی اپنے قدیم ورثہ، اپنی سنسکرتی اور اپنے علوم و فنون پر ناز ہے وہ اپنے پوروجوں کی بزرگی اور عظمت کے چرچے کرتی ہے اور ان کے کارناموں کو فخر کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس کا اسے حق حاصل ہے البتہ کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اپنی تہذیب اور کلچر دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرے یا ان سے اپنی تہذیب سے دست بردار ہو جانے کا مطالبہ کرے۔ اسے تہذیبی جارحیت کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی کسی جارحیت کا جذبہ مسلمانوں میں نہیں ہے البتہ انھیں یہ شکایت ہے کہ وہ تہذیبی جارحیت کا شکار بنائے جا رہے ہیں اور انھیں اپنے ماضی سے بیگانہ بنانے اور اس سے کاٹ دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس شکایت کو دور کرنا یہاں کی اکثریت کا کام ہے۔

مسلمانوں کے احساس برتری کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ انہوں نے یہاں کئی صدیوں تک حکومت کی ہے اس لیے ان کی نفسیات حکمرانوں کی نفسیات بن گئی ہیں۔ وہ ذہنی طور پر دوسروں کو مساوی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس وجہ سے ان کے ساتھ ان کا رویہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔

یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کی زد خود یہاں کی اکثریت پر پڑتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے لیکن اس سے پہلے ایک طویل عرصہ تک یہاں کی اکثریت کو حکومت و اقتدار حاصل رہا ہے۔ اس میں بڑے بڑے بادشاہ پیدا ہوئے۔ بڑی خدمات انجام پائیں اور ہندوستان کو متحد اور مضبوط بنانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ یہ ساری چیزیں اکثریت کے اندر بھی احساس برتری پیدا کر سکتی ہیں۔ جہاں تک آزادی کے بعد کے دور کا تعلق ہے اس میں اکثریت ہی عملاً حکومت کے دروبست پر قابض ہے۔ اس وجہ سے ان کے اندر احساس برتری کا پایا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اکثریت کے اندر فی الواقع اپنی برتری کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ حکومت کے نشہ میں بے اعتدالیاں کر رہی ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اس ملک میں وہ حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے۔ قتل و خوں ریزی کی۔ یہاں کی آبادی کو بزور شمشیر مسلمان بنایا۔ ان کے مندروں کو مسمار کر کے مسجدوں میں تبدیل کر دیا۔ اس سے اقتدار چھینا اور انہیں محکوم بنائے رکھا۔ غرض یہ کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں ظلم کی ایک تاریخ مرتب کر دی۔

یہ شکایت دراصل مسلمان سلاطین اور بادشاہوں سے ہے۔ لیکن اسے اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے پوری قوم سے شکایت ہو۔ حالانکہ اگر یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ کسی قوم کے فلاں گروہ نے غلطی کی ہے تو اس کے لیے پوری قوم کو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ اسی نوعیت کی شکایت ہے جس نوعیت کی شکایت یہاں کے دروڑوں کو آریوں سے ہے لیکن ہم فی الحال اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اس کی شکایت صحیح ہے یا غلط اور انہیں شکایت کا حق ہے یا نہیں۔ البتہ مسلمان سلاطین سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہیں گے۔

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین سب کے سب فرشتہ صفت تھے اور ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ ان سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے ظلم و ستم کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں تاریخ سے ان میں سے بیشتر کا ثبوت

فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ داستانیں مسلمانوں کی تاریخ کو داغدار بنانے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کے بیج بونے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ ان کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینا اور ان پر اصرار کرنا ایک ناپاک مقصد میں تعاون کرنا اور دشمن کے منصوبہ کو کامیاب بنانا ہے۔

ان بادشاہوں نے عدل و انصاف، رواداری، غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت، ان کے مذہب کی آزادی اور اس کے احترام کی بھی شاندار مثالیں قائم کی ہیں۔ انتظامی معاملات میں عدم تعصب اور فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ غیر مسلموں کو اعلیٰ مناصب عطا کیے ہیں۔ جنگی مہمات میں ان پر اعتماد کیا ہے اور اتنے بڑے پیمانہ پر جاگیروں اور عطیوں سے نوازا ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی مورخ آسانی سے انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان کی یہ خوبیاں واقعہ یہ ہے کہ آج کے دور جمہوریت کے لیے بھی نمونہ بن سکتی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان بادشاہوں کے کمزور پہلوؤں کو دیکھنے کی جگہ ان کی ان ہی خوبیوں کو دیکھنا چاہیے اور انہیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض لوگ بہت ہی سادہ لوحی کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان اپنے سلاطین سے برأت اور بے زاری کا اعلان کر دیں۔ ظاہر ہے یہ اعلان برأت ان کی مفید خدمات سے تو نہیں ہو سکتا، ان کے غلط کاموں سے ہوگا۔ اس کے لیے ان الزامات کی چھان بین کرنی ہوگی جو ان پر لگائے جاتے ہیں۔ یہ تحقیق صرف مسلمان حکمرانوں کے عہد حکومت ہی کی نہیں ہوگی بلکہ ہندوستان کی پوری تاریخ کی ہوگی جو ہزارہا سال کی مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہاں کے کسی بھی حکمراں نے کسی قوم یا گروہ کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی کی تھی تو اس سے اس کی قوم اپنی بے زاری اور برأت کا اعلان کرے گی۔ اس طرح کا مطالعہ پوری تاریخ کو داغدار بنا کر رکھ دے گا، اس لیے کہ کوئی بھی قوم اپنی معصومیت اور بے گناہی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس سے کوئی اخلاقی اور سماجی فائدہ تو نہیں حاصل ہوگا البتہ ہر قوم اس احساس میں مبتلا ہو جائے گی کہ اس نے بڑے بڑے مجرم پیدا کیے ہیں اور آج ان کی غلطیوں کی اس سے توبہ کرائی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی زندہ قوم اس ذلت کو گوارا نہیں کر سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ سبق حاصل کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے تاکہ ماضی میں جو غلطیاں یا فروگذاشتیں ہوئی ہیں ان سے بچنے کی کوشش کی جائے اور جو خوبیاں موجود تھیں انہیں جہاں تک ہو سکے اختیار کیا جائے۔ تاریخ کے مطالعہ کا یہ مقصد کبھی نہیں ہوتا کہ جن افراد سے ماضی میں غلطیاں ہوئی تھیں صدیوں کے بعد ان کی قوموں کو ان پر نشانۂ ملامت بنایا جائے یا اس کا حساب کتاب چکایا

جائے. اس طرح پوری دنیا حساب دینے اور حساب لینے میں لگ جائے گی.

اس ملک کی اکثریت کو جس طرح یہاں کے مسلم حکمرانوں سے شکایت ہے اسی طرح عام مسلمانوں سے بھی شکایات ہوسکتی ہیں اور ہیں، لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان شکایات کے نتیجہ میں اسلام سے ہی سوءظن اور بدگمانی پائی جاتی ہے. اس بات سے قطع نظر کہ یہ شکایتیں صحیح ہیں یا غلط، ان کی بنیاد پر اسلام سے بدگمان ہوجانا صحیح نہیں ہے.

اسلام کچھ اصول ونظریات کا نام ہے. یہ ایک آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) ہے. مسلمان اس کے ماننے والے (BELIEVERS) ہیں. ضروری نہیں کہ کسی نظریہ کے ماننے والوں کا عمل اس کے عین مطابق ہو. ان کی زندگی میں اس سے انحراف بھی پایا جاسکتا ہے اس انحراف کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں. اس کے باوجود ان پر اس پہلو سے تنقید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس نظریہ کے تقاضے نہیں پورے کررہے ہیں لیکن ان کے انحراف سے اس نظریہ کو ہدف تنقید نہیں بنایا جا سکتا. اسلام کے ماننے والوں میں بھی بہت سی خامیاں ہیں. ان کی یہ خامیاں ان کی غفلت اور کوتاہی کا ثبوت ہیں. یہ اسلام کی کسی خامی کا ثبوت نہیں ہیں.

یہی معاملہ مسلمان حکمرانوں اور فرماں رواؤں کا ہے. وہ اسلام کے مکمل نمائندے نہیں تھے ان کے بہت سے کام اسلام کے مطابق ہوتے تھے اور بہت سی چیزیں اسلام کے خلاف بھی ان کی زندگیوں میں پائی جاتی تھیں جو لوگ ان سے شاکی ہیں وہی لوگ مسلمان علماء صلحاء اور صوفیاء سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، جن کو بڑی حد تک ہم اسلام کے نمائندے کہہ سکتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شکایتیں سیاسی نوعیت کی ہیں. اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن جب فتنہ وفساد کی آگ بھڑکتی ہے تو آدمی اس سادہ سی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اسلام بھی اس تنقید کی لپیٹ میں آجاتا ہے.

یہاں مسلمان سلاطین اور ہندو راجاؤں کے درمیان جو جنگیں ہوئیں بعض اوقات انہیں کفر واسلام کی جنگوں کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے. یہ صحیح نہیں ہے. یہ جنگیں نہ تو ہندو مت کے بچاؤ اور تحفظ کے لیے لڑی گئیں اور نہ اسلام کی سربلندی ان کا مقصد تھا. یہ ملک گیری اور اپنی سلطنتوں کی توسیع اور استحکام کے لیے لڑی جاتی رہیں. یہ کبھی ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے درمیان ہوئیں، کبھی خود مسلمان بادشاہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے اور کبھی دونوں طرف ہندو راجا تھے. ان جنگوں کو ہندو مت اور اسلام کی جنگیں قرار دینا

اور پھر ان کی روشنی میں اسلام یا ہندومت کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا صریح زیادتی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس طرح کی اور بھی غلط فہمیاں ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو دور ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر نہ تو اسلام کو صحیح شکل میں سمجھا جاسکے گا اور نہ مسلمانوں کے بارے میں یہاں کی اکثریت کی رائے بدلے گی۔

جماعت اسلامی ہند کی مسلسل کوشش رہی ہے کہ یہ غلط فہمیاں دور ہوں، تعصب اور نفرت کی فضا ختم ہو۔ دونوں قومیں قریب آئیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسی کوشش کا ایک حصہ خیر سگالی کے وہ خصوصی ہفتے ہیں جو ملک کی مختلف ریاستوں میں منائے جارہے ہیں ان کا دونوں طرف سے جس طرح استقبال ہورہا ہے۔ وہ بڑا حوصلہ افزا ہے۔ اگر یہ کوشش جاری رہی تو اس سے بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ابوجہاد کا قتل عالم اسلام اور آزادی پسند دنیا کیلئے ایک المیہ ہے۔ امیر جماعت اسلامی ہند

تحریک آزادئ فلسطین کے فوجی کمانڈر خلیل الوزیر اور ان کے تین محافظوں کے قتل کے حادثہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی نے کہا۔

قتل کا یہ حادثہ عالم اسلام کے لئے جہاں ایک المیہ کی حیثیت رکھتا ہے وہیں انسانی حقوق کی علمبردار دنیا کے لئے بھی ایک سوالیہ نشان ہے کہ یہ کیا ہورہا ہے، کیوں ہورہا ہے کیا فلسطین کے باشندوں کو آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی گذارنے کا حق نہیں ہے۔ تیونس سے آنے والی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ابوجہاد خلیل الوزیر کو اسرائیلی دہشت پسندوں نے گولی ماری، اس وقت موصوف تنظیم آزادی فلسطین کی رپورٹوں کا مطالعہ کررہے تھے۔ آزادی فلسطین کا مسئلہ ہی آپ کے لیے اوڑھنا بچھونا تھا آپ تحریک آزادی کے قائد جناب یاسر عرفات کے دست راست کی حیثیت رکھتے تھے خود فلسطین میں اس المیہ پر جس غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے اس سے صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ آپ فلسطینیوں کے ہر دل عزیز رہنما تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فلسطین کی آزادی غصب کرنے والوں نے آپ کو راستے سے ہٹانے کے لئے یہ گھناؤنی سازش اور وحشیانہ حرکت کی جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے لیکن مسئلہ صرف مذمت کرنے سے حل نہیں ہوجائے گا۔ اس سلسلے میں امیر جماعت نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ اس المیہ پر دنیا کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جناب ابوجہاد نے جس مبنی بر انصاف مسئلہ کے لئے اپنی جان کی قربانی دی ہے وہ ہر حال میں حل ہونا چاہئے۔ یہ آزادی پسند دنیا کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسرائیل اور اس کے ہمنواؤں کو یہ موقع نہ دے کہ وہ منظم اور مسلح دہشت پسندی کی راہ اپنا کر فلسطینی قوم کی آزادی کو سلب کئے رہیں ابوجہاد کے قتل نے یہ بات واضح کردی ہے کہ فلسطین کو ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنانے والے کس اخلاقی سطح کے لوگ ہیں؟ ان کی دہشت پسندی کے خاتمہ کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ فلسطینی قوم کو اس کا چھنا ہوا حق واپس دلایا جائے اور مسجد اقصیٰ اور دیگر مقدس مقامات کی آزادی کو بھی بحال کیا جائے۔

امیر جماعت نے آخر میں مزید اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور فلسطین اور مسجد اقصیٰ کی آزادی کی راہ آسان کردے۔ آمین!

مقالات

قرآن، سائنس اور اسلامی علمیات

ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی

سائنس کے مفہوم کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے فلسفۂ سائنس اور خود سائنس کی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔ سائنس کی تاریخ کو ہم دو بڑے ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں : بنیادی اور توسیعی دور۔ اوّل الذکر دور راجر بیکن Roger Bacon، رینے دکارت Rene Descartes اور نیوٹن Newton کے کاموں پر منحصر ہے۔ اس دور میں چند اصول اور ضابطے ایسے تیار کیے گئے جن کے نتیجے میں یونانی فلوسوفیا اور اسلامی الحکمہ سے علم کا ایک حصہ کٹ کر الگ ہو گیا۔ اسی حصے کو آج سائنس کہا جاتا ہے۔ ان اصولوں کے تحت وہ یقینی علم قرار پاتا ہے جو احساسات کی گرفت میں آسکے جس کو ریاضیات معتبر رکھے اور جو تجربات سے ثابت ہو۔ جو یقینیات ان خوبیوں پر پورا اترتا ہو اس کو معقولات RATIONALITY کا نام دیتے ہوئے سائنس کا جز سمجھا جاسکتا ہے۔ معقولات کو محسوسات، ریاضیات اور تجربات میں مقید کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیز ان پیمانوں میں سما نہیں سکتی وہی معقول کہلائی۔ معقولات کی تقصیر REDUCTION بجائے خود خلط اور ابہام کی افزائش کا باعث ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق معقولات کے اور پیمانے بھی موجود ہیں۔ چنانچہ دونوں نقطہائے نظر میں واضح فرق ہونے کی بنا پر ہم قرآنی نقطۂ نظر کو "معقولات" اور سائنسی نقطۂ نظر کو "عقلیات" کی اصطلاح دینا پسند کریں گے۔

دوسرا دور اس پس منظر کے ادراک کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ عقلیات پر گامزن ہونے کے باوجود سائنس اپنی تاریخ میں نظریات کے سہاروں سے ترقی کرتی ہے۔ چنانچہ نظریات کو عقلیات کا جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ سائنسی نظریات عقلیات کے پیمانوں پر پورے اتریں۔ اس سلسلے میں زبردست مہم کا دور اگست کاٹے AUGUST COMTE سے شروع ہو کر کارل پاپر KARL POPPER کے دور حاضر تک محیط ہے۔ اس دور میں مذہب اور مابعد الطبیعات کے مقابلے میں سائنس کو یقینی علم تصور کرتے ہوئے مختلف سائنس فلاسفہ نے سائنسی نظریات کی کسوٹی کے بطور تین اصول یکے

بعد دیگرے پیش کیے۔ پہلا اصول اثباتیت Positivism کا اصول تھا جس کے تحت تمام علمی حقائق کی بنیاد تجربات سے حاصل شدہ واقعات ثابتہ Positive Facts پر قائم ہے۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ اس عقیدے کی صورت میں ظاہر ہوا کہ سائنسی نظریات کو تجربہ کے ذریعہ ثابت ہونا چاہئے۔ لیکن جب یہ بات تحقیق ہو گئی کہ سائنسی نظریات کو واقعات ثابتہ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا تو پھر دوسرا اصول امکانیت PROBABILITY کا وجود میں آیا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ سائنسی نظریات میں صداقت کا امکان موجود ہوتا ہے اور اس امکان کی اغلبیت کی بنا پر سائنسی نظریات کو رد و قبول کیا جا سکتا ہے۔

اصول امکانیت کو کارل پاپر KARL POPPER نے رد کر دیا اور ریاضی و منطق استدلال کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ سائنسی نظریات میں امکانِ حقیقت کی اصلیت محض صفر ہوتی ہے۔ اس اصول کے مقابلے میں کارل پاپر نے ایک طرف تو سائنس اور مابعد الطبیعیات کے درمیان فرق کرنے اور دوسری طرف غلط نظریات کو رد کرنے کے لیے اصول تردید CRITERIA OF FALSIFICATION مرتب کیا۔ اس اصول کے تحت جس نظریے کی تردید اس خاص وقت کے حالات و آلہ جات کے پیش نظر ممکن ہو وہ نظریہ سائنسی نظریہ ہے ورنہ مابعد الطبعیاتی اور اگر واقعتاً اس نظریے کی تردید ہو جائے تو پھر وہ خارج از علم ہے۔ اس وقت یہی نظریہ سائنس کی دنیا میں زیادہ قابل قبول ہے۔

سائنسی فلسفے کی تاریخ کے اجمالی خاکے سے سائنس کے چار بنیادی اوصاف سامنے آتے ہیں، جو اس کے مزاج کو متعین کرتے ہیں۔

۱۔ سائنس عقلیات پر منحصر ہے۔

۲۔ سائنس اپنی تصدیق کے لئے ثبوت چاہتی ہے۔

۳۔ ثبوت حاصل نہ ہونے کی صورت میں امکانِ صدق پر اکتفا کیا جا سکتا ہے

۴۔ سائنس میں ثبوت اور امکانیت کا اصول چونکہ نظریات پر جاری نہیں ہوتا اس لئے صرف ان نظریات کو سائنس کہا جا سکتا ہے جن کی تردید عقلیت کے ذریعہ ممکن ہو۔

سائنس کی ان صفات کے تذکرے سے ہماری قرآن اور سائنس سے متعلق آئندہ بحث کو تقویت ملے گی۔

قرآن اور سائنس:۔ سائنس کے مقابلے میں قرآن انسانی عقل کا تراشہ ہونے کے بجائے خالق کائنات کے علم کا نمائندہ ہے۔ قرآن کے ذریعہ پیش کردہ علم کے لئے نہ تو یہ ضروری ہے کہ احساسات اس کا احاطہ کریں اور نہ یہ لازم ہے کہ عقلیات کے احاطوں میں نہ آنے کی صورت میں یہ غیر علم قرار پائے۔ قرآن ہدایت کی کتاب ہے۔ اس نسبت سے یہ علم کی کتاب ہے اور اس

علم کی کتاب ہے جو عقلیات پر منحصر تو نہیں لیکن عقلیات کی اہمیت کو ایک حد کے اندر تسلیم کرتا ہے۔ قرآن ایک کتاب حکمت بھی ہے [۱۵] اس کے کتاب حکمت ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ انسان کی رہنمائی ان حکمتوں کی طرف کرے جو اس کو اس خلافت گاہ میں اپنا صحیح تر کردار ادا کرنے میں مددگار رہیں۔ قرآن کے کتاب ہدایت، کتاب علم اور کتاب حکمت ہونے کی وجہ سے اس کا مزاج سائنس کے مزاج سے مختلف بنتا ہے اس مزاج کو چار نکات میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نکات اُن سابق الذکر نکات کی ضد ہیں جنھیں ہم سائنس کے مزاج سے متعلق بیان کر آئے ہیں۔

۱۔ قرآن عقلیات پر منحصر نہیں، البتہ عقلیات کے محدود دائروں کو تسلیم کرتا ہے۔

۲۔ قرآن از خود صدق ہے اور اپنی تصدیق کے لیے ثبوت نہیں چاہتا۔

۳۔ قرآن تسلیم امکان صدق کے بجائے تسلیم صدق کا حکم دیتا ہے۔

۴۔ قرآن کے نزدیک تردید بمنزلہ کفر کے ہے۔

ان نکات کی روشنی میں جب ہم سائنس اور قرآن کے درمیان تقابل کرتے ہیں تو دونوں کے مزاج متخالف اور متصادم نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا پیدا کردہ اردو اور انگریزی ادب اس بات کا اعلان کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ قرآن اور سائنس کے درمیان مشترک اقدار موجود ہیں۔ اسی عقیدۂ اشتراک کی بنا پر امت مسلمہ میں قرآن کی آیات سے متعلق چار قسم کے رجحانات عام ہیں۔

۱۔ قرآنی آیات کو سائنسی سمجھنا

۲۔ قرآن کے بعض الفاظ کو سائنسی اصطلاحات کا مقام دینا

۳۔ سائنسی نظریات کو قرآن سے ثابت کرنا۔

۴۔ سائنس کی روشنی میں قرآن کی مکمل مگر اضافی تشریح۔

یہ چار رویے ... رجحانات ضروری نہیں کہ علیحدہ علیحدہ مفکرین میں الگ الگ پائے جائیں، بلکہ ایک ہی مفکر مختلف رویے اختیار کر سکتا ہے۔ فی الحال ہم ان رویوں کی افادیت پر تنقید و تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہوئے اس بنیادی بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ قرآن اور سائنس کے درمیان مشترک اقدار دراصل کیا ہیں یہ بات واضح ہے کہ فلسفہ اور منہاجیات کے ایک جزیعنی مشاہدہ اور تجربہ (عقلیت) کی توثیق قرآن کی بہت سی آیات سے ہو جاتی ہے [۱۶] لیکن وہ اس رویے کے سخت خلاف ہے کہ عقل کو بس مشاہدہ تجربہ اور ریاضی کے احاطوں میں مقید کر دیا جائے۔ قرآن کے نزدیک عقل وہ شے ہے جو مشاہدہ، تجربہ اور ریاضیات کی مدد سے اس استنباط کو پہنچ جائے جس کی نشاندہی قرآن کرتا ہے [۱۷] سائنس اس استنباط کو قبول کرنے کے لئے

تیار نہیں کیونکہ عقلیت کے مطابق وحی اور اس کے بیان کردہ حقائق نہ تو ثابت کئے جاسکتے ہیں اور نا ہی ان کی تردید ممکن ہے۔ اِس کے مقابلے میں قرآن اس بات پر مصر ہے کہ وحی سے حاصل شدہ علم کو قبول کئے بغیر عقلیت اسفل ترین حیوانی رویّہ ہے[۱۱]۔ یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور موجودہ سائنس کے درمیان معمولی اشتراک کی بنا پر تعلق قائم کرنے کا عمل ایک طرح کی پیوند کاری ہوگا۔ ایک ایسا پیوند جو ہمیشہ اختلافات کو جنم دیتا رہے گا۔ قرآن اور سائنس کو مربوط کرنے کے لیے عقلیت کے بجائے معقولات کے پیمانے وضع کرنے ہوں گے اور سائنس کی ہیت تبدیل کرنی ہوگی۔ سائنس جب تک سائنس ہے، امت مسلمہ کے لیے ذہنی وعلمی ابہام کا بہانہ بنتی رہے گی اور عالمی سطح پر خلافت کے فرائض انجام دینے میں آڑے آتی رہے گی۔

اسلامی سائنس، شریعہ سائنس اور مثنیات :۔

سائنس کے بارے میں ایک مشہور قول یہ ہے کہ وہ فطرت کے مطالعے کے ذریعہ فطرت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ایک نظام ہے۔ یہاں فطرت کا مطالعہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مذہبی اور مابعدالطبعیاتی ذرائع سے حاصل شدہ اطلاعات کے مطالعے کے بجائے حواس کے ذریعہ حاصل ہونے والی اطلاعات کا مطالعہ ہو۔ اس مطالعے کے تحت کائنات چند مادی صورتوں اور ان کے درمیاں تعامل وارتباط رکھنے والی قوتوں کا نظام قرار پاتی ہے۔ اس کے برخلاف قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کا وجود اللہ کے امر سے ہے اور دراصل اس کی جو کچھ منشا ر ومشیت ہوتی ہے وہی کچھ ظہور میں بھی آتا ہے۔ کائنات کا ہر عمل اس کی مشیت اور کل کائنات دراصل اس کا نظام مشیت ہے۔ قرآن میں کائنات کی فطرت، انسان کی فطرت، اس کے اعمال کے حسن و قبح، کائنات کے انجام، آخرت، جزا وسزا کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ دراصل اللہ کی اسی مشیت کا جوہر ہے جس کے کچھ گوشوں کا عروض ہم حواس کے ذریعہ جان لینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ سائنس چونکہ جوہر سے نہ صرف تہی بلکہ برگشتہ ہے اس لئے اس کے ذریعہ تیار کردہ عروض میں وہ تمام خامیاں پائی جاتی ہیں جو اس تہی دامنی اور برگشتگی کا نتیجہ ہیں اور جن کی تطہیر ضروری ہے۔

تطہیر کا عمل امتِ مسلمہ میں شروع ہوچکا ہے۔ سائنس کے مقابلے میں اسلامی سائنس[۱۲] اور شریعہ سائنس[۱۳] کی اصطلاحات کا استعمال اس امر کا ثبوت ہے۔ لیکن یہ مرکب اصطلاحات اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں کہ شاید امت مسلمہ سائنسی مزاج سے کماحقہ واقف نہیں۔ سائنسی ترقی میں نظریات کا زبردست کردار ہوتا ہے لیکن سائنسیت کے لیے نظریات کو قابل تردید ہونا ضروری ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی سائنس یا شریعہ سائنس کے وہ نظریات جو قرآن سے ماخوذ ہیں کیا ان کی سائنسیت کے جانچنے کے لئے ان کو عقلیت کی صلیب پر لٹکا دیا جائے؟ یا جو نظریہ سائنس کے ملبے سے ابھر آیا ہو اس کی اسلامیت

پر قرآنی آیاتِ کائنات سے استدلال فراہم کیا جائے۔ اسلامی سائنس اور شریعہ سائنس کا تعارف کائناتی علوم کو ایک خاص رخ دینے میں معاونت تو ضرور کرتا ہے لیکن مذکورہ بالا خدشات اس کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ سائنس کی برگشتگی جو اس کی رگ و پے میں پیوست ہو چکی ہے، اسلامیت کا مقابلہ عرصۂ دراز تک کرتی رہے گی اور اس رخ کو زیادہ سے زیادہ مادیت کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ صرف الفاظ کے ردوبدل سے صدیوں پرانے مفہومات نہیں بدلتے۔ مفہومات کی تبدیلی کے لئے کم از کم اتنا ہی وقت درکار ہوتا ہے جتنا وقت دراصل کسی مفہوم کے رائج ہونے میں صرف ہوتا ہے لیکن بعض کلیدی الفاظ اپنے جلو میں ایک مکمل گردان لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہ ان کی جگہ دوسرے لفظ کے آجانے سے گردان ہی بدل جاتی ہے۔ یہی گردانی فرق ہم کو سائنس اور مشیات کی اصطلاح میں محسوس ہوتا ہے۔ سائنس ہم کو قرآن سے برگشتہ کرتی ہے اور مشیات ہمیں قرآن سے رجوع کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سائنس بشریت کی طرف مائل ہے اور مشیات الوہیت کی طرف۔ سائنس ہمارے تصورات کو حواس کے دائروں میں محدود کرتی ہے اور مشیات ہمارے تصور کی اڑان ورار الورا تک وسیع کرتی ہے۔ غرض سائنس مشہود کے تانے بانے میں تصور اور مشیات مشہود کا رشتہ غیاب کے ساتھ جوڑتی ہے۔ قرآن کے ساتھ سائنس کا رشتہ لطف و عنایت کا نہیں بغض و عناد کا ہے۔ پھر قرآن و سائنس کیا معنی؟ البتہ قرآن اور مشیات کے درمیان ربط و آہنگ کا اثبات نہ صرف لفظ مشیات میں موجود ہے بلکہ خود قرآن بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ سائنس اور مشیات کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لئے ہم ان دو علوم کی اجمالی تعریف ذیل میں پیش کرتے ہیں۔[۱]

سائنس: فطرت پر اس تعقل کو کہتے ہیں جو حواس کے ذریعہ مادی فلسفے کے تعینات کے ساتھ کیا جائے۔

مشیات: مشیت الہی پر اُس تعقل کو کہتے ہیں جو حواس اور وحی کے ذریعہ اسلامی فلسفے کے تعینات کے ساتھ کیا جائے۔[۲]

ان تعریفات سے ایک طرف تو سائنس اور مشیات کا فرق واضح ہوتا ہے اور دوسری طرف سائنس و مشیات کے درمیان تعلق کی نوعیتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ان نوعیتوں کی تفصیلات کو سمجھنے کے لئے اسلامی عملیات کی صورت گری ناگزیر ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم توحید علم اور مقصدِ علم پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے علم و ہدایت کے مابین تعلق کی طرف بھی اشارے کریں گے۔

توحید علم:- يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ

آیت الکرسی کے اس جز میں توحید علم کا واضح ذکر موجود ہے۔ انسان کے آگے پیچھے جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے اور اللہ کی مشیت کے بغیر انسان اس کے علم کا معمولی حصہ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ توحید علم کے اس عقیدے کی تفصیل تین نکات میں کی جا سکتی ہے۔

۱۔ صرف وہ مخلوق علم حاصل کر سکتی ہے جس کو اللہ کی مشیت سے علم حاصل کرنے کی استعداد حاصل ہوئی ہے۔

۲۔ علم کی کیفیت و کمیّت اس استعداد کی تاثیر پر منحصر ہے۔

۳۔ اگر یہ استعداد اور تاثیر موجود بھی ہو تب بھی خاص زمان و مکان میں کسی شخص یا معاشرہ کے علم میں تخفیف و اضافہ براہ راست اللہ کی مشیت پر ہی منحصر ہے۔

لیکن ان حقائق کی فہم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اللہ کے علم اور اس کی مشیت کے مابین تعلق کو نہ سمجھا جائے۔ اور اس تعلق کی معرفت حاصل ہونے کے بعد یقین ہے کہ مشیت و علمِ الٰہی اور علم بشر کا تعلق بھی واضح ہو جائے گا۔

اللہ کا علم اور مشیت:- اللہ کا علم جوہری اعتبار سے خود اپنی ذات اور اپنے امر کا علم ہے۔ اس کی جو منشا ہوتی ہے وہی کچھ عمل میں آتا ہے اور عالم شہود و عالم غیاب کی شکل میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اللہ کے اوامر کا ایسا مربوطہ ہے جس میں یہ اوامر آپس میں تعامل کرتے رہتے ہیں۔ کل کائنات اللہ کا نظام مشیت ہے اور کل اشیاء مربوطہائے مشیت ہیں۔ چنانچہ اللہ کا علم کیونکہ خود اپنی ذات اور مشیت کا علم ہے اس لئے اصلاً علم ہے۔ وہ پوری تفصیل کے ساتھ جانتا ہے کہ وہ موجود ہے اور جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے وہ اس سے بھی واقف ہے۔ جو اس کے علم میں نہیں وہ ناموجود اور جو موجود ہے اس کے علم میں ہے۔ چنانچہ اللہ کا علم خود اس کی ذات کا علم اور بقید و بلا قیدِ زمان و مکان اس کی مشیت کا علم ہے۔ اپنے بارے میں اس کا علم ہو بہو اسی کے مطابق ہے جیسا کہ دراصل وہ ہے۔ اپنی مشیت کے بارے میں بھی اس کا علم بالکل مشیت کے مطابق ہی ہے اس لئے اللہ کا علم اصلاً علم ہے یقین نہیں۔

انسان کا علم:- اس کے مقابلے میں انسان کا علم اصلاً یقین ہے۔ ایک متجسس ذہن (جو بجائے خود ایک مشیتی مربطہ ہے) مشیتی نظام اور مشیتی مربوطوں کے بارے میں اور ایک حواسیہ کے تحت غور و فکر کرتا ہوا کچھ تیقنات قائم کرتا ہے۔ یقین میں صدق (جو دراصل علم کی خصوصیت ہے) کا جز ادراکات

میں استقلال کے ساتھ بڑھتا ہے جو مشیتی مربوطوں اور مشیتی نظام کے استقلال پر منحصر ہے۔ نظام مشیت اور نتیجۃً ہمارے ادراکاتِ حواسیہ میں استقلال کے بغیر ہمارے تیقنات غیر مستقل ہوتے اور ہمیشہ بدلتے رہتے۔ اگر ہم اپنے تیقنات کے بدلتے رہنے کی وجہ سے ان پر بھروسہ کرنے کے ایک سرے سے عادی ہی نہ ہوتے تو ہم نے مستقل تیقنات کو غیر مستقل تیقنات سے ممتاز کرنے کے لئے علم کی اصطلاح ایجاد نہ کی ہوتی۔
چنانچہ علم کے حصول کا ایک ذریعہ تو اللہ کے نظام مشیت کا مطالعہ کرنا یا دوسرے الفاظ میں ادراک مستقل یا تجربہ ہے۔ دوسرا طریقہ مشیت الہی سے حقیقت کا وحی کے ذریعہ منکشف ہو جانا ہے بہر حال انسان کا علم یا تو وہ یقین ہے جو تجربہ کے ذریعہ پختہ ہو جاتا ہے یا پھر وہ یقین ہے جو حقیقت کے براہ راست انکشاف سے قائم ہوتا ہے۔ علم اللہ کا خزانہ ہے جس کا احاطہ صرف اس کی مشیت یعنی مشیت وحی اور مشیت تجربہ کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

علم کی کلیت :۔ علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ کی دوئی کا تصور حالانکہ غلط ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر ذرائع علم کی تقسیم ہے نہ کہ خود علوم کی۔ پھر بھی اسلامی علماء میں یہ شاید اس وجہ سے عام ہو گیا کہ نقلیہ علوم کا تعلق نزول وحی سے تھا۔ اس کے علاوہ نقلیہ اور عقلیہ علوم کی اصطلاح سے ایک غلط تصور بھی قائم ہوتا ہے جس کے تحت محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے نقلیہ علوم غیر معقول ہیں اور عقلیہ علوم کی ضد ہیں حقیقت حال یہ حال اس کے علاوہ مشیت وحی کو مشیت تجربہ کے بغیر سمجھنا محال ہے۔ اور مشیت تجربہ کو مشیت وحی کے بغیر۔ اور نہ ہی دونوں مشیتوں کو ایک دوسرے کی مدد کے بغیر صحت و کامیابی کے ساتھ عملاً نافذ کیا جا سکتا ہے۔ علم وحی جو یقیناً حق ہوتا ہے خود ہی اس قدر پرکشش ہوتا ہے کہ جزو ایمان ہو جاتا ہے۔ پھر بھی جیسا کہ قرآن کریم کے مباحث سے ظاہر ہے اسکو آیاتِ کائنات سے مدلل کیا جاتا ہے۔ آیاتِ کائنات کا تفصیلی تجرباتی مطالعہ نظام مشیت کے لطیف تر حقائق کی تفہیم کے لئے بنیادیں فراہم کرتا ہے جو کہ ائے خود بہت اہم ہیں کیونکہ یہ انسان کو منصب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے تیار کرتی ہیں۔ یہ نظام مشیت سے متعلق وحی کردہ حقائق مثلاً توحید، عبادت، خلافت اور آخرت کے بارے میں لطیف تفصیلی حقائق کی نقاب کشائی میں بھی تعاون کرتی ہیں۔ تاہم اگر انسان کو مشیت وحی کے ذریعہ ان حقائق کی براہ راست تعلیم نہ دی جائے تو تجربی علوم از خود انسان کی پیشوائی ان حقائق کی طرف نہیں کر سکتے۔ ایک ایسا مطالعہ جو مناسب ہدایت سے تہی ہو، نظام مشیت اور اس کے مقصد تخلیق سے متعلق جوہری صداقتوں کی نشاندہی نہیں کر سکتا اور اغلب ہے کہ صراطِ مستقیم سے بہک جائے گا۔
علم کی کلیت کا یہ نظریۂ توحید یا قرآن میں توحید سے متعلق مباحث ہی سے ماخوذ نہیں بلکہ یہ پیغمبروں کے افعال

سے بھی واضح ہے، کیونکہ وہ اپنے وقت کے تجربہ کار لوگ اور دور متعلق کے لئے خلافت کا نادر نمونہ تھے۔ حضرت موسیٰ کو دورِ فرعون میں مفصل مشاہد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے اہل بیت کی حیثیت سے لوگوں کے رجحانات، اطوار، رویوں اور تہذیب و ثقافت کا تجربہ حاصل تھا[15] اس کے بعد ان کو ایسے حالات سے گزرنا پڑا جن میں ان کو تقریباً دس سال تک سخت کوشی کی تربیت اور عسرت کی زندگی کا تجربہ ہوا[16]۔ حضرت یوسفؑ کو عملاً دکھایا گیا کہ انسانوں کو کس طرح غلام بنایا جا رہا ہے اور ان کے جذبات کیا ہوتے ہیں[17] ان کو اس بات کا تجربہ بھی کرایا گیا کہ عورتیں کیسی اور کس قدر گمراہ ہیں[18] ان کو اپنی قید کے زمانے میں جرائم کی کیفیت اور مجرمین کی نفسیات کے مطالعے کا بھی کافی موقعہ ملا[19] اس تجربے سے ان کو اپنے علم وحی کے نفاذ میں اس وقت کافی مدد ملی ہوگی جس وقت وہ وزیر مال ہوئے۔ حقیقتاً اکثر جرائم کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق اقتصادی نظام کی خرابیوں سے ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اپنے وقت کے ریاستی معاملات اور ٹکنالوجی مہارت میں طاق تھے[20] یہ تمام پیغمبر اپنے مادی دنیاوی تجربے کی بنا پر علم وحی کو دنیا میں مشرح اور نافذ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ بے انتہا مستقبل شناس تھے، نہ صرف دنیا کے مستقبل کی بلکہ آخرت کی بھی معرفت رکھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ حاضر سے متعلق بھی حقیقت پسند تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اس دنیا پر زبردست اثرات مرتب کئے۔ ان کے اعمال روحانی مادی، انفرادی اور معاشرتی لحاظ سے معتدل تھے۔ نہ وہ اس کائنات میں اجنبی تھے اور نہ یہ کائنات ان کے لئے اجنبی تھی۔

دنیاوی معاملات سے متعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت متواتر تاریخ کے ذریعہ ہم تک واضح طور سے پہنچی ہے۔ آپؐ نے اپنے وقت کی منفعت بخش مہارتیں مثلاً تیراکی کشتی، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور تیراندازی وغیرہ سیکھیں[21]. آپؐ بہترین خطیب تھے اور عرب کے مختلف لہجوں کو سمجھتے اور بولتے بھی تھے[22]۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کرامؓ نے مل کر استقبالیہ علم کا ایک کل تیار کر لیا جس میں مادی دنیا کے حقائق کو مناسب مقام پر رکھا۔ حدیبیہ کے دن آپؐ کا فیصلہ آپؐ کی معاشرتی، سیاسی بصیرت اور بہ لتے ہوئے معاشرتی سیاسی حالات کے ساتھ اپنے مشن کی لطیف مناسبتوں کی عمیق معرفت کا تابندہ نمونہ ہے[23] اگر اس عمل کو تجربی علم کے بجائے صرف علم وحی سے متعلق سمجھا جائے (یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے) تب بھی اس بصیرت کے تجربی عنصر کا انکار ممکن نہیں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضروری تجربی علم حاصل ہونے کے باوجود اور زبردست جنات اخلاق کے باوصف کوئی بھی پیغمبر اپنا مشن نزولِ وحی سے پہلے شروع نہ کر سکا۔ اس امر واقعہ سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ان کا تجربی علم ہنوز ناکافی تھا اور مناسب خطوطِ کار کی جانب ان کی رہنمائی نہ کر سکتا

تھا۔ اس سے اس یقین کو مزید تقویت ملتی ہے کہ تجربی علم، وحی سے حاصل شدہ مناسب خطوطِ کار ملنے سے پہلے اتنا قوی نہیں ہوتا جتنا بعد میں ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تجربی علم حقیقتاً اس وقت زیادہ بامعنی اور قوی ہوتا ہے جبکہ اس کو وحی کی ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو نفاذ کی حدود میں اور دوسری طرف عمل اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ بات تفصیلی تحقیق اور معمولی علم عام، دونوں سطوح پر برابر صادق آتی ہے۔ کوئی شخص لفظ الٰہ کا مفہوم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ اس کو ———— اس لفظ سے ملحق تمام تصورات بالخصوص غیر اللہ سے متعلق اس لفظ کے استعمالات کا علم نہ ہو۔ اسی طرح کوئی شخص لفظ رحمٰن کے مفہوم کا اس وقت تک اندازہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کو مادّی دنیا میں جاری شدہ مختلف درجات رحم کا علم نہ ہو۔ اسی طرح قرآن کی بہت سی آیات مثلاً قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ[۲۶] اپنی تشریح کے لیے دنیا بھر میں تحقیقی سرگرمی برپا کر دینے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ آیت هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[۲۷] وسیع و عمیق عقلی، اقتصادی، سیاسی، علمی، صنعتی اور ٹکنالوجی جہاد اور اجتہاد کی دعوت دیتی ہے، جیسا کہ نبی اور اصحاب کرامؓ نے اپنے وقت کی ضرورت کے لحاظ سے کیا۔ ہر دو ذرائع سے حاصل شدہ علم کی توحید، یکجہتی، اجتماعیت اور معاونت پر ہمارے مباحث کو مقصدِ علم یعنی خلافت سے قریبی تعلق ہے۔

مقصدِ علم: خلافت

علم اور خلافت کے درمیان ربط و آہنگ کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ دراصل یہ وسعتِ علم پر منحصر ہے۔ علم کی وسعتوں کے ساتھ خلافت کی حدود بھی وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ قرآنی مباحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم کا میدان لامحدود ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر وہ یقین جو بصارت و سماعت کے ذریعہ حاصل شدہ اطلاعات پر تعقل کا نتیجہ ہو وہ علم کہلانے کا مستحق ہے[۲۸]۔ بصارت و سماعت کے ذریعہ حاصل شدہ اطلاعات کے سلسلے میں ہمارا نظریہ علامہ المشرقی سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک سمعی اور بصری اطلاعات میں کوئی فرق نہیں اور وہ دونوں کو تاثیر حواس sense perception کے معنی میں استعمال کرتے ہیں[۲۸]۔ اس کے برعکس قرآن میں علم کے تعلق سے سماعت و بصارت کے الفاظ کا استعمال ہر دو ذرائع علم یعنی وحی اور تجربہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہر دو ذرائع سے حاصل شدہ اطلاعات پر جب فواد کے ذریعہ غور و خوض کیا جاتا ہے تو قدرتاً دونوں قسم کی اطلاعات مرکب ہو جاتی ہیں۔ استخلاف آدمؑ[۲۹] سے

متعلق ملائکہ کے شبے پر جس علم الاسمار کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں جنت کے ماحول کا تجربی علم یقیناً شامل ہے۔ علم الاسمار الاشیا جوہری اعتبار سے دو بہت مختلف، کم مختلف مشابہ اور بہت مشابہ اشیار وافعال کے درمیان فرق کرنے کا علم ہے. جو جنت میں مستقل تاثیر حواس یا بالفاظ دیگر تجربے کے ذریعے حاصل کیا گیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین پر خونریزی اور بدانتظامی جیسے زبردست مسائل کے پیش نظر تجربی علم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسانی ضمیر کی تخلیق، نمو اور تہذیب میں تجربی علوم کا عنصر شامل ہوتا ہے ۔ علم الاشیار لازمی طور سے اشیار کے اچھے اور برے خواص کا علم ہے۔ انسان چاہے تو اچھے خواص کو ترتیب دیتا ہوا بدامنی کو ختم اور امن کو اس طور پر بحال کر سکتا ہے کہ ماحول کو قبضے میں کر کے انسانوں کی آبادی کو اصول توحید پر جمع کر دے ۔ ہر خیر اور ہر وہ عمل جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو، بغیر اس لحاظ کے کہ وہ مسلم نے کیا ہے یا کافر نے، خلافت کے قیام میں تاثیر رکھتا ہے۔

خلافت کا ایک پہلو قیام حکومت ہے جس کے لیے لازمی ضرورت علم ہے۔ قرآن سے یہ بات واضح ہے کہ یہ علم تجربی علم ہے۔ قرآن کے مطابق طالوت کو امیر جہاد کی حیثیت سے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ وہ علم و صحت میں دوسروں سے زیادہ تھا۔[۹] اگر یہ علم صرف علم وحی ہوتا تو وقت کا عمر رسیدہ پیغمبر ہی امارت جہاد کے لیے کافی ہوتا۔ طالوت کیونکہ مومن تھا اس لیے ضروری ہدایت کے لیے علم وحی اس کے پاس تھا۔ اس کو امارت جہاد کا استحقاق تجربی علم میں اس کی برتری اور صحت وقوت کی وجہ سے تھا۔ اگر اس اصول کو گروہی اور قومی سطح پر منطبق کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو قومیں تجربی علم میں یگانہ اور صحت وقوت میں زیادہ ہوتی ہیں ان میں جہانبانی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس وقت کی سائنس وٹکنالوجی تجربی علوم کی ترقی یافتہ شکل ہے. کیونکہ اس کے ذریعے سے مواصلت، نقل وحرکت اور تعلیم وتنظیم وغیرہ کے ذرائع بخوبی حاصل ہوتے ہیں اس لئے اس کو خلافتِ انسانی کا جزو لاینفک سمجھنا درست ہے. لیکن اس کی تطہیر بھی اسی قدر ضروری ہے ۔ سائنس و ٹکنالوجی کی منفعتیں دراصل اللہ کا وعدۂ عاجل ہیں جو ظاہر ہے کہ ان لوگوں پر پورا ہوتا ہے جو اس قسم کا تجربی علم حاصل کرتے ہیں. مسلمان اس علم کو بمع اس کی تطہیر کے فرض عین سمجھیں تب کہیں جاکر یہ فرض کفایہ کی تاثیر پیدا کر سکے گا۔ اس کے بغیر وہ شاید خلیفہ کا کردار ادا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ نا ہی وہ دوسرے اطوارِ زندگی کے مقابلے میں اسلام کی برتری کو عملاً قائم کر سکیں گے۔

علم ہدایت اور خلافت:۔ علم میں ہدایت کا وصف پوشیدہ ہوتا ہے۔ انسان کا

علم ہمیشہ اس کو یہ ہدایت کرتا بتاتا ہے کہ کسی خاص علم کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے
مثال کے طور پر آگ کے جلانے کی خصوصیت کا علم انسان کو اس کے قریب جانے سے
روکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص تیراکی کے ہنر سے واقف ہے تو اس عمل میں
بہت سے خطرات مضمر ہونے کے باوجود وہ اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔ لوگ چاند کا سفر
محض اس وجہ سے کررہے ہیں کہ انھیں اپنے علم پر کافی بھروسہ ہے۔ خلاء کا علم اور خلائی
گاڑیوں کی قوت کار پر اطمینان ان کو اس قدر چانگسل مہمات کو سر کرنے کی طرف ہدایت
کرتا ہے۔ علم کا یہ وصفِ ہدایت انسان کو خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا اہل بناتا ہے۔
وہ ذمہ داریاں جن کی حدود کا طول و عرض غیب میں رکھا گیا ہے۔ اجمالی طور پر صرف اتنا
ہی کہا جاسکتا ہے کہ خلافت کی حدود وقتِ خاص کے علم وحی اور علم تجربہ کی وسعتوں سے متعلق
ہیں۔ اور چونکہ علم اپنی فطرت کے اعتبار سے ہی ہادی ہے اس لئے ایک خاص معنی میں
مقصد ہدایت کو بھی پورا کرتا ہے۔

ھدایت کی دو سطحیں:۔ علم کی ہدایتی تاثیر خواہ مائل بہ خیر ہو یا مائل بہ شر، دو سطحوں پر عمل کرتی ہے: جزئی،
اور کلی سطح۔ قرآن کے مطابق لوگ دریاؤں، دروں اور ستاروں کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں۔ یہ ہدایت دراصل
جزئی علم سے ملتی ہے اور اس کو جزئی ہدایت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ تجربی علم سے حاصل شدہ ہدایت ہمیشہ جزئی
ہوتی ہے۔ ہدات کی دوسری سطح کلی سطح ہے جو علم وحی سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہدایت وحی اور ہدایت
تجربہ کا رشتہ کل اور اس کے جز کا رشتہ ہے۔ اجزاء کا علم صرف جزئی ہدایت ہی دے سکتا ہے اور اس طرح
جمع شدہ ہدایت کے ٹکڑوں کو مکمل صحیح طور پر جوڑا نہیں جاسکتا۔ علم کی تاریخ اس حقیقت کی نشاندہی کرتی
ہے یہ صرف وحی کا وصف ہے جو جزئی حقائق کو مناسب کل کی شکل دے کر زمانی و مکانی حدبندیوں
کے بغیر کلی ہدایت دے سکتی ہے۔ وحی کی کلی ہدایت کے دائروں میں ہی جزئی تجربی ہدایت پُر معنی موثر اور
مستقبل قریب و بعید (دنیا و عقبیٰ) کے لئے منفعت بخش ہوسکتی ہے۔

ھدایت کا کلی مفہوم:۔ ہدایت کے تین بنیادی اجزاء ہیں (۱) علم (۲) جذبہ (۳) مثبت
عملی تاثیر۔ جزئی تجربی علوم سے پیدا شدہ جذبہ بھی جزئی اور اس کی عملی تاثیر بھی جزئی ہوتی ہے۔
اس کے برخلاف کلی علم وحی سے کلی جذبہ و تاثیر پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح حاصل شدہ ہدایت
کلی ہوتی ہے۔ اصل فرق علم کی قسم کا ہے۔ اللہ کی صفات کا علم، مقصد تخلیق کا علم، تخلیق کے
انجام کا علم انسان اس کے مقصد، اس کے انجام اور اللہ کے سامنے اس کی جوابدہی کا علم

یہ سب کلّی علم میں شامل ہیں جو وحی سے حاصل ہوتے ہیں۔ وحی کے ذریعہ انسان کے رجحانات کو ایک خاص رخ حاصل ہوتا ہے اور اس کے جذبات میں تقویٰ کا وصف پیدا ہوتا ہے۔ یہ کلّی علم وحی کی بہت ہی نمایاں مثالیں ہیں۔ ورنہ قرآن کی ہر ہدایت خواہ وہ بظاہر جزئی معلوم ہوتی ہو، دراصل اللہ کے کلی علم سے ہے۔ وحی کی ہدایت ایک طرف تو مناسب اور استقبالیہ خطوط و حدود مہیا کرتی ہے اور دوسری طرف تکنوصنعتی تاثرات کے تحت متحرک و ترقی پذیر منازل پر اسلامی معاشرتی، سیاسی تہذیبی اور ثقافتی تعمیرات میں تعاون کرتی ہے۔

علم مشیت، رضا اور خلافت

درج بالا مباحث سے یہ بات عیاں ہے کہ انسان کا علم حرکی اور توسیعی فعل ہے، یہ لازمی طور سے انسان اور مشیت الٰہی کے درمیان تعامل کا نتیجہ ہے۔ مشیت سے متعلق انسان کے علم کی توسیع کے ساتھ انسان کے میدان عمل میں بھی وسعت ہوتی ہے۔ تسخیر کی اہلیت کے ساتھ راہیں بھی زیادہ کھلتی ہیں اور خلیفۂ ارض کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی ہیں۔ میدان خلافت جس قدر تیزی اور تاثیر کے ساتھ وسیع ہوتا ہے اسی قدر قوی اور پُر اثر تبدیلی ثقافتی صورتوں اور معاشرتی عمل کے اطوار میں ہوتی ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ معاشرتی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی، تکنوصنعتی، زراعتی اور ماحولی مقاصد کے درمیان توازن و عدل کے لئے خاکوں کی فراہمی اور اصول و قوانین کی تدوین میں بھی اُسی شرح کے متناسب پیش رفت ہو۔

اس مقام پر مشیت الٰہی کے ایک اور رخ یعنی رضا یا مرضیہ کا تعارف ناگزیر ہو جاتا ہے[۳۲]۔ مشیت جو ایک ایسا جبری قانون ہے جس کے مطابق تمام طبیعی، حیاتیاتی، نفسیاتی، معاشرتی اور سیاسی افعال رونما ہوتے ہیں اور جس کا علم انسان کے سامنے انتخاب عمل کے لئے بہت سی راہیں کھول دیتا ہے، اس کے مقابلے میں اللہ کی رضا وہ ہے جس کا علم انسان کو اپنی فہرست انتخاب میں کمی کرنے پر مائل کرتا ہے۔ مرضیہ دراصل اللہ کی وہ مشیت ہے جو نظام مشیت کے پیچیدہ تعاملات کے دوران سفر کرتے ہوئے انسان کو متوازن، پُرامن اور خوش آئند راہوں کی طرف اشارے کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ نظام مشیت سے متعلق خود اللہ کے علم کا وہ جوہر ہے جو انسان کو نظام مشیت کے ساتھ متوازن اور پُرامن تعامل کی جانب ہدایت کرتا ہے، اس طرح

مشیت کے بارے میں حاصل شدہ علم۔ نامعلوم مشیت کے اتھاہ اندھیروں کے درمیان انسان کے موجی عمل کے لئے وسیع امکانات پیدا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں علم مرضیہ انسانی عمل کے طول موج کو قصیر کرتا ہے تاکہ اس کے اعمال صراطِ مستقیم اختیار کریں۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو ہدایت کا جوہر ہے یا ایک ایسا نور جس کا جزو مطلق قرآن اور سنت ہے اور اجماع جس کا جزو اضافی ہے جو ایک صحت مند اور جاندار اسلامی معاشرے میں اجتہاد کو کردار فعال عطا کرتا ہے۔

چنانچہ مشیت اور رضا دونوں کا علم ایک ہی وحدت کے دو رُخ ہیں اور خلافت کے مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ مشیت کا علم اور اس کے منافع حاصل کرنے کی صلاحیت انسان میں فطرتاً موجود ہے اس لئے کائنات سے متعلق قرآنی آیات کا ہدف اس مقصد کا حصول نہیں۔ ان کا ہدف دراصل بنیادی حقائق مثلاً توحید، رسالت اور آخرت کے حق میں استدلال فراہم کرنا ہے۔ خلافت کا ایک پہلو یعنی مطالعۂ فطرت انسان پر تسخیر فطرت کے لئے نہیں بلکہ توحید رسالت اور آخرت کے تصور کی روشنی میں تفہیم فطرت کے لیے واجب ہوا ہے۔ البتہ یہ بات تجربہ سے معلوم ہے کہ مطالعۂ فطرت کا نتیجہ اکثر تسخیر فطرت کی شکل میں حاصل ہوتا ہے۔ خلافت کا دوسرا پہلو یعنی اللہ سے قرآن اور سنت کے ذریعہ ہدایت طلب کرنا تو یہ انسان پر خلیفہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبداللہ کی حیثیت سے فرض ہوا ہے۔ قرآن انسان پر تسخیر فطرت کی ذمہ داری عائد نہیں کرتا۔ اس کو وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والے حقائق کی بہتر سے بہتر تفہیم کے لیے مطالعۂ فطرت کرنا ہے جس کا انعام آخرت میں جنت اور دنیا میں تسخیر اور اس کے فوائد ہیں۔ خلافت کا دوسرا پہلو جو تسخیر کا الٹ ہے، یعنی عبادت اور اطاعت، بظاہر انسان کو آقا کے مقام سے گرا کر غلام کے مقام پر لے آتا ہے۔ چنانچہ اطاعت کا پہلو متواتر مشق سے ہی مضبوط ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن ہمیں اس خیر پر ابھارتا ہے اور باربار بنیادی عقائد اور عبادت کا ذکر کرتا ہے تاکہ خلافت کا یہ پہلو خوب مضبوط اور باطن میں جاگزیں ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ باہر سے ہدایتی حدود و نقوش کے بغیر تسخیر کی منفعتیں امن کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتیں اور مقصد خلافت پورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک علم مشیت اور علم مرضیہ کو جذبۂ عبدیت کے ساتھ یکجہتی کیا جائے اس وقت تک خلافت آدم کا قیام یا بالفاظ دیگر اقامت دین وسلامتی ممکن نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حواشی و حوالے

۱؎ انسائکلوپیڈیا برٹانکا، ہیلن ہمنگ وے پبلشر ۱۹۷۴-۱۹۷۲ء، جلد ۲ لفظ بیکن راجر، جلد ۵ لفظ ڈکارٹ رینے، جلد ۱۶ لفظ سائنس فلاسفی، مزید ملاحظہ کیجئے "ڈسکورس آن میتھڈ اینڈ دی میڈی ٹیشن" ڈکارٹ

(انگریزی مترجم ایف ای ستکلف) پینگوئن بکس صفحہ ۳۱، ڈسکورس نمبر ۵ و ۶

۳؎ انسائکلو پیڈیا برٹانکا، جلد ۱۴ لفظ پوزی ٹی وزم

۴؎ امکانیت کا تصور سائنس میں لیپ لاس (PIERRE-SIMON LAPLACE) نے ۱۷۹۵ء میں متعارف کرایا۔ ملاحظہ کیجئے انسائکلو پیڈیا برٹانکا جلد ۱۴، لفظ پروبیبلٹی، تھیوری آف امکانیت کے اصول پر چارلس ایس پیرس نے اپنے ایک مضمون "پروبیبلٹی آف انڈکشن" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ مضمون پہلی بار ماہنامہ پوپلر سائنس شمارہ ۱۲ (۱۸۷۸) میں شائع ہوا۔ اب یہ مضمون اس کے ایک مجموعۂ مضامین کے ساتھ کتاب کی شکل میں "ایسیز ان دی فلاسفی آف سائنس" کے نام سے ونسنٹ ٹوماس نے "دی امیرکن ہیریٹیج سیریز" سے مرتب کیا ہے ملاحظہ کیجئے ہندوستانی ایڈیشن ایسٹ ویسٹ پریس پرائیویٹ لمٹڈ۔ صفحہ ۸۵ تا ۱۰۲۔ اس کے علاوہ اس نظریے پر وائٹ ہیڈ، ریمبک کارناپ وغیرہ نے بھی بحث کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے کارل پاپر" دی لاجک آف سائنٹفک ڈسکوری، صفحہ ۲۵۴ تا ۲۶۵، مزید دیکھئے "عینز آف سائنس" از وی دی نایمو و، آئی ایس آئی پریس فلاڈلفیا (۱۹۸۱) صفحہ ۲۲ تا ۲۵

۵؎ کارل آر۔ پاپر: دی لاجک آف سائنٹفک ڈسکوری، ہچنسن اینڈ کو (پبلشر) لمٹیڈ (۱۹۸۰) صفحہ ۲۰،۲۹، ۲۵۴تا۲۶۵، ۲۶۳ تا ۲۷۳

۶؎ ایضاً، صفحہ ۳۴ تا ۴۴، صفحہ ۸۷ تا ۹۳

۷؎ قرآن۔ ۲: ۳، ۹۷، ۱۸۵؛ ۵: ۱۵-۱۶؛ ۷: ۸۸؛ ۷: ۴۳، ۵۲

۸؎ قرآن۔ ۷: ۵۲

۹؎ قرآن۔ ۲: ۲۳۱

۱۰؎ قرآن۔ ۲: ۲۶۰؛ ۱۷: ۳۶؛ ۷۶: ۲

۱۱؎ قرآن۔ ۳۰: ۷، ۸، ۲۰ تا ۲۷

۱۲؎ قرآن۔ ۸: ۲۲، ۵۵

۱۳؎ اسلامی سائنس کی اصطلاح سب سے پہلے سید حسین نصر نے استعمال کی۔ ان کے نزدیک وہ تمام علوم اسلامی سائنس کہلانے کے مستحق ہیں جو اسلامی نظریۂ کائنات کے تحت تشکیل پائیں نصر صاحب نے دراصل لفظ سائنس کو ابتدائی معنی میں لیا ہے۔ جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ شروع میں سائنس کا لفظ علم کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اس کا اطلاق عام تھا۔ لیکن اب یہ فطری علوم کے لئے مختص ہے ملاحظہ

کیجئے سید حسین نصر کی 'اے انٹروڈکشن ٹو اسلامک کاسمالاجیکل ڈاکٹرائنیس' شمبھالا۔ باؤلڈر ۱۹۷۹ء مزید۔ اسلامک سائنس۔ این السٹریٹڈ اسٹڈی۔ ورلڈ آف اسلام فیسٹیول پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ (۱۹۷۶) ۔ میں خود بھی اسلامک سائنس کا لفظ ان فطری علوم کے لئے استعمال کرتا رہا ہوں جو اسلامی نظریہ کائنات کی تاثیرات کے تحت پروان چڑھے ہوں۔ ملاحظہ کیجئے "اشر کیچراف اسلامک سائنس" ماس جرنل آف اسلامک سائنس جلد ۱
شمارہ ۲ صفحہ ۲۱ تا ۲۷ مزید "اسلامک سائنس آن پروڈکشن اینڈ ایڈمنسٹریشن پلیسیا یعنا" جلد ۲، شمارہ ۱ صفحہ ۴۴ تا ۵۵ ۔ لیکن جیسا کہ اس مضمون سے ظاہر ہے، اب میں سمجھتا ہوں کہ "متیات" کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے۔

۱۳؎ شرعیہ سائنس کی اصطلاح سید وقار احمد حسینی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک علوم فطرت بھی شرعی علوم ہیں کیونکہ قوانینِ فطرت بھی اللہ ہی کی قائم کردہ شریعت ہے جو زمین و آسمان اور کل کائنات پر نافذ ہے۔ یہ اصطلاح بجائے خود مبہم ہے کیونکہ ایک شریعت تو اختیاری شریعت ہے جس کو دراصل مذہبی اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے۔ دوسری شریعت وقار صاحب کے خیال میں وہ جبری قوانین ہیں جو فطرت میں جاری ہیں۔ ہر دو قسم شریعت میں فرق کرنے کے لئے ایک اسم توصیفی چاہیے مثلاً اختیاری شریعت۔ پھر اس میں سائنس کا لفظ شامل کریں تو مکمل اصطلاح جبری شریعہ سائنس اور اختیاری شریعہ سائنس وجود میں آتی ہیں۔ سائنسیت سے پھر بھی چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ وقار صاحب کے خیالات کے لئے ملاحظہ کیجئے اسلامک سائنس اینڈ پبلک پالیسیز لیسن فرام ہسٹری آف سائنس، سٹی ریپ وگرانک سروس کوالالمپور (۱۹۸۵) اور ٹیچنگ اسلامک سائنس اسٹڈی اپروچ؛ انٹرنیشنل کیمبرس ایڈکیس اسٹڈیز فرام کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی "اسلامک سروس، یو ایس اے (۱۹۸۵) مزید ملاحظہ کیجئے ماس جرنل آف اسلامک سائنس جلد ۲ شمارہ ۱ صفحہ ۷۵ تا ۹۰، جلد ۲ شمارہ ۲ صفحہ ۷۵ تا ۸۷

۱۴؎ یہ تعریف میں نے ایک سمپوزیم میں اسلامک سائنس کے لئے کی تھی۔ یہ سمپوزیم ۸ تا ۱۱ اگست ۱۹۸۶ کو بیرا ماؤنٹ نادر۔ کالی کٹ میں ہوا تھا۔ اس سمپوزیم کا ذکر ملاحظہ کیجئے انکوائری جلد ۳ شمارہ ۱۰ صفحہ ۵۵ لندن اکتوبر ۱۹۸۶ء

۱۵؎ قرآن ۔ ۲۸، ۲۰۷، ۱۴

۱۶؎ قرآن ۲۸ ۔ ۲۲، ۲۸

۱۷ قرآن۔ ۱۲ : ۱۹۔ ۲۰

۱۸ قرآن ۔ ۱۲ : ۲۱۔۳۲

۱۹ قرآن۔ ۱۲ : ۳۴ ۔ ۳۵

۲۰ قرآن۔ ۲۱: ۷۸ - ۸۰ ، ۳۴ : ۱۰، ۱۱

۲۱ نعیم صدیقی: "محسنِ انسانیت" (مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی) ۱۹۶۰ صفحہ ۱۲۶

۲۲ راغب الطباخ۔ "تاریخِ افکار و علوم اسلامی" اُردو ترجمہ از افتخار بلخی (مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی) ۱۹۸۳، صفحہ ۳۸۵ تا ۳۹۳ ، ۵۰۲ تا ۵۰۵

۲۳۔ نعیم صدیقی۔ گذشتہ، صفحہ ۵۶۴ تا ۵۷۷

۲۴ قرآن ۔ ۲۹ : ۲۰

۲۵ قرآن، ۹: ۳۳

۲۶ قرآن ۔ ۱۷: ۳۶

۲۷ عنایت اللہ خاں المشرقی۔ "حدیث القرآن (التذکرہ، اچھرہ، لاہور ۱۹۵۲) صفحہ ۸ - ۹، ۸۸۔۸۹
قابل مصنف کے اس مباحثے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کو کان، آنکھ اور دل اس لئے عطا کئے گئے ہیں کہ وہ فطرت پر غور کرے اور مادرار الفطرت جو بھی یقین ہے وہ علم نہیں ظن ہے۔" جس شے کی تصدیق یہ تین اعضار کر دیں وہ علم ہے اور قرآن منع کرتا ہے کہ اس کے سوا کسی اور شے کی پیروی کی جائے۔ اس حکمت کی رو سے کسی شے کو جس کی تصدیق صحیفۂ فطرت نے نہ کی ہو علم کا بلند درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔" علاّمہ مشرقی نے یہ بات سورہ ۱۷ کی آیت ۳۶ کی تشریح میں کہی ہے۔ جس کا مفہوم ہے "اور اُس شے کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں۔ بیشک کان، آنکھ اور فواد سب سے سوال کیا جائے گا۔" علاّمہ نے اس آیت کو طریق علم سے متعلق کرتے ہوئے سماعت کو بھی عام سائنسی مشاہدہ کے معنی میں لیا ہے۔ علامہ سائنسیت سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں کہ قرآن میں سمعی علم اور بصری علم کے درمیان جو فرق ملحوظ رکھا گیا ہے وہ دھندلا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے مباحث کے مطابق صرف صحیفۂ فطرت کا مطالعہ ہی ذریعۂ علم ٹھہرتا ہے۔ ہمیں اس بات سے اختلاف نہیں کہ صحیفۂ فطرت کے مطالعے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں اعتراض اس بات پر ہے کہ سماعت کو سماعت وحی کے بجائے مشاہدہ فطرت کے معنی میں لیا جائے۔

۲۸ قرآن۔ ۲ : ۳۰-۳۴

۲۹۔ قرآن۔ ۲: ۲۴۶ - ۲۴۷، مزید ملاحظہ کیجئے محمد علی الصابونی، صفوۃ التفاسیر (دار القرآن الکریم، بیروت، ۱۹۸۱) جلد ۱ صفحہ ۱۵۷

۳۰۔ قرآن۔ ۱۸: ۶۵ تا ۸۲۔ ان آیات میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ، حضر علیہ اسلام سے ان کی رفاقت کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ خضر علیہ السلام اپنے خصوصی علم کی بنا پر کہتے ہیں کہ "آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے اور آپ ان معاملات میں صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ جن کا آپ کو علم نہیں"۔ قصہ تسلسل کے ساتھ بیان ہوتا ہے اور حقیقت واقعہ یہ سامنے آتی ہی کہ دونوں صبر نہ کر سکے حضرت موسیٰ نے خضر علیہ السلام کے خصوصی علم سے ناواقفیت کی بنا پر سوالات شروع کر دیے۔ حضرت خضر بھی اپنے خصوصی علم کی بنا پر عمل سے باز نہ رہ سکے حالانکہ ان کا عمل شریعتِ وقت کے خلاف تھا۔ حضر علیہ السلام کے علم نے انھیں اپنے علم کے مطابق اکسایا نہ کہ حضرت موسیٰؑ کے علم کے مطابق

۳۱۔ قرآن۔ ۱۶: ۱۵، ۱۶

۳۲۔ قرآن ۲: ۱ تا ۵

۳۳۔ قرآن۔ ۴: ۱۰۸ " یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف (مالا یرضیٰ) مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے"۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ رضا یا مرضیہ کا مطلب مشیت سے مختلف ہے۔ انسان کا ہر عمل مشیت کے دائروں میں ہوتا ہے لیکن رضا کے دائروں میں وہ صرف اس وقت آتا ہے جبکہ وہ قرآن اور سنت کی روح کے مطابق ہو

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ ان کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حضور معافی چاہنے سے آخر ان کو کس چیز نے روک دیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں۔ (کہف: ۵۵)

اسلامی نشاۃ ثانیہ اور مولانا مودودیؒ

ڈاکٹر تحسین فراقی

یوں تو تمام ارواح انسانیہ نے ہستی لامحدود ہی سے صدور کیا ہے اور اس اعتبار سے ان کا مصدر و معدن ایک ہے، لیکن اپنے درجات اور مراتب کے اعتبار سے ان میں فرق اور تلون ہے، اور اسی سے یہ بوقلموں کائنات عبارت ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی ہستی لامحدود سے صدور کرنے والی ایک ایسی روح تھے جس کا مقصود و منتہیٰ ہستی لامحدود تھا۔ کوئی محدود شے ان کو مطمئن نہ کر سکی۔ وہ ہمیشہ آتش در دل رہے۔ یہ وہی آگ ہے، جو ہر کار تجدید کرنے والے کے سینے میں بھڑکتی ہے۔

وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

ایک پیغمبر، ایک داعی ایک مجدد اور ایک مصلح کے لئے بھی اتنی ہی سچی ہے، جتنی ایک سچے شاعر کے لیے۔ اسی آگ نے امام غزالی کے سینے کو گلخن کیا، اسی آگ نے ابن تیمیہ کی روح کو بھٹی کی طرح بھڑکایا اور یہی آگ شاہ ولی اللہ اور حضرت مجدد صاحب کے سینے میں شعلہ فشاں رہی۔

ازاں بدیر مغانم عزیز می دارند\
کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست

۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کو مولانا مودودیؒ نے لکھا

"بہر حال میں یہ تصفیہ کر چکا ہوں کہ خواہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ساتھی نہ ملے میں تنہا اپنی ذات سے اس جنگ کو شروع کروں گا اور آخر وقت تک جاری رکھوں گا۔ قطع نظر اس سے کہ کامیابی ہو یا نہ ہو، مسلمانوں کی اس وقت جو نازک حالت ہے اور جو خطرناک مستقبل ان کے سامنے ہے۔ اس کو دیکھ میں سمجھتا ہوں کہ آئندہ دس بیس سال اس ملک میں اسلام کی قسمت کے لئے فیصلہ کن ہے۔ اگر اس وقت ہم مدافعت کے لئے کھڑے نہ ہوئے تو چند سال بعد ہم کو سکون کا کوئی گوشہ نہ ملے گا..... آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے، جس نے مجھے پرسکون تفکر کے

کے قابل نہیں رکھا۔ دلی سے ایک آگ اپنے سینے میں لایا ہوں، اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔" (وثائق مودودیؒ ص ۸۳)

کیا یہ ویسی ہی شعلہ فشانی اور سوختہ جانی نہیں تھی، جیسی حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ارزانی ہوئی تھی۔؟ شاہ صاحب کے سامنے بھی مسلم امت کا شاندار ماضی تو تھا، مستقبل نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے ہندوستان میں مسلم تہذیب کا رفیع الشان قصر گرتا ہوا دیکھ رہے تھے، مسلم حکومت ان کے سامنے لڑکھڑا رہی تھی اور اس کے پائے چوبیں کے نیچے دلدل ہی دلدل تھی۔ یہ آگ شاہؒ کو کشاں کشاں مکہ اور مدینہ لے گئی، جہاں یہ آلاؤ اور بھڑکا اور پھر فیوض الحرمین، جیسی کتاب وجود میں آئی، جو صوفی ویژن کی ایک نادر دستاویز ہے۔ شاہ صاحب کا سارا عظیم کارِ تجدید اسی آلاؤ کا مرہون منت ہے۔

مولانا مودودیؒ بیک وقت سادگی و پُرکاری، مقدس سنجیدگی، بذلہ سنجی، حلم و بردباری اور ضبط و تمکین کا پیکر تھے، ان کی شخصیت میں آب و آتش کا قِران تھا۔ منور اور روشن چہرے والے اور سفید دودھیا لباس میں ملبوس، اس شخص کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے فجر طلوع ہو رہی ہے۔ اس شخصیت کی فکر سے واقعتاً سعادت کی کئی صبحیں طلوع ہوئیں ہیں اور ہوں گی۔ یہ فکر ایک عرصہ سے حاوی باطل کی گمبھیر اور گھنگھور رقوتوں سے برسرِ پیکار رہی۔ مولانا نے ہر فکر کو جانچا، ہر دبستان کو پرکھا، ہر مکتبہ فکر کو آنکا، ہر فراز کو دیکھا اور ہر نشیب میں جھانکا۔ ان کی سب سے بڑی متاع تمسک بالقرآن اور تعلق بالسنہ تھی۔ مولانا کی تھی لڑائی یک رخی اور یک طرفہ نہیں تھی، انھیں چومکھی لڑائی لڑنا پڑی۔ انھیں بیک وقت سیکولرزم، سوشلزم، کمیونزم، مغربی طرز جمہوریت، الحاد، تشکیک، جعلی تصوف، مردم بیزار اور معاشرہ گریز سیرت اور باطنیت اور تہذیب مغرب کے خلاف شمشیر بکف ہونا پڑا۔ تدین، تدبر تفکر، تعمق، تحقیق تفتیش، تعدیل، تعبیر، تشریح اور تعین ان کے بنیادی ہتھیار تھے، جن سے وہ عمر بھر مسلح رہے اور دبستان فکر کی کنہ تک پہنچنے میں کوشاں رہے۔ اس باب میں ہر بڑے آدمی کو ایک جیسا طریقۂ کار اختیار کرنا پڑتا ہے "سرگزشت غزالی" پڑھئے تو لگتا ہے کہ اس میں تو مولانا مودودیؒ کی داستان مجاہدہ رقم ہے۔

"میں عنفوانِ شباب ہی سے اس بحر میں غوطہ زنی کرتا رہا اور اب جبکہ سن پچاس سے متجاوز ہے، مشغلہ برابر جاری ہے۔ میری یہ غوطہ زنی اور غور و خوض ایک بزدل اور ڈرپوک انسان کی طرح نہ تھا بلکہ ایک بہادر انسان کی طرح تھا، جو تاریکی میں گھس کر حقیقت حال کا کھوج لگاتا ہے مشکلات پر حملہ آور ہوتا ہے اور فکر و عمل کے ہر ہر بھنور میں چھلانگ لگاتا ہے اور دُرِ مقصود کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے۔ میں نے ہر ہر گروہ کے عقائد

کی چھان بین کی اور ہر ہر مذہب کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش کی تاکہ اہل حق اور اہل باطل میں خطِ امتیاز کھینچ سکوں اور یہ جان سکوں کہ سنی کون ہے اور بدعتی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ میں نے نہ کسی باطنی کو اس کی باطنیت کا جائزہ لیے بغیر چھوڑا اور نہ کسی ظاہری کو یہ جانے بغیر معاف کیا کہ اس کی ظاہریت کا حاصل کیا ہے۔ اسی طرح میرے ہاتھ سے نہ کوئی فلسفی ہی چھوٹا، نہ متکلم... صوفی و عابد کو بھی پرکھا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس کی پاکبازی کن چیزوں میں منحصر ہے اور اس کی عبادت کے کیا ثمرات ہیں، اسی طرح میرے حلقۂ تنقید میں زندیق و معطل تک آئے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو بے دینی اور تعطل پر کس چیز نے جرأت دلائی۔ درک حقائق کا یہ چسکہ اور پیاس ابتدا ہی سے تھی اور یہ میری عادت و سرشت میں تھا کہ ان باتوں پر غور کروں۔ ۔ ۔ ۔ یہی وجہ ہے کہ جوانی کے آغاز میں ہی تقلید کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئیں اور عقائد موروثہ کا سحر ٹوٹتا ہوا نظر آیا، کیونکہ میں دیکھتا تھا کہ یہاں عقائد کو تحقیق کی بنا پر اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ تقلید کے داعیہ سے ایسا ہوتا ہے کہ یہودی بچے، یہودیت کو پسند کرتے ہیں، عیسائی، عیسائیت کو عزیز رکھتے ہیں اور ان بچوں کی نشو و نما اسلامی روایات پر ہوتی ہے۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا میں نے جاننا چاہا کہ یہ فطرت اصلیہ کیا ہے اور وہ عقائد کیا ہیں، جو بعد میں والدین اور اساتذہ کی تقلید کی وجہ سے عارض ہوتے ہیں۔"

میں اس طویل اقتباس کے لئے معذرت خواہ ہوں، لیکن اگر غزالی کے درج بالا اقتباس کو مولانا مودودی کے درج ذیل خیالات سے ملا کر پڑھیے تو ہر بڑے آدمی کے طرز فکر کے تماثلات کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا۔ مولانا کی کتاب "تجدید و احیائے دین" اس تدبر، جانچ پرکھ، تنقیح اور تہذیب کی نمائندہ ترین کتاب ہے اور اس اعتبار سے بے حد ممتاز بھی، جاہلیت کیا ہے، عریاں جاہلیت اور مرکب جاہلیت میں کیا فرق ہے؟ جاہلیت خالصہ، جاہلیت مشرکانہ اور جاہلیت راہبانہ کے کیا خد و خال ہیں اور جدید و تجدد میں کیا چیز لائق اعتماد ہے۔ السلطان ظل اللہ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اور مقصودِ بعثتِ انبیاء کیا رہا ہے۔ مَنْ یُجَدِّدُ وَلَهَا دِیْنَهَا کی اصل تعبیر کیا ہے اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے کیا معنی ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام ان کا درج ذیل خط، ان کے تدبر، وسعتِ مطالعہ اور تمسک بالقرآن کی زندہ شہادت ہے،

" جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، تاریخ معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں مگر جب آنکھیں

کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نیٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں اس (کتاب) نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا دکھائی دیتی ہے گویا اس پر کوئی پردہ نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کنجی کو شاہ کلید (ماسٹر کی) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے۔ سو میرے لیے یہ قرآن شاہ کلید ہے۔ مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں کھل جاتا ہے ...."

دعوت وارشاد خونِ جگر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس جہاد میں شریک ہونے کے لیے اپنی کشتیاں جلانی پڑتی ہیں اور دوسروں کے علاوہ اپنے آپ سے دشمنی مول لینا پڑتی ہے اور ملامت و مذمت اور طعن و تشنیع سے بے نیاز ہوکر جہاد جاری رکھنا پڑتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ فوری مثبت نتائج کی امید رکھنا خام کاری کی علامت ہوتا ہے۔ یہ کام یقین کامل اور ایمان محکم کے ساتھ آغاز ہوتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ اس درویشی کے سامنے فغفوری کو سرِ تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ مولانا کو اپنے تحریکی کام کی صداقتِ تامّہ کا شدت سے احساس تھا اور اس باب میں ان کا معاملہ حافظ کے اس شعر سے مختلف نہیں تھا ؏

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نہ شنید یا شنید

یا پھر یہ کہ ؏

اے ہم نفساں آتشم از من بہ گریزید
ہر کس کہ شود ہمرہِ ما دشمنِ خویش است

چنانچہ شورش کشمیری مرحوم کے نام ایک خط میں مولانا نے ۱۹ر دسمبر ۱۹۶۷ء میں لکھا:

"حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ بجائے خود "حق" ہے وہ ایسی مستقل اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہے۔ اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ حق ہی ہے کیونکہ اس کا حق ہونا اس شرط سے مشروط نہیں ہے کہ دنیا اس کو مان لے دنیا کا ماننا یا نہ ماننا سرے سے حق و باطل کا معیار ہی نہیں ہے اگر دنیا حق کو نہیں مانتی حق ناکام نہیں ہے بلکہ ناکام وہ دنیا ہے جس نے اسے نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا مصنّف

حق پر نہیں بلکہ یہ اہل حق پر آتے ہیں۔ لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انھیں بہر حال حق پر ہی قائم رہنا اور اسی کا بول بالا کرنے کے لیے اپنا سارا سرمایۂ حیات لگا دینا ہے، وہ مصائب میں مبتلا تو ضرور ہو سکتے ہیں، لیکن ناکام، کبھی نہیں ہو سکتے۔
احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین حق کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ایمان نہ لایا۔ کیا ہم انھیں ناکام کہہ سکتے ہیں ناکام تو وہ قوم ہوئی جس نے اسے رد کر دیا اور باطل پرستوں کو اپنا رہنا بنا لیا... ہمارا کام بہر حال اندھیروں میں چراغ جلانا ہی ہے اور ہم مرتے دم تک یہی کام کرتے رہیں گے ہم اس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بھٹکنے یا بھٹکانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ خدا کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں اندھیروں میں چراغ جلانے کی توفیق بخشی۔ اس احسان کا شکر یہی ہے کہ ہم چراغ جلاتے جلاتے مرجائیں۔

صاحبو!

ایک بڑے لکھنے والے کی ایک پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس کی مختلف العہد تحریروں میں ربط و اتفاق پایا جائے۔ عامی کا اپنے آپ کو دہرانا عیب، لیکن عالم کا اپنے آپ کو دہرانا ہنر و صواب ہے مولانا مودودیؒ کی مختلف عہد کی تحریروں کو ملا کر پڑھ لیجیے۔ ان میں ایک ہی خیال، ایک ہی جذبہ اور ایک ہی فکر کی رو چلتی ہوئی محسوس ہوگی۔ مصلح اور داعی کے لیے پہلی بنیادی خوبی صفائی ذہن و قلب ہے ہر ابہام تو نہیں، لیکن بعض ابہام بہر حال منافقت کے زائیدہ اور منافقت کو جنم دیتے ہیں۔ مولانا کی تحریریں شفاف آئینہ ہیں جو ان کے ذہن و ظرف کی پاکیزگی اور صفائی اور CLEARITY کا پتہ دیتی ہے۔ جناب سلیم منصور خالد کی مرتبہ وثائق مودودیؒ میں شامل، مولانا مودودی کے بعض خطوط کی جو یادداشتیں شامل ہیں، ان میں سے ۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء کی یادداشت کا ایک اقتباس دیکھیے، اور اسے شورش کاشمیری مرحوم کے نام دسمبر ۱۹۷۰ء والے مندرجہ بالا خط سے ملا کر پڑھیے۔ یادداشت کا اقتباس درج ذیل ہے:

"یہ ایک HERCULEAN - TASK اول تو ہم اس کو اس طرح شامل کر رہے ہیں کہ ہم سے پہلے کوئی اس کے نشانات راہ چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔ ہمیں خود اپنی منزل مقصود کو پیش نظر رکھ کر راستہ بنانا ہے اور اس پر چلنا ہے دوسرے یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری اور آپ کی اور ہم جیسے سینکڑوں آدمیوں کی پوری پوری زندگیاں بھی اس کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ امید کریں کہ ہماری زندگی میں، اس کے پورے نتائج سامنے آ جائیں گے تو یہ غلط امید ہوگی، یہ کھجور کا درخت لگانا ہے، جو اس کو بوتا ہے، وہ اس کے پھل نہیں توڑ سکتا۔ ہم اس درخت کو لگائیں گے اور اپنے خون جگر سے اس کو سینچ کر چلے جائیں گے۔ ہمارے بعد دوسری نسل آئے گی اور شاید وہ بھی اس کے پھلوں

سے پوری طرح لذت سے آشنا نہ ہو سکے گی۔ کم از کم دو تین پشتیں اس کے پورے نتائج ظاہر ہونے کے لیے درکار ہیں۔ لہٰذا ہمیں نتائج کے لیے بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کا نقشہ ٹھیک، جیسا کہ ہم بنا سکتے ہیں، بنا دیں اور اس کی بنیادیں اٹھا کر نئی آنے والی نسل کو تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لیے تیار کر دیں۔ اس سے زیادہ غالباً ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔" (وثائق مودودی)

مولانا مودودیؒ نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جس جدوجہد اور طریق کار کا آغاز کیا وہ تو یقیناً بہت حد تک نیا تھا لیکن خود حکومت الٰہیہ کا تخیل کوئی نئی چیز نہ تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ خلافت علی منہاج النبوۃ کی پیشں گوئی حضور اکرمؐ کے ارشادات میں موجود ہے۔ امام شاطبی نے جو روایت "موافقات" میں درج کی ہے، یہ ہے۔

"تمہارے دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جل جلالہٗ اس کو اٹھا لے گا۔ پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر بداطوار بادشاہی ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گی پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر وہی خلافت بطریق نبوت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی۔"

خلافت علی منہاج النبوۃ کا یہی تخیل حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ" اور خصوصاً "ازالۃ الخفا" میں تفصیل سے مندرج ہے۔ "ازالۃ الخفا" میں شاہ صاحب نے اسلامی خلافت اور بادشاہت کو دو بالکل الگ اور متباین چیزیں قرار دیا ہے اور اسلامی حکومت کی خصوصیات اور برکات کو نہایت خوبی سے الم نشرح کیا ہے۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ بعض حوالوں سے مولانا مودودیؒ کی تحریک اسلامی ولی اللہی فکر کی توسیع ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

حضرت مظہر جان جاناں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سنت نبویؐ کی اتباع تمام مجاہدات اور ریاضیات سے افضل ہے اور اسی سے وہ نسبت محمدیہ پیدا ہوئی ہے جس کا دوسرا نام صحت کا طرح مولانا کی زندگی اتباعِ سنت اور تمسک بالقرآن ہی کی کوشش سے عبارت تھی۔ "وثائق مودودی" میں مولانا کی پہلی بار منظر عام پر آنے والی تحریریں اپنے اندر وہ تمام اجمال سمیٹے بیٹھی ہیں جن کی تفاصیل مولانا کے متعدد علمی اور تحریکی کارناموں میں بالتفصیل درج نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں میں مولانا کے لیل و نہ

کی بے چینیاں مسلم نشاۃ ثانیہ کے باب میں دلسوزی، مسلم ہندوستان کی بیداری کی کاوشیں، کچھ کر گزرنے کے اٹوٹ اور سوز یقین سے لبریز جذبے اور عہد جدید کے تقاضوں کی تفہیم اور بتعبیر غرض وہ تمام مقدمات شامل ہیں جو بعد میں شرح و بسط کے ساتھ ان کی مختلف تحریروں میں جلوہ گر ہوئے۔ ۲۶ مارچ ۱۹۳۷ء کے خط کی یادداشت کا ایک اقتباس یہ ہے:

"ہمیں ایک طرف روح قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا اور اپنی قوت فکر و عمل کو اصول اسلامی سے پوری طرح متحد کرنا ہے دوسری طرف علم کی ان کی ترقیات اور احوال کے ان تغیرات کا پورا پورا جائزہ لینا ہے جو گزشتہ آٹھ سو برس کی مدت میں ہوئی ہیں اور تیسری طرف صحیح اسلامی طریق پر افکار و معلومات کو مرتب اور قوانین حیات کو مدون کرنا ہے تاکہ اسلام پھر سے بالفعل ایک قوت متحرکہ (DYNAMIC FORCE) بن جائے اور دنیا میں مقتدی بننے کی بجائے مقتدا اور امام بن کر رہے"۔

بیسوی صدی میں حرکی اسلام کا یہ تصور مولانا سے پہلے اگر کسی شخص نے پیش کیا تو وہ علامہ اقبال تھے، یوں تو دیکھا جائے تو مولانا کی فکریات میں علامہ کے حرکی نظریہ اسلام کا روپ رس بھی شامل ہوا ہے۔ اس باب میں علامہ سے مولانا کی ملاقات اور اقبال کے مشورے پر مولانا کا دکن سے پنجاب منتقل ہونا اور دارالاسلام (پٹھان کوٹ) کا قیام توجہ طلب امور ہیں۔ مولانا کی نثری تحریروں میں علامہ اقبال سے ان کی محبت پھوٹ پڑتی ہے اسلامی فقہ کی تدوین جدید کے مسئلے پر علامہ مولانا سے معاونت کے متمنی تھے لیکن افسوس کہ علامہ کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ہو سکتا ہے کہ ان دو عظیم دماغوں کے باہمی تعامل اور توافق سے اسلام کی تعبیر جدید کہیں زیادہ باثروت ہو سکتی۔ علامہ کی خواہش یہ بھی تھی کہ مولانا بادشاہی مسجد کی خطابت قبول کرلیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا ایک بار پھر ان سے جلد مل لیں تاکہ بعض ضروری تفصیلات طے ہو جائیں لیکن قدرت کی طرف سے علامہ کو یہ مہلت نہ مل سکی (وثائق مودودیؒ) میں ۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء والا سید نذیر نیازی مرحوم کا خط بنام سید مودودیؒ تو شائع ہو چکا ہے، لیکن سید صاحب کے اقبال کی وفات پر سید نذیر نیازی کے نام خط سے جو مکمل صورت میں پہلی بار سامنے آیا ہے، جہاں علامہ کی بے مثال شخصیت سے مولانا کی محبت و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے وہاں یہ مکتوب خدا پر ان کے یقین اکمل کا بھی آئینہ دار ہے دیکھئے یہ سچا مؤحد کیا لکھتا ہے۔

" محمد علی کے بعد یہ دوسرا نقصان عظیم مسلمانوں کو پہنچا ہے اور یہ نقصان میری نگاہ میں پہلے نقصان

سے عظیم تر ہے کچھ خبر نہیں کہ اللہ کو کیا منظور ہے بظاہر تو ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان قوم کو اس کی ناقدری اور نااہلی کی سزا دی جا رہی ہے کہ اس کے بہترین آدمی اس وقت اٹھائے جاتے ہیں جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اب سارے ہندوستان پر نگاہ ڈالتا ہوں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی طرف ہدایت حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا جا سکے۔

مجھے جو چیز پنجاب کھینچ کر لائی تھی وہ دراصل اقبال ہی کی ذات تھی۔ میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کروں گا اور ان کی رہنمائی میں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا اسلام اور مسلمانوں کے لئے کروں گا۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اس طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا۔ دل شکستگی اپنی آخری حد کو پہونچ گئی ہے صرف اس خیال سے اپنے دل کو ڈھارس دے رہا ہوں کہ اقبال مرگئے تو کیا ہوا خدا تو موجود ہے .... میں چاہتا تھا کہ ان کے پس ماندگان کو تعزیت کا خط لکھوں مگر پھر خیال آیا کہ ان کے پس ماندے تو ہم سب ہیں اور ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں" (وثائق مودودیؒ)

ذرا تصور فرمایئے کہ ۱۹۳۸ء میں علامہ کے وفات کے وقت اور اس کے چند سال بعد تک متحدہ ہندوستان میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم جیسے کئی اکابر موجود تھے جو اپنے اپنے انداز میں خدمت اسلام میں لگے ہوئے تھے لیکن مولانا مودودیؒ کو اقبال کے بعد ہندوستان بھر میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی طرف ہدایت حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا جا سکے۔ اس کا سبب ظاہر ہے مولانا مودودیؒ اسلام کے جس حرکی تصور کے قائل تھے جس میں خانقاہی اسلام کے لئے کوئی ایسی خاص گنجائش نہ تھی۔ وثائق مودودیؒ ہی میں ایک جگہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تدین، تقویٰ اور علم وفضل کا اعتراف کرنے کے بعد لکھتے ہیں، کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ نہیں چل سکیں گے کیونکہ انھوں نے اپنا دامن ماضی سے اس درجہ باندھ لیا ہے کہ حال اور مستقبل سے عملاً بے تعلق ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ــــــ

" میں ایک سخت (ORTHODOX) آدمی ہوں مگر میری (ORTHODOXY) اس طرز کی ہے جو ابن تیمیہؒ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اپنے اپنے زمانوں میں تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اسلامی اصول سے تو ہم بال برابر نہ ہٹیں مگر زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ان اصولوں کے انطباق میں وہی لچک اختیار کریں جو صدر اول کے مجتہدین نے اختیار کی تھی جس کو چوتھی صدی کے بعد جمود سے بدل دیا گیا۔"

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ طرز فکر اور اس پر مبنی ان کی تحریریں روایت سے سر مو انحراف نہ کرنے والے علماء کے لئے کسی طرح ہمارے لئے قابل قبول نہ ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ جلد ہی ان کے خلاف ضلال اور بدعت کے فتاویٰ کا طومار بندھ گیا۔ بلکہ وہ علماء بھی جو انھیں کبھی "متکلم اسلام" کہا کرتے تھے اب انھیں اماں کی

جماعت کو خوارج ، معتزلی اور نہ جانے کیا کیا قرار دینے لگے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے صالح اور متقی علماء نے ان کے لئے ٹٹ پونجئے، بدبخت اور خبیث جیسے لفظ استعمال کئے۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہونے والی کتاب سے ، جس میں مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند اور مولانا حسین احمد مدنی کی مراسلت شائع ہوئی ہے ، اندازہ ہوتا ہے کہ مدنی صاحب نے فتاویٰ کا یہ طومار محض ان چند اقتباسات کی بنیاد پر باندھا تھا جو مولانا کی کتابوں کے متن سے کاٹ چھانٹ کر نکال لئے گئے تھے۔ یہی حال ان دیگر دارالافتاؤں کا تھا جہاں سے فتاویٰ کی کھیپیں نکل رہی تھیں۔ مولانا کی شخصیت کا یہ حیرت انگریز کمال ہے کہ اس تمام تر کے باوجود ان کا توازنِ فکری اور ان کا تمکین شخصی کبھی متزلزل نہ ہوا۔ مولانا جانتے تھے کہ پاک و ہند کی یہ سرزمین جہاں رفع سبابہ پر انگلیاں کاٹ ڈالی جاتی تھیں اور جہاں قرآن کا فارسی ترجمہ کر دینے جانے پر پہونچے اتار لئے جاتے تھے ایسے فتاویٰ کا شہود کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں۔ واقعی جب سفر طویل ہو اور منزل دور تو راستہ کے کانٹوں سے الجھنا اپنی منزل کھوٹی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

مولانا مودودیؒ پر ان علماء کی جانب سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ کسی مدرسہ دینی سے سند یافتہ نہیں مثلاً مولانا یوسف بنوری نے لکھا ہے: " بدقسمتی سے نہ کسی دینی درسگاہ سے فیض حاصل کر سکے نہ جدید علوم کے گریجویٹ بن سکے"۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی صاحب نے لکھا " مودودی جماعت کے افسر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں وہ کسی معتبر اور معتمد علیہ عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک صاحب نے یہ کارنامہ بھی کر دکھایا کہ کلمہ طیبہ مولانا مودودی مرحوم کے پاس اس غرض سے لکھ بھیجا کہ اس کی صرفی و نحوی ترکیب بتا دی جائے۔" وثائق مودودی" "مودودیات" میں اس اعتبار سے ایک گراں بہا اضافہ ہے کہ اس میں پہلی بار مختلف اوقات میں مدارس دینیہ سے حاصل کی گئی مولانا مودودیؒ کی چار سندات فضیلت شامل ہیں۔ پہلی سند مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد سے جاری کی گئی ہے۔ یہ مولوی کلاس کی سند ہے۔ اس میں ایک مضمون عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ کا بھی تھا۔ سن ۱۹۲۶ء کی سند فراغت سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے مولانا محمد شریف اللہ خاں مدرس دارالعلوم فتح پوری دہلی سے علوم عقلیہ وادبیہ بلاغت اور علوم اصلیہ و فروعیہ میں کسب فیض کیا۔ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری دہلی سے جاری کردہ سند ہائے فراغت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اس عرصہ میں حدیث فقہ ادب اور جامع ترمذی اور موطا امام مالک کے سمع وقرأت کی تکمیل مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی کے زیر تدریس رہ کر کی۔ مولانا کے بعض معترضین ان شواہد کی روشنی میں اپنی آراء سے رجوع کر لینے پر مجبور ہوں گے۔

مسلم نشاۃ ثانیہ کی اہم شق دین حقہ کی تبلیغ بھی ہے مولانا مودودیؒ نے اپنے قیام دکن کے زمانہ میں ۱۹۳۳ء ممالک محروسہ میں تبلیغ اسلام کا ایک جامع منصوبہ بھی بنایا تھا۔ اس منصوبے کی دستاویز "وثائق مودودی" میں شامل ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تبلیغ وارشاد کے لئے جس حکمت کی اور دعوت کے لئے جس توازن فکر و فرہنگ اور جس معروضیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا اس سے پوری طرح واقف تھے اگر نواب سالار جنگ اس اسکیم کو منظور کر لیتے تو شاید دکن کو وہ دن نہ دیکھنے پڑتے جو تقسیم ملک کے بعد اسے دیکھنے پڑے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا روایتی مسلم علماء کی فضیلت اور علم کے تو قائل ہیں لیکن ان کی مریضانہ موضوعیت اور انفعالیت سے بدکتے ہیں۔ چنانچہ خانقاہ سے بیزار نہیں خانقاہیت سے بیزار ہیں۔ ۱۲؍اگست ۱۹۳۵ء کے ان کے ایک خط کی یادداشت جو وثائق مودودی میں شامل ہے بہت چشم کشا ہے۔ ان کے خیال میں صوفیائے اسلام نے اصحاب صفہ کے نمونہ پر خانقاہی سلسلہ قائم کیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک بہترین انسٹی ٹیوشن تھا جس سے بڑے بڑے آدمی ہوئے۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے اس میں ترمیم کر کے از سر نو جان ڈالی جائے اور ہندوستان میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ایسی قائم کی جائیں جن میں فارغ التحصیل لوگوں کو کچھ عرصہ تک رکھ کر اسلام کے متعلق نہایت صالح لٹریچر کا مطالعہ کرایا جائے اور اس کے ساتھ وہاں ایسا ماحول ہو جس میں زندگی بسر کرنے سے ان کی سیرت خالص اسلامی رنگ میں رنگ جائے . . . . اس کا صدر ایسا شخص ہونا چاہئے جو نہ صرف ایک وسیع النظر اور روشن خیال عالم ہو بلکہ اس کے ساتھ ایک سچا اور مکمل عملی مسلمان بھی ہو۔"

وثائق مودودی" مولانا مودودیؒ کی ابتدائی تحریکی زندگی کے بارے میں جامع اور گرانمایہ معلومات کا ایک نادر ذخیرہ ہے اس میں شامل مولانا کی ابتدائی تحریروں میں بھی جرح و تعدیل اور جانچ پرکھ کا وہی رویہ نظر آتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء سے ہمکنار ہوا، اور جو آخر میں مولانا کا طرۂ امتیاز قرار پایا۔ اس کتاب میں مولانا کے سواد تحریر کے ایسے عکس بھی شامل ہیں جو بارہ سال کی عمر میں لکھے گئے اور جن کا موضوع سیرت نبویؐ ہے اسی طرح مولانا کے سواد تحریر پر مبنی تاریخ دکن کا وہ طویل خاکہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جس کی تفصیلات اور مراجع کو طول طویل فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا میں علمی لگن کس درجے کی تھی اور وہ کسی موضوع سے انصاف کرنے کے لئے کس قدر ہوم ورک کیا کرتے تھے۔

مولانا مودودی کا خاندان مشائخ کا خاندان تھا لیکن یہ خاندان کبھی شاہی درباروں سے وابستہ نہ رہا۔ مولانا کے لئے بڑا آسان کام تھا کہ وہ اپنی موروثی گدی سنبھال لیتے۔ میں سلسلہ پیری مریدی کا مخالف اور اس کی نافعیت کا منکر نہیں ہوں لیکن یہ کام حالتِ امن میں تو بہت مفید بلکہ ضروری ہے لیکن حالت جنگ میں اتنا نافع نہیں رہتا۔ اسلام کئی صدیوں سے مسلسل حالتِ جنگ میں ہے چنانچہ ایسے ہی وقت میں متحدہ ہندوستان میں مولانا نے اپنے لئے ایک خارزار راستے کا انتخاب کیا جو ہر کہ ومہ کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ انھوں نے دین کو اس کی کلیت میں سمجھنے کی کوشش کی اور اس جمود اور خمود کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جو صدیوں سے مسلم نشاۃ ثانیہ کے رستے میں حائل تھا۔ انھوں نے کھجور کا ایک درخت لگایا اور آپ جانتے ہیں کہ کھجور کے درخت کا پھل اگلی نسل کے نصیب میں ہوتا ہے مولانا نے فکر و نظر ایمان و آگہی کے جس قافلے کو جادہ پیما کیا اسے آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ انھوں نے اس سفر کو تسلسل سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنی لکریات کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے، اس کی مقبولیت معروضی ہونا چاہئے اور یہ بات ہمہ وقت ذہن میں رہنی چاہئے کہ فکر و تعبیر کی دنیا میں ہر شے حتمی نہیں ہوتی۔ وفات سے چند ماہ پہلے انھوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کو لکھا۔

"آپ کی تازہ کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کا ایک نسخہ بھی موصول ہوا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری جن چیز کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی۔ مزید میری جن جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لئے مضرت رساں یا موجب خطر کہتے ہیں، ان پر بھی بلا تکلف تنقید فرمائیں۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا۔ نہ میں اس پر برا مانتا ہوں۔"

لُقطہ کا شرعی حکم

محمد اسلام عمری۔ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

لغت میں لقطہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے " ھوالشی المتروک لا یعرف لہ مالک[۱]" "پڑی ہوئی چیز جس کا مالک معلوم نہ ہو" مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ" وہ چیز جو تم کو راستہ میں پڑی ہوئی ملے اور تم اس کو اٹھا لو"[۲] لقطہ کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو عام طور پر اس سے معمولی اور کم قیمت کی گری پڑی چیزوں کا تصور ذہن میں آتا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ لقطہ قیمتی چیز بھی ہوسکتی ہے اور معمولی چیز بھی مثلاً گھڑی، زیور اور جدید دور کے حالات کے مطابق سینکڑوں اور ہزاروں روپے کا چیک اور ڈرافٹ بھی ہو سکتا ہے۔" جس طرح اس کا اطلاق غیر معمولی چیزوں پر ہوتا ہے اسی طرح اس کا اطلاق معمولی چیزوں پر بھی ہوتا ہے"[۳] لقطہ کو لُقطہ کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے۔" زمین پر پڑی ہوئی چیز جس کا مالک معلوم نہ ہو وہ بغیر ملکیت کے ہوتی ہے اور آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے"[۴] اس کا معنی ' زمین سے اٹھانا ' بھی ہے[۵] ساتویں صدی کے مشہور لغوی علامہ ابن اثیر[۶] نے لُقطہ کا معنی احادیث کی روشنی میں بیان کیا ہے اور بڑی اچھی بحث کی ہے۔ آٹھویں

---

[۱] المنجد، مادہ ل، ق، ط [۲] مصباح اللغات : ۷۸۵ مکتبہ برہان، جامع مسجد دہلی ۱۹۶۷ء
[۳] الشیخ احمد رضا متن اللغہ ۱۹۶/۵ مکتبۃ الحیات، بیروت ۱۳۸۰ھ
[۴] سعید الخوری: اقرب الموارد فی فصح العربیۃ والشوارد : ۱۱۵۵، بیروت جلیلہ ۱۸۸۹ء
[۵] مجدالدین محمد فیروز آبادی، القاموس المحیط ۳۸۳/۲ طبع چہارم مطبع دار المامون ۱۹۳۸ء [۶] ۶۰۷ھ
[۶] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ۲۶۴/۴ عیسیٰ البابی، الحلبی سنہ ندارد

صدی ہجری کے معروف لغوی ابن منظور نے بھی ابن اثیر کی پوری بحث لسان العرب میں نقل کر دی ہے[1] وحیدالزماں حیدرآبادی جو تیرہویں صدی ہجری کے ہیں انھوں نے ابن اثیرؒ اور ابن منظور کی عبارت کا ترجمہ کرکے اپنی "لغات الحدیث" میں شامل کرلیا ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ حدیث میں آتا ہے، ولاتحل لقطتھا الالمنشد مکہ کی پڑی ہوئی چیز کا اٹھانا کسی کے لئے درست نہیں مگر جو اس کو بتلائے، ابن اثیر اس میں وسعت پیدا کرکے یہی کہتے ہیں کہ کسی ملک کی پڑی ہوئی چیز کا اٹھا لینا اور استعمال کرلینا درست نہیں مگر جب ایک سال تک اس کا اعلان کرتا رہے، اس کے بعد مالک نہ آئے تو استعمال کرسکتا ہے۔ مکہ کے لقطہ اور دوسرے ملکوں کے لقطہ میں یہی فرق ہے کہ مکہ کا لقطہ ایک سال کے اعلان کے بعد بھی اپنے استعمال میں نہیں لایا جاسکتا۔ بلکہ اس کے مالک کے آنے تک مسلسل اس کا اعلان کرنا ہوگا کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مکہ اور غیر مکہ کے لقطہ میں کوئی فرق نہیں ہے[2] فقہاء کرام نے ایک باریکی یہ نکالی ہے کہ گری پڑی چیز اگر جان دار ہو تو اسے ضالہ کہیں گے اور اگر بے جان ہو تو اسے لقطہ کہیں گے اس کے بعد دونوں کے احکام بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں[3]

اسلام کے نظام قانون کا مطالعہ کرنے سے اس کی جامعیت معلوم ہوتی ہے۔ جب ماحول اور سماج میں لوگوں کو اپنے جان و مال کی حفاظت کے علاوہ ایسی فضا تیار ہو جائے کہ کسی کی گم شدہ چیز پوری حفاظت کے ساتھ اس کے مالک تک پہونچا دی جائے تو کسی کی کوئی چیز گم ہونے کے باوجود بھی ضائع نہیں ہوسکتی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ چیزوں کے گم ہوجانے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری چیز فلاں کو ملی ہے لیکن وہ حوالہ کرنے پر آمادہ نہیں ہے اس وجہ سے وہ شخص اس سے بدگمان ہو جاتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے یہی بہتر ہے۔ آدمی کے ذہن میں جب تک آخرت کا تصور غالب رہتا ہے اس وقت تک اس سے ایسا کوئی غلط کام سرزد نہیں ہوتا۔ کسی کی گری پڑی چیز اٹھا کر رکھ لینا اور واپس نہ کرنا آخرت کے تصور سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ معمولی قیمت کے لقطہ پر تو اعلان کیا جاتا ہے لیکن قیمتی چیزوں کے مل جانے پر بجائے اعلان کے اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ شریعت کے نقطہ نظر سے یہ بات انتہائی غلط ہے۔

<u>لقطہ کی قسمیں</u> لقطہ کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں معمولی اور غیر معمولی قسم کی چیزیں۔ معمولی قسم کی

---

[1] دیکھئے۔ لسان العرب ۷/ ۳۶۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: وحیدالزماں حیدرآبادی، لغات الحدیث ۵/ ۵۵ کارخانہ تجارت کتب کراچی، سنہ ندارد

[3] تفصیل کے لئے دیکھی جائے: بدائع الصنائع: ۶/ ۲۰۰ طبع اول، الجمالیہ، مصر ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء

چیزوں کے استعمال کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ احادیث کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا استعمال کر لینا جائز ہے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایسے راستے سے ہوا جہاں ایک کھجور پڑی ہوئی تھی اسے دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو یہ خطرہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کی ہوگی تو اٹھا کر کھا لیتا[1]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معمولی چیز استعمال کی جا سکتی ہے، اس کا اعلان کرنا ضروری نہیں اور اٹھا لینے والا اس کا مالک ہو جاتا ہے[2]۔ حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ گھر آئے تو حضرات حسنین کو روتے ہوئے پایا، حضرت فاطمہؓ سے وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ وہ اس انتظام کے لئے باہر نکلے تو بازار میں ایک دینار مل گیا، اسے لے کر گھر آگئے، حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ فلاں یہودی کے یہاں سے آٹا آجانا چاہئے۔ چنانچہ وہ لینے کے لئے اس کے یہاں گئے اور خرید بھی لیا لیکن اس یہودی نے کہا کہ تم اس پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد ہو اس لئے آٹا بھی لیتے جاؤ اور دینار بھی۔ پھر حضرت فاطمہؓ نے اس دینار سے گوشت خریدنے کی خواہش ظاہر کی، اس مقصد کے تحت حضرت علیؓ ایک قصاب کے یہاں گئے اور دینار کو دو درہم میں رہن رکھ کر گوشت لے آئے، حضرت فاطمہؓ نے روٹی اور گوشت تیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعوت دی، آپ کی آمد کے بعد حضرت فاطمہؓ نے کھانے کی ساری کیفیت بتا دی، آپ نے فرمایا کہ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دو۔ اس وقت جب کہ یہ گفتگو چل رہی تھی کہ ایک لڑکا وہ دینار تلاش کرتے ہوئے ان کے دروازے تک آیا۔ اس سے پوچھا گیا تو بتایا "کہ اس کا یہ دینار بازار میں گم ہو گیا تھا، آپ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ اس قصاب کے پاس جا کر کہو کہ وہ دینار واپس کر دے اور درہم کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ اس نے آپ کے حکم کے مطابق دینار واپس کر دیا پھر آپ نے وہ دینار اس لڑکے کو دے کر واپس کر دیا[3]۔

لقطہ کا ایک سال کے اعلان کر دینے کے بعد پانے والا اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ لیکن ضالہ اس کی ملکیت نہیں ہوگی کیوں کہ لقطہ کا اٹھانا ملکیت کی غرض سے اور ضالہ کو پناہ دینا حفاظت کی غرض سے ہوتا ہے۔ امام اوزاعیؒ کا خیال ہے کہ اگر لقطہ مال قلیل ہو تو اعلان کیا جائے اور اگر کثیر ہو تو کم وقت یا بیت المال کے حوالہ کر دیا جائے۔ امام موصوف کا یہ قول جمہور علماء کے خلاف ہے، امام بخاریؒ بھی

---

[1] بخاری کتاب اللقطہ، باب اذا وجد تمرۃ فی الطریق۔ مسلم: کتاب الزکوٰۃ، باب تحریم الزکوٰۃ علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم [2] سبل السلام، ۲/۵۱ [3] ابوداؤد: کتاب الزکوٰۃ، باب اللقطہ۔

اس کے خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنی صحیح بخاری میں " باب من عرف اللقطہ ولم یدفعھا الی السلطان" کا باب باندھ کر ان کے اس قول کی تردید کی ہے[۵]۔ منطقی طور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر معمولی چیز ہو تو اعلان کیا جائے اور اس کے استعمال کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک یہودی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک یہودی تجارت کی غرض سے کہیں گیا وہاں اسے رقم کی ضرورت پڑی، کسی سے اس شرط پر قرض لیا کہ اسے جلد واپس کر دے گا، اس نے وہاں اپنا کام پورا کر لیا اور وطن لوٹ گیا، وہاں رقم لوٹانے کے لئے کوئی آدمی نہیں ملا، چنانچہ اس نے ایک لکڑی لی، اسے پھاڑ کر اس میں ایک سو دینار اور ایک خط رکھ کر جوڑ دیا اور سمندر میں ڈال دیا، وہ بہتا ہوا اس ملک کے ساحل پر پہونچ گیا، اتفاق سے وہ شخص جس نے قرض دیا تھا وہ سمندر کے ساحل پر تاجروں کا انتظار کر رہا تھا اس درمیان اس نے ایک بہتی ہوئی لکڑی دیکھی، اسے اٹھا کر جلانے کے لئے گھر لے آیا، اسے پھاڑا تو اس میں رقم اور ایک خط موجود تھا۔ امام موصوف نے اس واقعہ کو کتاب اللقطہ میں لا کر یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ معمولی چیز استعمال کی جا سکتی ہے[۶]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت محمدی میں اس سے پہلے کی شریعتوں کے احکام بھی باقی رکھے گئے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ شریعت محمدی میں جس فعل کی تعریف کی گئی ہو چاہے اس کا تعلق ما قبل کی شریعت ہی سے کیوں نہ ہو اور وہ شریعت محمدی سے ٹکراتا نہ ہو تو وہ اس شریعت کا ایک جزو قرار پائے گا[۷]۔

لقطہ کا مل جانا بعض اوقات ایمان و عقیدہ کے امتحان کا سبب بن جاتا ہے، اس امتحان میں کامیابی کی ضمانت اس صورت میں ہے کہ اس کا اعلان کر کے اس کے اصل مالک تک پہونچا دیا جائے موجودہ دور میں اعلان کرنے کے کئی ذرائع ہو سکتے ہیں۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ اس میں معاون ہو سکتے ہیں۔ آج کے اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ تو اس اعلان سے خالی نہیں رہتے کہ فلاں چیز یا فلاں شخص گم ہو گیا ہے کسی کو ملے تو اس کے مالک تک پہونچا دے۔ لیکن یہ اعلان بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ فلاں چیز ہم کو ملی ہے جس کسی کی ہو آ کر حاصل کر لے۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اعلان کے دوسرے طریقے رائج تھے فقہا نے اس ماحول کو سامنے رکھ کر اس کے اعلان کا طریقہ اور اس کی جگہ تک کی صراحت اس طرح کی ہے۔

التعریف یکون فی مظان اجتماع الناس	لوگوں کے اکٹھا ہونے کی جگہوں پر اعلان کرنا چاہئے
من الاسواق وابواب المساجد والمجامع الخ[۸]	مثلاً بازار، مساجد کے دروازے اور مجمع عام میں اعلان

[۵] دیکھئے صحیح بخاری: ۱/۳۲۹ [۶] بخاری: کتاب اللقطہ، باب اذا وجد الخشبہ فی البحر [۷] ملاحظہ ہو ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ۵/۳۵

[۸] محدث احمد علی سہارنپوری علی حاشیہ للبخاری ۱/۳۲۷ [illegible]

اس طرح کرنا چاہئے۔

من ضاع لہ شئی فلیطلبہ عندی یعنی — جس کا کوئی سامان گم ہو گیا ہو وہ مجھ سے آکر لے لے

فضۃ او ذھبا — چاہے وہ سونا ہو یا چاندی

لقطہ کے اعلان میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اعلان کرتے وقت اس کی ساری علامتیں نہ بیان کر دی جائیں بلکہ اس طرح اعلان کرنا چاہئے جس سے سننے والے کو صرف یہ معلوم ہو کہ اس کو کوئی چیز ملی ہے۔ لقطہ کی پوری علامات کے اعلان پر قوی اندیشہ اس بات کا ہے کہ وہ اس کے اصل مالک تک نہ پہنچ پائے، ہر شخص اس کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس طرح مال کے ضائع و برباد ہو جانے کا خطرہ ہے[1]۔ احادیث سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور لقطہ کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اس کا ڈھکن اور بندھن پہچان لو پھر اس کا ایک سال تک اعلان کرو اگر اس کا مالک آجائے تو اس کا حق ہے ورنہ تم اس کے مالک ہو۔ اس نے پھر سوال کیا کہ اگر گمشدہ بکری مل جائے، آپ نے فرمایا وہ تمہاری یا تمہارے بھائی یا بھیڑیئے کی ہے۔ اس نے پھر پوچھا کہ اونٹ کا کیا حکم ہے۔ اس سوال پر آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم کو اس سے کیا، اس کے ساتھ اس کا مشکیزہ اور اس کے جوتے ہیں پانی پر جائے گا اور درخت کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو تلاش کر لے گا[2]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ کی علامتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ جب اس کا مالک آجائے اور علامتیں ٹھیک ٹھیک بیان کر دے اگر وہ اصل صحیح ہو تو مال اس کے حوالہ کر دینا چاہئے۔ اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے کہ وہ تمہاری یا تمہارے بھائی کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس کو پکڑ کر اپنی حفاظت میں نہیں لیتے ہو تو دوسرا بھائی جو اس کا مالک ہے وہ اس کو پالے گا۔ لیکن یہ دوسرا معنیٰ درست نہیں پہلا مفہوم جو حدیث سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ تمہاری یا تمہارے کسی دوسرے بھائی کی ہے یہی بہتر ہے بکری اور اونٹ میں فرق کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ اونٹ اس بات سے بے نیاز ہے کہ کوئی اسے چارہ پانی دے، اسی طرح وہ موذی جانوروں سے حفاظت کرنے میں دوسروں کی مدد کا محتاج بھی نہیں ہے بلکہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ پانی پی لے تو وہ ہفتوں کے لئے کافی ہوتا ہے اور اس کے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں۔ لمبی مسافت بھی طے کر سکتا ہے۔ گردن لمبی ہوتی ہے خود ہی درختوں سے پتے بھی

---

[1] ابن قدامہ المقدسی المغنی ۵/ ۶۹۷   [2] حوالہ سابق

[3] بخاری، کتاب اللقطہ، باب ضالۃ الابل، مسند احمد ۴/ ۱۱۷

کھا سکتا ہے، اس کے برخلاف بکری دوسروں کی مدد کی محتاج ہے بھیڑیا اسے بڑی آسانی سے اپنا لقمہ بنا سکتا ہے۔ اس لئے گم شدہ بکری کو حفاظت میں رکھ لینے کی تاکید کی گئی ہے[1]

لقطہ کا اعلان: لقطہ کے اٹھا لینے سے اس کا اعلان ضروری ہو جاتا ہے۔ علماء سلف کا اس امر میں ضرور اختلاف ہے کہ لقطہ کا اٹھا لینا بہتر ہے یا چھوڑ دینا۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ اٹھا لینا بہتر ہے کیونکہ ایک مسلمان پر اس کے دوسرے مسلمان بھائی کے مال کی حفاظت فرض ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اسے چھوڑ دینا افضل ہے کیونکہ اٹھا لینے میں بہت ذمہ داریاں ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لقطہ کا اٹھا لینا واجب ہے[2]۔ لقطہ کے بارے میں جب یہ معلوم ہو جائے کہ میں نہیں اٹھاؤں گا تو ضائع ہو جائے گا ایسی صورت میں اٹھا لینا مندوب ہے، لیکن اگر اس بات کا خوف ہو کہ ضائع نہیں ہو جائے گا تو اٹھا لینا مباح ہے اسی طرح اپنے لئے اٹھا لیا جائے اور اعلان نہ کیا جائے تو حرام ہے[3]۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ ملنے کے بعد اس کا اعلان کرنا چاہئے۔ سوید بن غفلہ کہتے ہیں کہ میں اور زید بن صوحان اور سلمان بن ربیعہ تینوں غزوہ کے لئے نکلے، راستے میں مجھے ایک کوڑا ملا میں نے اٹھا لیا، میرے دونوں ساتھیوں نے کہا کہ اسے یہیں چھوڑ دو، میں نے کہا نہیں میں اس کا اعلان کروں گا۔ غزوہ سے واپس آنے کے بعد میں نے حج کا ارادہ کیا اور مدینہ پہونچ کر حضرت ابی بن کعبؓ سے ملاقات کی، نیز ان کو ساتھیوں کی گفتگو اور کوڑے سے باخبر کیا، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مجھ کو بھی ایک تجوری ملی تھی، جس میں سو دینار تھے، اسے لے کر میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ نے فرمایا اس کا ایک سال تک اعلان کرو میں نے ایک سال تک اعلان کیا پھر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کا مالک نہیں آیا ہے، آپؐ نے فرمایا: پھر ایک سال تک اعلان کرو، اس کے بعد بھی مزید ایک سال اعلان کرنے کا حکم دیا[4]۔

زید بن خالد کی روایت پہلے آچکی ہے جس سے لقطہ کے اعلان کی مدت ایک سال معلوم ہوتی ہے اس طرح بظاہر ایک سال تک اعلان کرنے والی اور کئی سالوں تک اعلان کرنے والی حدیثوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اس میں تطبیق کی صورت یہ ہے جسے

---

[1] نووی: شرح مسلم ۲/ ۷۹ [2] سبل السلام ۳/ ۱۵ [3] بدائع الصنائع ۶/ ۲۰۰

[4] بخاری، کتاب اللقطہ، باب اذا اخبرہ رب اللقطہ بالعلامہ دفع الیہ

قاضی عیاضؒ نے اختیار کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت جس سے اعلان کی مدت تین سال معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت اس کے راوی کو تین سال اور ایک سال کے الفاظ کے درمیان شک ہے۔ "قال لا ادری بثلاثہ احوال او حول واحد" یہ راوی کا تذبذب ہے اور یہ صحیح حدیثوں کے مقابل میں قابل قبول نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زید بن خالدؓ کی روایت سے صرف ایک سال اعلان کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے اسے اس بات پر محمول کیا جائے کہ اعلان کی کم سے کم مدت ایک سال ہے اور ابی بن کعب کی روایت کو زیادتی پر محمول کیا جائے یعنی احتیاط اور فضیلت کا تقاضا ہے کہ کئی سالوں تک اعلان کیا جائے[1]

لقطہ کا اٹھانے والا اس کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کا حافظ ہوتا ہے۔ ملکیت اور عدم ملکیت کے سلسلہ میں فقہائے کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ احمدؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک ایک سال تک اعلان کرنے کے بعد وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ لقطہ کا اٹھانے والا اگر مالدار ہو تو اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایک سال تک اعلان کرنے کے بعد اسے صدقہ کر دے۔ البتہ امام شافعیؒ نے لقطہ سے استفادہ کے سلسلہ میں مالدار اور غریب کی کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابی بن کعب کے اس واقعہ سے ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گرے ہوئے مال کو اٹھانے کا حکم دیا تھا[2]۔

ابن قدامہ المقدسیؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی نے کوئی پڑی چیز اٹھالی ہو تو اس کے مالک کو واپس کرتے وقت اس کی حفاظت کی اجرت لے سکتا ہے جیسا کہ چوکیدار مال کی حفاظت اور نگرانی پر اجرت لیتا ہے[3]

لقطہ کی کس مقدار پر اعلان کیا جائے: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لقطہ کی مقدار کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ احادیث میں قلیل اور کثیر کی کوئی محدود مقدار نہیں بتائی گئی ہے۔ فقہاء نے اس کی مقدار کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] نووی شرح مسلم ۲/۷۹ ، شمس الائمہ سرخسی نے کہا کہ اگر لقطہ ایسی چیز ہو جو جلد ہلاک ہو جانے والی ہو اور اس کا مالک نہ آئے تو صدقہ کر دے۔ دیکھیے برہان الدین مرغینانی ہدایہ ۲/۵۹۴

[2] ترمذی ، ابواب الاحکام باب ما جاء فی اللقطہ وضالۃ الابل والغنم

[3] ابن قدامہ مقدسی ، المغنی ۵/۷۰۶ اسی طرح اگر اس نے جانور کو چارہ کھلایا ہو یا اعلان کرنے پر جو خرچ آیا ہو وہ بھی وصول کر سکتا ہے۔

قال مالک وابوحنیفہ لا یجب التعریف مالا یقطع بہ السارق وھو ربع دینار عند مالکٍ وعشرۃ دراھم عند ابی حنیفۃ

امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے کہا کہ اس مقدار پر اعلان کیا جائے جس مقدار پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور وہ امام مالک کے نزدیک ربع دینار اور ابوحنیفہ کے نزدیک دس درہم ہے۔[1]

امام احمد کے نزدیک قلت کی کوئی حد نہیں اور قیاس کے ذریعہ اس کی کوئی تحدید نہیں کی جاتی۔[2] مہر قلیل کی بھی کوئی تحدید نہیں ہے فقہا نے اس کی بھی تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ قطع ید یعنی چور کے ہاتھ کاٹنے کی مقدار پر قیاس کیا ہے۔ جونکہ چور کا ہاتھ ربع دینار امام مالک کے نزدیک اور دس درہم امام ابوحنیفہ کے نزدیک یا اس سے زیادہ کی مقدار پر کاٹا جاتا ہے اس لئے یہاں بھی اس قیاس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا کہ ربع دینار یا اس سے زیادہ کی مقدار پر اعلان کیا جائے اور اس سے کم پر نہیں۔
امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے لقطہ کے سلسلہ میں اعلان کی جو مقدار متعین کی ہے وہ صحیح نہیں ہے مہر کی مقدار کو قطع ید پر قیاس کرنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے جیسا کہ انھوں نے وضاحت بھی کی ہے۔ لیکن لقطہ کی وہ مقدار جس سے اعلان ضروری ہو اس کو نصاب سرقہ پر قیاس کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ان کا یہ استدلال اصولی اعتبار سے تو صحیح ہے کیونکہ مہر کی مقدار کی تحدید کرنے کے لئے نصاب سرقہ پر قیاس کیا لہذا وہ مقیس علیہ کہلایا پھر لقطہ کی مقدار کو بھی نصاب سرقہ پر قیاس کیا، مقیس کہلایا اور اصول فقہ کا مسئلہ اصول ہے کہ قیاس مقیس پر نہیں بلکہ مقیس علیہ پر کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔

اسی طرح اگر کسی کو لقطہ کی اتنی مقدار مل گئی ہو جس پر اعلان کرنا ضروری تھا لیکن پانے والا مرگیا تو اس کے ورثا اس کا اعلان کریں گے اور وہ ایک سال کے بعد اس کے وارث بھی ہو جائیں گے اگر صاحب مال ایک سال کے بعد آئے تو وارثین سے بھی اپنا مال وصول کرے گا جس طرح مورث سے بھی لے سکتا تھا۔[3]

ان تمام معروضات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام یہ معمولی چیزوں کی طرح معمولی چیزوں کی بھی تفصیلات کا کس طرح خیال رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو جانے سے بہت سے عقدۂ لاینحل بڑی آسانی کے ساتھ حل ہو سکتے ہیں۔ کتنی ہی جو غیر فطری مسائل داخل ہوگئے ہیں ان سے اسی کے ذریعہ نجات حاصل ہو سکتی ہے اور ایک خوش گوار ماحول تیار ہو سکتا ہے۔

---

[1] المغنی ۵/۶۹۸ [2] تفصیل کے لئے دیکھی جائے ہدایہ کتاب النکاح، باب المہر، مزید دیکھی جائے یہی تصنیف کتاب اللقطہ، مطبع مجتبائی، دہلی۔ ابن رشد نے اس قیاس کو انتہائی کمزور کہا ہے۔ وھذا النوع من القیاس مردود عند المحققین۔ ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد ۲/۲۰ دار المعرفہ، بیروت، لبنان ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن قدامہ المقدسی المغنی: ۵/۲۱ — ۲۰ء

تراجم واقتباسات

موزمبیق کے مسلمان
فاقہ کشی اور عیسائیت کے نرغہ میں

عربی سے ترجمہ۔ الطاف احمد قاسمی ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

اقوام متحدہ کی حالیہ شائع شدہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ موزمبیق شدید اقتصادی بحران کی وجہ سے بہت جلد افریقہ کے بھیانک خطہ میں تبدیل ہو جائے گا اور لکھو کھا باشندے قحط اور بھوک سے ہلاک ہو جائیں گے۔ اس صورت حال کی سنگینی کا شرح اموات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالیہ فی ہزار موت میں ۳۵۰ کا تناسب بچوں کا ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر اقوام متحدہ نے دنیا کے اصحاب خیر سے اپیل کی ہے کہ اہل موزمبیق کو اس خوفناک ہلاکت سے بچانے کے لئے لاکھوں ڈالر کا مالی تعاون پیش کریں، ادھر عالمی تنظیم نے ایک تہائی موزمبیق عوام کی معاشی امداد کے لئے ۲۴۷ ملین ڈالر کی مقدار خاص کردی ہے۔

عربیا الملا دالعرب، نے جون ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں موزمبیق مسلم شہری کے متعلق رپورٹ شائع کی۔ عربیا کا نامہ نگار مسلم عوام کے حالات کا قریب سے مطالعہ کرنے اور اس کے گذشتہ و موجودہ جدوجہد اور مذہبی حالات کا جائزہ لینے کے لئے موزمبیق پہونچا اور رپورٹ تیار کی رپورٹر کا کہنا ہے کہ تاریخ کے ایک لمبے عرصے کے درمیان موزمبیق کے مسلم باشندے جن جن مشکلات سے دو چار ہوئے پورے افریقہ کے مسلم باشندہ کو اس کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ موزمبیق کے مسلمان پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ دراز تک پرتگال سامراج سے برسرپیکار ہے کہ اس سخت کشمکش اور شدید جھڑپ کے باوجود، دنیا کا گمنام واقعہ بن کر رہ گیا۔ اور یہ وقت کا المیہ ہے کہ تاریخ کے صفحات اس اہم واقعہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں ساحل افریقہ پر مسلم حکومتیں بنیں، جس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ افریقہ کے بہت سارے جنوبی حصے اسلامی سلطنت میں شامل ہوگئے ادھر تجارتی مراکز کا فروغ صوفالا سے (جولیبیا کا ہمسایہ) جزیرہ نمائے عرب اور اس سے آگے برصغیر ہند تک سلسلہ بڑھتا رہا

جارت کو فروغ ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلم سوداگر اور پرتگالی تجارتی کمپنی کا باہم تصادم
ہوتا تو اسلام کی اشاعت نہ صرف یہ کہ براعظم افریقہ کے سارے ساحلی علاقوں بلکہ اندرون
عظم میں بھی ہوتی، لیکن اس باہمی آویزش کا نقصان اس شکل میں ظاہر ہوا کہ افریقہ کے
حلی علاقے میں اسلام محصور ہو کر رہ گیا۔

ویں صدی کے اختتام پر اسلام نے اندرون افریقہ اشاعت کی راہ پائی۔ صدیوں
ان تجارتی مراکز سے وابستہ رہنے سے یہ فائدہ ہوا کہ افریقہ کا بہت بڑا داخلی حصہ دنیائے اسلام
نقشے میں آگیا، اور ان مسلم تاجروں کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوئی۔ جو یہاں آکر آباد ہوگئے اور
می باشندگان میں شادیاں کیں اور اس طرح پوری سامراج کی توسیع پسندی کے برعکس کسی خون
بہ کے بغیر آہستہ آہستہ افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پرتگالیوں کی
نے افریقہ میں اسلام کی اشاعت کو متاثر کیا۔ اس لئے کہ شروع ہی سے یہ واضح تھا کہ پرتگالی
اج جنگ جو اور توسیع پسند طبیعت کے حامل ہیں۔ چنانچہ براعظم افریقہ کے جنوبی حصے پر قدم
ہوئے آٹھ سال سے زائد کا عرصہ نہیں گذرنے پایا تھا کہ پرتگالیوں نے مسلمان تاجروں کو بے
رنے کی طویل مہم شروع کردی اور ۱۵۰۶ء میں جزیرہ موسی کمبق پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ہی
بت بند ہوئی۔ مقامی مسلم شہریوں کو قتل کرنے لگے اور جو ان کے ظلم وستم سے محفوظ رہے ان کے
ایجنٹ حکومت بنا دی گئی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کینیا کے اہم مقامات، سووا اور مالندی
قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کے نتیجہ میں انھوں نے ایک حملہ کیا جس نے علاقہ کی اقتصادی صورت حال
تر کردیا۔ یہاں کے بیش قیمت طلائی سامان اور ہاتھی دانت سے تیار شدہ گرانقدر اسباب
قبض ہوگئے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی طاقتوں، ہالینڈ اور برطانیہ نے متحد ہوکر
لیوں کا مقابلہ کیا اور ممباسا کے مقام پر ۱۶۹۸ء میں انھیں بری طرح شکست دیا۔ اور جب
ال واپس ہونے پر مجبور ہوئے تو اس سے پہلے لونیز مارکینز بندرگاہ پر اپنا فوجی ٹھکانا قائم کرلیا
ن کے تجارتی جہازوں پر حملہ آور ہوسکے لیکن ممباسا میں ان کی شکست خوردگی پوری سامراج کی وسیع
ہیں محض ایک وقتی رسوائی تھی، اگرچہ ممباسا کے بہت بڑے حصے پر ہالینڈ اور برطانیہ کا سیاسی اثر
نہ جلد ہی قائم ہوگیا۔ اور افریقہ کا مشرقی ساحلی حصہ ان کی زیر حکومت آگیا پھر بھی موزمبیق
ساحلی علاقوں پر پرتگال ہی قابض رہے۔ ۱۸۸۴ء میں پرتگال بہ لین معاہدہ ہوا۔ پرتگالیوں
ندرون افریقہ داخل ہونے کی کھلی اجازت مل گئی اور میدان ہموار پاکر اس نے خوں ریزی

اور لوٹ کھسوٹ کا کام پوری بے باکی سے شروع کر دیا یہ سب انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں پیش آیا۔

پرتگالیوں کو اندرون افریقہ کی مقامی حکومتوں کا زبردست سامنا کرنا پڑا۔ مگر پرتگالیوں نے ان پر اپنی صنعتی اور فنی برتری کے زور پر قبضہ پا لیا۔ اور مقامی سورماؤں کا مقابلہ نہ کر سکے ۱۹۵۰ء کی ابتدا میں پرتگالیوں کے ہاتھوں افریقیوں کا بے دریغ قتل عام ہوا اور تین سال سے زیادہ عرصہ تک یہ قتل عام ہوتا رہا جس کے نتیجہ میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتار دئیے گئے۔ اس کے باوجود پرتگالی اپنے خلاف مقامی انتقامی شورش پر قابو نہ پا سکے لیکن موجودہ صدی کی آخری دہائیوں میں مسلح انتقام کے آخری قلعہ کو مسمار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

موزمبیق مسلمان کو معتوب کرنے کے لئے عیسائی مشنری اداروں نے بھی مسلح پرتگال افواج کا کردار ادا کیا۔ شمالی موزمبیق میں مسلمانوں نے مشنری اسکولوں کا بائیکاٹ کیا۔ جس کے نتیجہ میں ۱۹۶۰ء میں موداو (Mueda) مقام پر مسلمانوں کا بھیانک قتل ہوا۔ یہ تشدد پرتگالی افواج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ جس نے موزمبیق عوام کو اپنے دشمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا اور بالآخر کو [illegible] سال بعد ۱۹۷۵ء میں ملک پرتگال غارت گروں سے آزاد ہو گیا۔ ملک کی اس آزادی میں قوامی افواج کے دوش بدوش مسلمانوں نے بھی موثر کردار ادا کیا لیکن افسوس ہے کہ یہ آزادی عقیدہ وفکر کی متوقع حریت اور قانون کی بالادستی ساحل نہ کر سکی کیونکہ ۱۹۷۵ء میں یہ اعلان ہوا کہ یہ حکومت لامذہبی اشتراکیت کی بنیاد پر قائم ہوگی اور یہی لوگ مذہب کا عقیدہ رکھتے ہیں اس سے ساری توقعات پر پانی پھر گیا۔ اس اعلان کے بعد اسلامی مدارس مسجدوں اور املاک وغیرہ کو ضبط کر لیا گیا اور دینی مدارس کو لادینی اسکول میں بدل دیا گیا اور دینیات کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی گئی۔ قرآن کریم اور اسلامی کتابوں کی اشاعت اور درآمدات پر قدغن لگا دیا گیا۔ علما اور معززین پر بہت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ بیرون ملک اعلیٰ علم حاصل کرنے کے لئے ویزا دینا بند کر دیا گیا۔

یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مسلمان اور نصاریٰ دونوں ہی یکساں طور پر ان بندشوں کے شکار رہے جس سے خاص طور پر مسلم ملک حکومت وقت کے خلاف بھڑک اٹھا۔ ابوبکر موسیٰ علی جیسے رہنماؤں نے اس پُرآشوب دور میں حکومت کی ناروا کارروائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت کی تو اس جرم میں ان کو نظربند کیا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آٹھویں دہائی میں حکومت وقت نے موزمبیق عوام کے لئے دین و مذہب کو ایک ضرورت سمجھتے ہوئے ۱۹۸۲ء میں ان تمام پابندیوں کو ختم کر دیا۔ شیخ ابوبکر موسیٰ اور دیگر قیدی رہا کر دئے گئے اور پانچ سو سال کی مسلسل کوششوں کے بعد پھر دینی چہل پہل شروع ہو گئی اور مذہبی آزادی کی بازگشت پورے علاقہ میں سنائی دینے لگی۔

اس پوری رپورٹ سے ملک کی گرتی ہوئی صورت حال اور وہاں کے باشندگان کی فاقہ کشی اور تعلیمی گراوٹ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ آج موزمبیق کے مسلمان انتشار، جہالت اور خرافات کے شکار ہیں۔ قحط سالی اور باہمی خانہ جنگی اس پر مستزاد ہے ان تمام چیزوں نے موزمبیق کو اقتصادی بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ موزمبیق کی قومی محاذ حکومت کے خلاف برسرپیکار ہے۔ اس کی سربراہی فرلموفرنٹ کر رہی ہے جسے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے ملک میں حالات کے بدلنے اور بہتر ہونے کی بہت امیدیں ہیں خدا ہی جانتا ہے آگے کیا ہوگا۔

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ھند کے

حالیہ اجلاس کی مختصر کاروائی اور قرار دادیں

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا ایک خصوصی اجلاس جماعت کی مجلس نمائندگان کے اجلاس سے ایک روز قبل ۲۰ مارچ ۱۹۸۸ء اتوار کو زیر صدارت امیر جماعت اسلامی ہند مرکز جماعت دہلی میں منعقد ہوا۔ کار وائی ۱۰ بجے صبح شروع ہوئی اور حسب ضرورت بعد کے دنوں میں بھی، تا ۸ بجے شب ایک ایک گھنٹہ ہوتی رہی۔

تذکیر کے بعد محترم امیر جماعت کے افتتاحی کلمات سے کاروائی شروع ہوئی۔ امیر جماعت مولانا ابو اللیث صاحب ندوی اصلاحی نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ مجلس نمائندگان کا جو اجلاس اگلے روز منعقد ہونے والا ہے اس کے بارے میں یہ غور کرلینا چاہئے کہ کار وائی کا طریقہ کیا ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گذشتہ مجلس نمائندگان کے اجلاس کی کار وائی جس طریقہ پر ہوئی تھی اس بار بھی اسی طریقہ پر ہو مغربی بنگال کے نمائندے تو اردو سمجھ لیتے ہیں البتہ کیرلہ کے کچھ نمائندے ہیں جو ٹھیک طور پر اردو نہیں سمجھتے اس لئے اُردو زبان میں جو چیزیں پیش ہوں ان کا ملیالم زبان میں خلاصہ بیان کیا جائے۔ دستور میں ترمیم سے متعلق جو تجاویز ہوں ان میں سے ان تجویزوں کو منتخب کرلیا جائے جن پر غور و فیصلہ کی فوری ضرورت بھی ہو اور غور و بحث کے لئے زیادہ وقت بھی درکار نہ ہو۔

بابری مسجد کی بازیابی کی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا کہ شرکائے اجلاس اپنے اپنے خیالات کا اس ضرورت کے پیش نظر اظہار کریں کہ پُرامن ذرائع سے کام لے کر کسی طرح اس اہم مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔

اس افتتاحی تقریر کے بعد مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا گیا۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں رفقاء نے جن خیالات کا اظہار کیا انھیں نوٹ کرلیا گیا تاکہ رابطہ کمیٹی کی میٹنگوں میں جماعت کے نقطۂ نظر اور موقف کی نمائندگی کرتے ہوئے انھیں پیش نظر رکھا جائے اور رفقائے جماعت اپنی سعی

وجہد میں بھی انھیں ملحوظ رکھ سکیں۔

دستور میں ترمیم سے متعلق تجاویز پر اور سفارشات مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ دوران اجلاس ہی اپنی رپورٹ پیش کردے تاکہ اس پر مجلس شوریٰ غور کرکے اپنی سفارشات کے طور پر مجلس نمایندگان کے اجلاس میں رکھ سکے۔ چنانچہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ اور مجلس شوریٰ نے اس کے پیش نظر اپنی سفارشات مرتب کیں۔ کمیٹی درج ذیل ارکان شوریٰ پر مشتمل تھی۔

(۱) سید یوسف صاحب کنوینر (۲) ڈاکٹر احمد سجاد صاحب (۳) قیم جماعت افضل حسین صاحب کمیٹی نے اصلاً خود ہی اپنی سفارشات کی دو قسمیں کی تھیں۔ ایک قسم ان سفارشات کی تھی جن پر شوریٰ کے کسی آئندہ اجلاس میں بہ تفصیل غور کرنے کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی اور دوسری قسم ان سفارشات کی جن پر غور کیا گیا اور انھیں مجلس نمایندگان میں پیش کردیا گیا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے مسائل پر بھی غور ہوا اور شرکائے اجلاس نے مسئلہ افغانستان، مسئلہ فلسطین اور عراق ایران جنگ، فرقہ وارانہ منافرت سے متعلق مسئلوں پر اپنے خیالات و تاثرات ظاہر کئے

شوریٰ کے اس اجلاس میں مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب اور مولانا محمد یعقوب گھلائی صاحب اپنی علالت کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ ان کے علاوہ تمام ارکان شریک اجلاس ہوئے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

جناب محمد شفیع مونس صاحب، جناب ٹی کے عبداللہ صاحب، جناب محمد سراج الحسن صاحب جناب رشید عثمانی صاحب، جناب عبدالعزیز صاحب، جناب سید یوسف صاحب، جناب اعجاز اسلم صاحب، جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب، ڈاکٹر احمد سجاد صاحب۔ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی مولانا جلال الدین صاحب عمری، جناب کے سی عبداللہ صاحب جناب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب، جناب مولانا محمد یوسف اصلاحی صاحب جناب مولانا سلمان ندوی صاحب۔

مرکزی مجلس شوریٰ کی قراردادیں

مسئلہ فلسطین

فلسطین کا مسئلہ آج مشرق وسطیٰ کے امن کے لئے بارود کا ڈھیر بن گیا ہے اسرائیلی بربریت جس طرح انسانی حقوق اور قوموں کی آزادی کے تصور کو پامال کر رہی ہے وہ آزادی پسند دنیا کے لئے چیلنج بنتا جا رہا ہے اور اسے لگام نہ دیا گیا تو مشرق وسطیٰ ہی نہیں عالمی امن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ آج اسرائیل امریکہ اور دیگر استعماری طاقتوں کی سرپرستی میں اسی ہٹلری راہ پر چل رہا ہے جس کی تباہیوں اور بربادیوں سے دنیا آگاہ ہے۔ اب اگر دنیا دوبارہ اس انجام سے دوچار ہونا چاہتی ہے

تو لازم ہے کہ اسرائیل کو جارحیت سے باز رکھا جائے فلسطینی قوم کو بھی یہ حق دیا جائے کہ وہ دنیا کی آزاد قوموں کی طرح زندگی گزار سکے۔ آزادی فلسطینی قوم کا بھی پیدائشی حق ہے، ــــــــ اس حق کو چھین کر عدل و انصاف کا علم نہیں بلند کیا جا سکتا۔ اسرائیل کو جس طرح وجود دیا گیا وہ خود ہی ایک کھلے ہوئے ظلم کی نشانی ہے اور اب اسے مزید جارحیت سے نہ روکنا ظلم کے دائرے کو وسیع کر رہا ہے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس دنیا کی تمام آزادی پسند قوموں سے یہ اپیل کر رہا ہے کہ فلسطینی قوم کی غصب شدہ آزادی کو بحال کرانے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس عالم اسلام سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس مسئلہ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو اس احساس کے ساتھ ادا کرے گا کہ فلسطین محض ایک علاقائی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ قبلۂ اول کی بازیابی کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ اس طرح فلسطین کی آزادی پورے عالم اسلام کی ذمہ داری ہے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پورے عالم اسلام کو بنیان مرصوص بن کر کھڑا ہونا پڑے گا، ورنہ استعماری طاقتیں اسرائیل کا چھڑ لگا کر پورے خطہ کو اپنی چراگاہ بنا لیں گی خدا اہل فلسطین اور بیت المقدس کو جلد از جلد صیہونی فتنہ سے نجات دے۔ آمین

افغانستان مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کی نگاہ میں آٹھ سال سے جاری افغانستان میں روسی عسکری جارحیت اس خطہ کے امن کے لئے نہیں عالمی امن کے لئے بھی خطرہ بنی ہوئی ہے آزادی کے اس دور میں روس کی افغانستان میں کھلی ہوئی فوجی مداخلت، جارحیت کی انتہائی گھناؤنی صورت ہے۔ اپنے دین اور وطن سے محبت رکھنے والے لاکھوں افغانی جوان اس جارحیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ ۵۰ لاکھ سے زائد باشندے پڑوسی ملکوں میں پناہ گزیں بن کر زندگی گذار رہے ہیں لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود بہادر افغانی اپنے دین، اور اپنی آزادی کی حفاظت کر کے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور اپنے صبر و ثبات سے حقیقتاً جاگزدی ہے کہ پختہ عزم و یقین کے سامنے اس دور کی ایک عظیم طاقت، روس کو بھی پسپائی اختیار کرنے کے علاوہ اور چارہ نظر نہیں آرہا ہے۔ لیکن جاتے جاتے روس اس تگ و دو میں لگا ہوا ہے کہ دین پسند افغانی اقتدار تک پہنچنے نہ پائیں اور وہ نجیب اللہ کے پردے میں اپنے ارادوں کی تکمیل میں لگا رہے۔ روس کی کھلی ہوئی جارحیت سے اس کی یہ خفیہ سازش زیادہ خطرناک ہے۔ توقع ہے کہ مجاہدین کی نگاہوں سے یہ پہلو اوجھل نہیں ہوگا۔ مجاہدین پختہ عزم رکھتے ہیں کہ روسی جارحیت چاہے جس بھیس میں بھی ہو، وہ پسپا کرنے سے پہلے دم نہیں لیں گے۔ مجاہدین کے اس عزم کو کامیاب بنانے کے لئے مجلس عالم اسلام اور آزادی پسند دنیا سے یہ امید کرتی ہے کہ

وہ روسی ڈرامہ سے دھوکہ نہیں کھائیں گے اور مجاہدین کے ساتھ تعاون کا سلسلہ جاری رکھیں گے، تاآنکہ جارحیت کا ہر نشان مٹ جائے۔ خدا مجاہدین کی جدو جہد کو کامیاب بنائے۔

فرقہ وارانہ منافرت: مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند انتہائی افسوس کے ساتھ اپنے اس احساس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ سیاسی پارٹیوں کی طرف سے فرقہ پرستی کے خلاف رات دن بیانات دیئے جانے کے باوجود فرقہ وارا منافرت کا دائرہ روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ منافرت کا یہ شعلہ صرف قومی یکجہتی، ملکی اقتصادیات اور انسانی اخلاق ہی کو تباہ نہیں کررہا ہے بلکہ عالمی سطح پر یہ ملک کی رسوائی کا سبب بھی بن رہا ہے۔

آزادی سے پہلے ان فسادات کے سلسلہ میں عام طور سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ انگریزی حکومت اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ان شعلوں کو بھڑکاتی رہتی ہے۔ وہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر گامزن تھی۔ اسی لئے توقع تھی کہ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ منافرت کے یہ شعلے سرد پڑ جائیں گے، لیکن یہ آرزو بھولی بسری داستان بن گئی اور فرقہ وارانہ منافرت کا دائرہ کم ہونے کے بجائے وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے کہ اب ملک کی سیاسی پارٹیاں اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لئے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اپنانے میں کوئی ہچک محسوس نہیں کرتیں۔ ان کی اس پالیسی کے سائے میں تہذیبی جارحیت پسندی علاقائی اور لسانی عصبیت کو سر اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ ان کی اس پالیسی کے سایہ میں درسیات کے اندر ایسے فرقہ وارانہ مواد کو جگہ ملتی ہے اور اب تو نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ آزادیٔ رائے کے اظہار کے نام پر قرآن و حدیث پر پابندی عائد کرنے کے لئے عدالتوں میں مقدمات دائر کئے جاتے ہیں۔ اس طرح پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کو پھیلانے کی یہ کوششیں ملک کے مستقبل کے لیے شدید خطرہ بنتی جارہی ہیں۔

مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ملک کے تمام باشندوں اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں سے یہ اپیل کررہا ہے کہ مل جل کر اس روگ کو مٹانے کی کوشش کریں، فرقہ وارانہ منافرت کو انسانی اخوت اور بھائی چارہ سے بدل دیں۔ اس لئے کہ سارے انسان اپنے فکری، نظری، لسانی اور لونی اختلافات کے باوجود آدم کی اولاد ہیں۔ اسی لئے جماعت فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے خوش گوار تعلقات کی مہم کو آگے بڑھانے میں لگی ہوئی ہے۔ مجلس شوریٰ امید کرتی ہے کہ ملک کے تمام باشندے مل جل کر اس مہم کو کامیاب بنائیں گے۔

ایران عراق جنگ: مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس دو پڑوسی ملکوں ایران و عراق کے درمیان

جاری جنگ پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے اس جنگ میں دونوں ملکوں کا جو جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک المیہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے خوشی صرف اسرائیل اور اس کے مشرقی و مغربی سرپرستوں کو حاصل ہو سکتی ہے، عالم اسلام کو نہیں۔ اس جنگ نے اسلام کے تصور اخوت پر بھی ضرب لگائی ہے۔ پرامن انسانی آبادیوں کو میزائلوں کا نشانہ بنانا، اسے اگر جنگی حکمت عملی کہیں گے تو درندگی اور بربریت کس چیز کا نام ہوگا۔

دنیا کی بڑی استعماری طاقتیں یہی چاہتی ہیں کہ یہ جنگ جاری رہے اس طرح وہ ایک طرف مشرق وسطیٰ کو اپنے اسلحہ کی منڈی بنائے رکھنا چاہتی ہیں تو دوسری طرف وہ اس کے ذریعہ اسرائیل کی راہ میں حائل ہر مقاومت ختم کر دینا چاہتی ہیں تاکہ ان کی مادی مفادات پر آنچ نہ آئے اور یہ بات نہ ایران اور عراق کے لئے مفید ہو سکتی ہے نہ عالم اسلام اور عالمی امن کے لئے۔

اس جنگ کی انہیں خطرناکیوں کے باعث مجلس شوریٰ دونوں ہی مسلم ملکوں سے یہ اپیل کرتی ہے کہ جنگ کو بند کر کے صلح کی میز پر بیٹھ کر اپنے مسائل کو حل کریں اس سلسلہ میں امن پسند دنیا اور عالم اسلام کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس جنگ کو بند کرانے میں اپنا موثر رول ادا کریں ورنہ یہ جنگ کسی بھی وقت نیا موڑ لے کر پوری دنیا کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔

ذاتی حمیت

"آدمی کے اندر ذاتی حمیت اور غیرت کے جذبات اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ خاندانی اور قومی جذبات حمیت بھی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ جب ان جذبات میں ہیجان آتا ہے تو بڑے بڑے ارباب صبر و تحمل کے پاؤں بھی اکھڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ اسلام کے نزدیک غیرت و حمیت بجائے خود ایک اعلیٰ جوہر ہے۔ لیکن یہ جوہر قابل قدر اسی وقت تک رہتا ہے جب تک کوئی غلط رخ نہ اختیار کرے۔ اور غلط مواقع پر حرکت میں نہ آئے ورنہ جس قدر یہ فی نفسہ قابل قدر اور قیمتی ہے اسی قدر مذموم بن جاتا ہے۔

(معرکۂ اسلام و جاہلیت صفحہ ۱۰۴)

تنقید و تبصرہ

بصائر مودودیؒ، مرتبین ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، حافظ محسن،
صفحات ۴۰ ا کتابت طباعت مناسب، قیمت پندرہ روپے
ناشر: سینٹر فار اسٹڈیز آن سائنس علی گڑھ

مولانا مودودیؒ موجودہ دور کے ممتاز عالم دین اور بالغ نظر محقق و مفکر تھے۔ ان کی دینی اور
لمی خدمات عالم اسلام میں مسلم ہیں۔ مولانا کا علمی سرمایہ جو مطبوعہ یا مخطوطہ شکل میں موجود ہے
ہ ان کے معاصرین اور جانشین کے لیے فکر و نظر کا بڑا وسیع میدان فراہم کرتا ہے، یہ شاعرانہ عقیدت
ہیں بلکہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مولانا مودودیؒ اس صدی کے واحد عالم دین تھے جن کو دین
ا سچی بصیرت، اسلامی علوم پر عبور، مسلمانوں کے مسائل کا گہرا احساس اور اپنے زمانہ کا شعور یکساں طور پر حاصل
تھا، اسی وجہ سے ان کی تحریک اور تحریر دونوں میں بڑی زندگی محسوس ہوتی ہے، مولانا کی تحریروں
نے ایک طرف اسلام کے روشن چہرہ سے حالات و زمانہ کا غبار صاف کیا اور دوسری طرف نئے ذہن
و اسلام کے تابناک رخ کی طرف متوجہ کیا (ذالک فضل اللہ)

مولانا مودودی کی وفات کے بعد ان کی حیات و خدمات پر بہت سی کتابیں، مضامین،
سائل کے نمبر اور تنقیدی و تاثراتی خیالات سامنے آئے، اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو محسوس
ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر تعارفی، توسیعی اور ترتیبی COMPILATION نوعیت کے ہیں۔
زیر تبصرہ کتاب بصائر مودودیؒ بھی ایک ترتیبی کام ہے، اس میں تفہیم القرآن سے مولانا کی
ن تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے جو کائناتی علوم سے متعلق ہیں۔ اس میں حسب ذیل مباحث ہیں۔
(۱) علم کے ذرائع (۲) قرآنی علوم کا مقام افضل (۳) بنیادی عقائد (۴) عالم بالا (۵) عالم
نی (۶) حیات۔ ان مباحث میں مولانا کے جدید علوم سے استفادہ اور ان پر نقد و تبصرہ کو نمایاں
ور پر منور کیا گیا ہے۔ ایک خاص نقطہ نظر کے تحت یہ ایک قابل قدر کوشش ہے کہیں کہیں مرتبین
ے مولانا کے انداز بیان پر نقد بھی کیا ہے مثلاً مولانا مودودیؒ نے سورہ التکویر کی آیت "جب سمندر
بھڑکائے جائیں گے" کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ سراسر اللہ کا معجزہ ہے" اس پر مرتبین نے یہ نوٹ لگایا
ہے "لفظ معجزہ کیونکہ اصطلاحاً نبی سے متعلق ہو گیا ہے اس لئے اس کا اس مقام پر استعمال مناسب
نہیں، قدرت حکمت یا کاریگری جیسے الفاظ یہاں زیادہ مناسب ہیں"
اگر لفظ معجزہ کا پورا ما لہ و ما علیہ پیش نظر ہو تو یہ نوٹ غیر ضروری ہے، اس لئے کہ نبی کا خرق عادات

کام خود اس کا معجزہ نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا ہوتا ہے اسی لئے قرآن میں اسے "آیات اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی اللہ کی نشانی۔

اگر مرتبین اپنے مباحث کا مواد حاصل کرنے کے لئے تفہیم القرآن سے آگے بڑھ کر مولانا کی دوسری کتابوں کو بھی پیش نظر رکھتے تو کتاب کی افادیت اس وقت نسبتاً زیادہ بڑھ جاتی اور معلومات افزا اور جامع ہوتی۔ مرتبین نے طبعی ذرائع علم میں تفہیم القرآن سے حسب ذیل پانچ چیزیں نکالی ہیں (۱) اسوہ انبیا (۲) سماعت و بصارت (۳) ذہن و عقل (۴) آیات کائنات (۵) تاریخ۔ اگر وہ اپنے ماخذ کو وسیع کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ مولانا نے ان ذرائع علم میں انسانی تجربہ کو بھی شامل کیا ہے۔ یا اگر صرف تفہیم پیش نظر تھی تو مباحث کا دائرہ وسیع کر کے تاریخ، عمرانیات اور نفسیات وغیرہ کو بھی شامل کرنا چاہئے تھا جن پر تفہیم میں گرانقدر بحثیں ملتی ہیں۔ اور جن سے مولانا کی بصیرت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے مثلاً اصحاب کہف کی تعداد، رقیم کی تحقیق، ذوالقرنین کا تعین، ام یاذکی جائے وقوع اور باقیات کی تحقیق وغیرہ۔

بہ صورت جیسا کہ مرتبین نے لکھا ہے "یہ ایک ابتدائی تحقیق ہے" اس کو مزید وسعت اور جامعیت عطا کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح اگر مولانا کی فقہی، سیاسی، اور فلسفیانہ بصیرت پر بھی کام ہو جائے تو ایک بڑی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب نہ صرف مولانا مودودی کی قرآنی اور کائناتی بصیرت کا تعارف کراتی ہے بلکہ خود قرآن کریم اور کائنات کے باہمی تعلق کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ کتاب ہر پڑھے لکھے آدمی کے لئے مفید ہے۔ (محمد مسعود عالم قاسمی)

تم کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہو جہاں کسی چوپٹ راجہ کا راج ہو۔ تمہارا واسطہ ایک ایسے خدا سے ہے جو تم میں سے ایک ایک شخص کو اس وقت سے جانتا ہے جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بن رہے تھے اور زندگی بھر تمہاری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاں تمہاری قسمتوں کا فیصلہ ٹھیٹھ عدل کے ساتھ تمہارے اوصاف کے لحاظ سے ہوتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔"

(مولانا مودودیؒ)

جلد ۸ | جون ۱۹۸۸ء مطابق شوال ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ | شمارہ ۶

فہرست مضامین

اشارات :

مقالات :

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ .
مدیر زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے :
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر، پبلشر، محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے حال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰ سے شائع کیا فون ۲۷۳۲۴۰ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

سید جلال الدین عمری

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۴۷) — ہر امت کے لئے ایک رسول (ہوا) ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اسی مقدس جماعت سے تعلق ہے۔ یعنی آپ اسی کے ایک فرد ہیں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران ۱۴۴) — محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۲۴) — بے شک ہم ہی نے تم کو حق دے کر بھیجا ہے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

ان سب رسولوں کی دعوت ایک تھی۔ وہ یہ کہ عبادت کا مستحق صرف ایک اللہ ہے۔ اسی کی عبادت ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ کسی کو اس کائنات میں چونکہ خدائی کا مقام حاصل نہیں ہے، اس لئے خدا کے سوا کسی کی عبادت کے لئے بھی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۵) — ہم نے تم سے پہلے جس رسول کو بھی بھیجا ہے اسے یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس میری ہی عبادت کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی یہی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ — اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس

الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ہ (البقرہ : ۲۱)	نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں امید ہے کہ تم اس کے عذاب سے بچ سکو گے۔

عبادت میں پرستش اور اطاعت دونوں شامل ہیں۔ تمام انبیاء کی دعوت یہی تھی کہ اللہ ہی کے سامنے سر بھی جھکایا جائے اور اسی کے احکام اور ہدایات کی پابندی بھی کی جائے۔

محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے اس کے پاس نہ تو اللہ کی کوئی کتاب موجود تھی اور نہ اس کے رسولوں کی تعلیمات سے وہ واقف تھی۔ بلاشبہ اس کا نسلی تعلق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ سے تھا، لیکن ان دونوں پیغمبروں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ انہوں نے جس دین کی تعلیم دی تھی، اس طویل عرصہ میں اس قوم نے آہستہ آہستہ اسے بھلا دیا تھا۔ اب اس کے پاس دین ابراہیمی کے نام سے چند بے جان اور غلط رسُوم اور باپ دادا کے طور طریقوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کو اصل دین کی طرف رجوع کی دعوت دی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کے سامنے اس کا دین پیش کریں اور صاف الفاظ میں اس کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے نتائج سے آگاہ کردیں۔ یہی بات قرآن مجید میں ایک جگہ ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ غٰفِلُوْنَ ہ (یٰسین : ۶)	تاکہ تم ایک ایسی قوم کو باخبر کردو جس کے باپ دادا خبردار نہیں کئے گئے تھے اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ لَعَلَّھُمْ یَھْتَدُوْنَ ہ (السجدہ : ۳)	تاکہ تم اس قوم کو باخبر کردو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا۔ شاید وہ راہ پا جائیں۔

آپ کی قوم فکر و عمل کی بے شمار خرابیوں میں گرفتار تھی۔ آپ نے اس کی ان خرابیوں کو دور فرمایا، اس کے عقائد و افکار درست کئے، اسے عبادت کے صحیح طریقے سکھائے، اس کے اخلاق و عادات ٹھیک کئے، حلال و حرام کی تمیز اور حق و باطل کا فرق سکھایا غرض

تعلیم و تربیت کے ذریعہ اسے ہر طرح کی بے راہ روی سے نکال کر راہ راست پر لگایا۔ قرآن مجید کہتا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الجمعہ: ۲)

وہی ہے جس نے امیوں میں ایک رسول خود انھیں میں سے اٹھایا جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت جزیرۃ العرب اور اس کے آس پاس یہود و نصاریٰ بھی تھے جن کو قرآن مجید نے اہل کتاب کہا ہے۔ یہ دونوں قومیں ان آسمانی کتابوں کی حامل تھیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھیں لیکن انھوں نے اپنی ذاتی خواہشات اور ذلیل اور ناپاک اغراض کے تحت ان مقدس کتابوں کو بدل ڈالا تھا اور ان میں ایسی تحریفات کر ڈالی تھیں کہ یہ معلوم کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ ان کی اصل تعلیم کیا تھی اور اس کو کہاں بدلا گیا ہے؟ جو لوگ دین کے نام پر دنیاداری کا یہ کام کر رہے تھے اور عوام کو گمراہ کر رہے تھے قرآن مجید نے ان کی ان مذموم حرکتوں کو جابجا نمایاں کیا اور ان پر سخت تنبیہ کی۔ ایک جگہ کہا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِىَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

ان میں سے بہت سے ناخواندہ ہیں جو کتاب کا تو علم نہیں رکھتے بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لئے بیٹھے ہیں اور وہ محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ پس تباہی ہے ان کے لئے اس نوشتہ میں جو انھوں نے

اپنے ہاتھوں سے لکھا اور تباہی ہے اس
کمائی میں جو انھوں نے حاصل کی (البقرہ: ۷۹-۷۸)

قرآن مجید نے ان کی بہت سی تحریفات کی نشاندہی کی اور ان کو دعوت دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر صحیح دین کو اختیار کریں جو اس وقت خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے:

يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَٰبِ وَيَعْفُوا۟ عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ۝ يَهْدِى بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ سُبُلَ السَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

(المائدہ: ۱۶-۱۵)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا جو تمہارے سامنے بہت سی ان باتوں کو جنہیں تم اللہ کی کتاب میں سے چھپا دیا کرتے تھے، کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں کو درگزر بھی کر جاتا ہے بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور کھلی کتاب آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اور اپنے اذن سے اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے

اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرمایا:

يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا۟ مَا جَآءَنَا مِنۢ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَآءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۝

اے اہل کتاب ہمارا یہ رسولؐ تمہارے پاس آچکا ہے جو تمہیں دین کی واضح تعلیم دیتا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ رسول کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ پس تمہارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آچکا

(المائدہ: ۱۹) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہود اور نصاریٰ کا قومی اور مذہبی مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ یہود دنیا پرست تھے نصاریٰ کا رجحان ترکِ دنیا کی طرف تھا۔ یہود کھلے محرمات کے ارتکاب سے بھی نہیں چوکتے تھے اور نصاریٰ حلال چیزوں کو بھی حرام سمجھ بیٹھے تھے۔ یہود ذاتی مفاد کے لئے خدا کے بتائے ہوئے حدود کو بآسانی توڑ پھینکتے تھے اور نصاریٰ نفس کشی کے جذبہ کے تحت اپنے اوپر غیر ضروری پابندیاں عائد کئے چلے جا رہے تھے ایک کا راستہ دنیا پرستی کا تھا اور دوسری کا ترکِ دنیا کا۔ دونوں گروہ میں سے ہر ایک دوسرے کو بے دین اور گمراہ اور اپنے آپ کو دین کا حامل اور جنت کا مستحق سمجھتا تھا۔ حالانکہ دونوں راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے ایک جگہ ان کی مذہبی نفسیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ
اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ
تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ
رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ
وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ
عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

(البقرہ: ۱۱۱-۱۱۳)

اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز نہ جائے گا
مگر وہ جو یہودی ہے یا نصرانی یہ ان کی تمنائیں
ہیں ان سے کہو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو اگر
تم سچے ہو۔ صحیح بات یہ کہ جو شخص بھی اپنے
آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور وہ عملاً نیک
روش اختیار کرے تو اس کے لئے اس کا اجر
اس کے رب کے پاس ہے ایسے لوگوں کے
لئے نہ کوئی خوف اور نہ اندیشہ ہے اور وہ نہ غمگین
ہوں گے۔ یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کی کوئی
بنیاد نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی کسی
بنیاد پر نہیں ہیں حالانکہ یہ سب کتاب
پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں وہ لوگ بھی
کرتے ہیں جن کے پاس (کتاب کا) علم نہیں
ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان قیامت
کے روز ان امور کا فیصلہ کر دے گا جن میں
یہ اختلاف کرتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا پرستی اور رہبانیت دونوں ہی کو غلط قرار دیا اور اعتدال کی راہ دکھائی۔ مذہب کے نام پر عالموں اور رہبروں نے جو عوام کو بیڑیاں پہنا رکھی تھیں انھیں کاٹا۔ پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا اور بتایا کہ جس طرح حرام چیزوں کا ارتکاب غلط ہے اسی طرح حلال چیزوں سے اجتناب بھی کوئی کارِ ثواب نہیں ہے۔ معروف کا حکم دیا تاکہ زندگی کی تعمیر معروف کی بنیاد پر ہو اور اس میں نیکی حکمرانی ہو۔ منکرات سے منع کیا اور اس بات کی ہدایت کی کہ منکرات سے بچ کر ہی انسان خدا سے قریب ہوسکتا ہے۔ آپ کے اس کارنامے کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

وہ لوگ اس کی رحمت کے مستحق ہوں گے جو اس رسول نبی امی کی اتباع کرتے ہیں جن کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتے ہیں اور ان پر جو بوجھ ہیں انھیں اتارتے ہیں اور جن بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں انھیں اتارتے ہیں۔ بس وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لائے ہیں، اور جو ان کی نصرت اور حمایت کرتے ہیں اور اس نور کی اتباع کرتے ہیں جو ان پر نازل کیا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

(الاعراف: ۱۵۷)

یہ وہ قومیں ہیں جو آپ کے قریب ترین ماحول میں موجود تھیں اور جن کے درمیان آپؐ نے بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد زندگی گزار دی۔ ان کے علاوہ دنیا کی دوسری قوموں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ کچھ قومیں وہ تھیں جو عرب جاہلیت کی سی زندگی گزار رہی تھیں اور جن کے پاس خدا کی نازل کردہ کتاب یا اس کی تعلیمات موجود نہیں تھیں۔ کچھ قومیں اس بات کی دعویدار تھیں کہ وہ آسمانی صحیفوں کی حامل ہیں اور ان کے پاس

خدا کی تعلیمات موجود ہیں۔ لیکن ان تعلیمات میں اس سے زیادہ تحریف ہو چکی تھی جتنی کہ اہل کتاب کے ہاں تحریف ہوئی تھی۔

عملی طور پر دنیا میں یا تو مادیت اور دنیا پرستی کی حکومت تھی یا غلط قسم کی روحانیت اور رہبانیت کو انسان کے عروج و کمال کی معراج سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح ظلمتوں کی ماری ہوئی یہ دنیا اس بات کی محتاج تھی کہ اسے خدا کے دین سے واقف کرایا جائے اور اسے غلط راستہ سے ہٹا کر صحیح راہ پر لگایا جائے۔ یہی کارنامہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انجام پایا۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝

(الفرقان: ۱)

بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے یہ فرقان (حق و باطل کو الگ الگ کر دینے والی کتاب) اپنے بندے پر نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہاں والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ

(ابراہیم: ۱-۲)

یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ان کے رب کی توفیق سے ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے آویں۔ اس اللہ کے راستے کی طرف جو غالب اور ستودہ صفات ہے۔ وہ اللہ جو ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور تباہی ہے یعنی سخت عذاب ہے کافروں کے لئے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (سبا: ۲۸)

ہم نے تو تم کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لئے اللہ کے رسول تھے۔ آپ نے کسی خاص نسل قبیلہ، قوم اور ملک کے فائدہ کے لئے کام نہیں کیا بلکہ ساری دنیا کا مفاد آپ کے پیش نظر تھا

آپ نے بغیر کسی تفریق کے تمام انسانوں کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے ایک بڑی حقیقت سے پردہ ہٹایا جسے انسان بھول چکا تھا۔ وہ یہ کہ خدا کا دین ہر زمانہ میں اسلام ہی رہا ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۝ (آل عمران: ۱۹) — بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اللہ تعالیٰ نے کبھی نازل نہیں کیا لیکن انسانوں نے اس دین کو اپنی تحریفات سے بدل ڈالا۔ ان کی نجات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی اسلام کی طرف پلٹ آئیں جو ہمیشہ سے اللہ کا دین رہا ہے۔ اب یہی دین اپنی صحیح اور کامل شکل میں آپ پر نازل ہوا ہے۔ یہ نوع انسانی کا ایک بھولا ہوا سبق ہے۔ جس کی آپ کے ذریعہ یاد دہانی ہوئی ہے۔ یہ سب کا سرمایہ اور سب کا دین ہے۔ اس کے سوا جو دین بھی انسان اختیار کرے اور جس نظریہ اور فکر کو بھی اپنائے اللہ تعالیٰ کی سند قبولیت اسے حاصل نہ ہوگی اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (آل عمران: ۸۵) — جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرنا چاہے گا اس کا وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

اسلام کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان خدا ہی کو اپنا اور اس کائنات کا خالق، مالک، حاکم اور معبود سمجھے۔ اپنے تمام جذبات عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے جھک جائے، اس کے ہر حکم کو بے چون چرا ماننے کے لئے تیار ہو جائے۔ خدا کے مقابلے میں ہر اطاعت سے منہ موڑ لے اور کسی دوسرے کو خدائی کا مقام دینے سے انکار کر دے۔

آپ نے بتایا کہ ایک وقت آئے گا جب کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت آئے گی وہاں انسان کی پوری زندگی کا حساب کتاب ہوگا خدا کے اطاعت گزار بندے کامیاب ہوں گے اور جو اس کے نافرمان ہوں گے وہ سخت ترین عذاب سے دوچار ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی عبادت اور اطاعت کا جو تصور دیا وہ گنجلک اور غیر واضح نہیں ہے۔ اس راہ کے نشیب و فراز اور اس کے تقاضے آپ نے پوری طرح

طرح واضح فرما دیئے۔ خدا کے نام پر انسان کو جنگل میں بھٹکنے نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ ایسی روشنی عطا فرمائی کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ ہر قدم خدا کی مرضی کے مطابق اٹھا سکتا ہے۔ آپؐ نے زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی طرف سے رہنمائی فرمائی اور بتایا کہ کس معاملہ میں اس کی اطاعت کس طرح کی جائے اور اس کی نافرمانی سے کیسے بچا جائے۔ اس طرح آپؐ نے پوری نوع انسانی کو ایک مقصد حیات دیا، زندگی کی ایک متعین راہ بتائی اور اسے ایک خاص رخ کی طرف موڑ دیا۔

آپؐ نے اسلام کی بنیاد پر ایک امت کی تشکیل فرمائی اور اس کے ذریعہ اسلام کو عبادت اور اخلاق ہی میں نہیں بلکہ معاشرت، معشیت قانون اور سیاست اور ہر شعبۂ حیات میں نافذ کر دکھایا، انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں پر اسلام کی حکومت قائم کر ڈالی۔ اب کوئی شخص یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ اسلام کی تعلیمات محض خیالی ہیں۔ دنیا نے عملی روپ میں نہیں دیکھا۔ یہ باتیں نظری طور پر تو اچھی لگتی ہیں لیکن ناقابل عمل ہیں آپؐ نے اس طرح کے ہر عذر کو اپنے مبارک اسوہ سے ختم کر دیا۔

آپؐ کے ذریعہ جو امت برپا ہوئی قرآن مجید نے اس کا مقصد حیات شہادت علی الناس بیان کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا　　اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۱۴۳)　　ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اس آیت میں یہ حقیقت کھول دی گئی ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آپؐ نے اپنی زندگی میں انجام دیا وہی فرض آپ کی امت کو انجام دینا ہے اور شہادت علی الناس کی مہم آپؐ نے شروع کی آپؐ کے بعد اسے اس امت کو جاری رکھنا ہے۔

اس شہادت کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جبکہ آدمی خدا کے دین کو پوری طرح سمجھے اسے اپنائے اور ٹھیک ٹھیک طریقے سے دنیا کے سامنے اس کا اظہار کرے۔ جو شخص اس دین کو نہ سمجھے، جس کا اس پر ایمان ہی نہ ہو یا جو اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی اور حذف و اضافہ کر بیٹھے وہ اس شہادت کی ذمہ داری ادا نہیں کر سکتا۔

ایک دوسری جگہ فرمایا کہ یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے وجود میں آئی ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ　　تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح

لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ (آل عمران ۱۱۰) کے لئے نکالا گیا ہے۔ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس امت کا کام یہ ہے کہ وہ حق کو حق کہے اور باطل کو باطل جو بات خدا کے دین کے مطابق ہو اس کی تائید اور جو اس کے خلاف ہو اس کی تردید کرے، خیر کا حکم دے اور شر سے منع کرے بھلائیوں کی ترغیب دے اور برائیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرے، وہ جس دین کی علم بردار ہے وہ ایک دعوت ہے۔ جو ہر حال میں دی جائے گی، وہ ایک پیغام ہے جو سب تک پہنچایا جائے گا۔ راحت میں بھی اور تکلیف میں بھی۔ آسانی میں بھی دشواری میں بھی، بے سروسامانی میں بھی اور ساز و سامان کے ساتھ بھی۔ اگر اقتدار حاصل ہو جائے تو اقتدار کی طاقت بھی اس پاک مقصد کے لئے استعمال ہو۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے، منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس احسان کا حق کون ادا کرسکتا ہے کہ آپؐ نے دنیا میں خیر کے پھیلانے اور شر کے مٹانے کا جو کارنامہ انجام دیا اسے جاری رکھنے کے لئے ایک پوری امت برپا کر دی۔ اگر اس امت کے اندر اپنے مقصد حیات کا احساس جاگ اٹھے تو پوری دنیا کی نجات دہندہ ثابت ہو گی اور یہ سب اس محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ہو گا جس کے ذریعے اس امت کو یہ اعلیٰ مقصد حیات ملا۔ قرآن مجید نے سچ کہا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥

مقالات

اسلام کا فلسفۂ عید

محمد مسعود عالم قاسمی

(یہ خطبہ عید الفطر کے موقع پر جامع مسجد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دیا گیا)

سارى تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ درود و سلام ہو اللہ کے رسولوں پر خاص طور پر آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل و اصحاب پر۔

آج عید کا دن ہے اور ہم لوگ عید الفطر کی نماز ادا کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، عید خوشی اور انبساط کو کہتے ہیں یعنی یہ ہماری خوشی کا دن ہے اور یہ نماز خوشی کی نماز ہے۔ اسلام میں خوشی اور غم کا ایک واضح تصور ہے، اس لئے ایک مسلمان جس طرح اپنے سارے کام میں اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ اس کا خدا کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کس چیز سے ناراض ہوتا ہے اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی خوشی اور غم کے حدود کو نگاہ میں رکھے اور معتدل و ہنگامی حالات میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔

خوشی ایک مطلق حقیقت ہے جسے ہر انسان جانتا ہے، پسند کرتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کے سامنے خوشی اور غم دو اختیاری چیزیں ہوں تو کوئی لمحہ سائے کے بغیر وہ خوشی کو اختیار کرے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ سقراط اور افلاطون کی طرح وہ دو اور دو چار کے انداز میں یہ نہ بتا سکے کہ خوشی کیا ہے، کب پیدا ہوتی ہے وغیرہ۔ وہ تو بس اتنا جانتا ہے کہ خوشی ایک کیفیت ہے جو اس پر طاری ہے، ایک انبساط ہے جو اسے حاصل ہے اور ایک سرور ہے جو اسے مست کئے دیتا ہے۔

اس کے وجود کا خوشی ایک فطری اور جبلی چیز ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے اور ہر انسان اس کا متلاشی ہے۔ خوشی کے اسباب و عوامل اور اس کے حصول کے طریقوں میں بڑا اختلاف ہے۔ کوئی عہدہ و اقتدار کے ذریعہ خوشی حاصل کرتا ہے اور کوئی مال و دولت کی فراوانی میں خوشی دیکھتا ہے

کوئی آل واولاد سے خوشی پاتا ہے اور کوئی رقص و سرود میں خوشی ڈھونڈ تا ہے، کوئی حسن و عشق میں خوشی کا جویا ہے اور کوئی سیر و تفریح میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے۔

بعضے کہ تمنائے زر و مال خوش اند بعضے کہ تماشائے خط و خال خوش اند

اینہا ہمہ اسباب پریشانی ہست خوشحال کسانیکہ بہر حال خوش اند

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مقاصد الگ ہوتے ہیں، پسند و ناپسند مختلف ہوتی ہے فکر و خیال جدا ہوتے ہیں۔ عقیدہ و نظریہ علیحدہ ہوتا ہے اور یہ سب انسان کی خوشی اور غم کا پیمانہ بناتے ہیں۔ بظاہر خوشی کے حسب ذیل تین عوامل ہوتے ہیں۔

(۱) خارجی عوامل: اس میں دولت، عہدہ، قبیلہ، خاندان زیادہ موثر ہیں۔

(۲) طبعیاتی عوامل: اس میں صحت، طاقت، حسن اور اس قبیل کی چیزیں زیادہ موثر ہیں

(۳) روحانی عوامل: اس میں علم انصاف، حکمت اور نیکی زیادہ موثر ہوتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اگرچہ ایک فطری اور عمومی چیز ہے مگر خوشی کے اسباب و عوامل اور اس کی حدود کی تعین میں عقل اور نقطہ نظر کو بھی دخل ہے۔ پھر خوشی کی ایک قسم وہ ہے جو لذت سے جڑی ہوئی ہے، جن چیزوں سے انسان کو لذت ملتی ہے وہ ایک طرح کی خوشی بھی عطا کرتی ہیں۔ مثلاً تیز دھوپ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس آدمی کو لذت عطا کرتا ہے تو عین اسی لمحہ میں اسے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے لذت کو خوشی سے جدا نہیں کیا سکتا۔ مگر ایک لذت تو وہ ہے جو محسوسات کے دائرہ میں محصور ہے۔ مثلاً آنکھ اور کان کی لذت یا جنسی افعال کی لذت وغیرہ۔ لذت کی ایک قسم اور ہے جو ماورائے محسوسات ہے اور محسوسات سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً ایک عالم کے لئے کسی علمی نکتہ کے حاصل ہونے کی لذت، ایک ریاضی داں کے لئے کسی پیچیدہ فارمولا کے حل ہو جانے کے بعد کی لذت، ایک سائنس داں کے لئے کسی تھیوری کے دریافت کر لینے کی لذت، ایک شاعر کے لئے کسی اچھے شعر کی لذت ایک مومن کے لیے تہجد کی نماز کی لذت یا کسی ضرورت مند کی حاجت پوری کر دینے کے بعد کی لذت وغیرہ یہ ساری لذتیں حسی لذتوں سے کہیں زیادہ طاقت ور دیرپا اور خوشی عطا کرنے والی ہوتی ہیں۔

بہت سے قدیم و جدید فلسفیوں کا خیال ہے کہ خوشی محض خواب و خیال ہے، دنیا میں خوشی نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں، ہم جسے خوشی سمجھتے ہیں وہ درحقیقت رنج و غم کا ہی ایک

حصہ ہے کیونکہ یہ دنیا مصائب والام کی آماجگاہ ہے اس میں سوائے دکھ درد اور رنج و محن کے کچھ نہیں انسان کو خوشی تو اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اس کے مصائب سے چھٹکارا پالے اور اپنے اندر کی دنیا کو باہر کی دنیا سے قطعی لاتعلق کرلے، ورنہ اس کا ہر وقت رنج والم سے گھرا ہوگا۔ ایرانی تصوف ہندومت اور بدھ مت کا فلسفہ تقریباً اسی خیال کے اردگرد گھومتا ہے۔

دوسری طرف بہت سے مغربی مفکرین ہیں جن کی نظر میں خوشی کا اصلی سرچشمہ یہی مادی دنیا ہے۔ دنیا ہی خوشی عطا کرتی ہے جبکہ انسان کے اندر سوائے رنج و غم اور محرومی کے کچھ نہیں۔ خوشی رنج سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام ہے اگر انسان اپنے اندر کی محرومی کو دور کرنا چاہتا ہے تو مادی دنیا کا سہارا لئے بغیر ایسا نہیں کرسکتا۔ انسان رنجیدہ اس لئے ہے کہ وہ بھوکا ہے اگر اسے روٹی مل جائے گی تو وہ خوش ہوجائے گا۔ انسان غم زدہ اس لیے ہے کہ اسے اسباب راحت میسر نہیں، اگر اسے سامان راحت میسر آجائیں تو یقیناً اسے خوشی حاصل ہوگی اور اندر کی محرومی باہر کی فراوانی سے ملکر خوشی میں تبدیل ہوجائے گی۔

خوشی کے بارے میں اہل فکر کی یہ دو انتہائیں ہیں ان میں بعض جزوی صداقتیں موجود ہیں لیکن خوشی کی یہ کامل تصویر نہیں۔ ان دونوں نقطہائے نظر میں کمیاں اور کمزوریاں ہیں ایک طرف اگر انسان خارج کی دنیا سے اپنا ناطہ توڑلے اور پھر اپنے اندر خوشی تلاش کرے تو یہ ایک لاحاصل عمل ہوگا۔ ایک سپاٹ بے کیف، یک رخی اور تلخ و شیریں سے عاری زندگی کبھی انسان کو خوشی عطا نہیں کرسکتی اور یہ فرض کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں کہ دنیا میں خوشی کا وجود نہیں جس طرح یہ مان لینے کا کوئی جواز نہیں کہ دنیا میں رنج و غم کا کوئی وجود نہیں۔ دوسری طرف اگر انسان صرف مادی دنیا کو حاصل کرکے اور اس کی رعنائیوں اور دلکشیوں کو سمیٹ کے چاہے کہ اسے خوشی حاصل ہوجائے تو یہ ضروری نہیں۔ پھر یہ فرض کرلینا بھی غلط ہے انسان کے اندرون میں محرومی اور غم پوشیدہ ہے بلکہ خوشی اور غم کی جڑیں اندر و باہر موجود ہیں۔ مغربی تہذیب نے ایسی ہزاروں مثالیں پیش کردی ہیں کہ ایک انسان بظاہر زندگی کی راحتوں کے سارے اسباب کا مالک ہے، اس کے سامان تعیش کی فہرست میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نشان زدہ نہ ہو پھر بھی اسے خوشی حاصل نہیں ہوتی، بے چینی اور اضطراب میں اس کے شب و روز کٹتے ہیں، اب وہ کبھی افیون کھا کر اپنے آپ کو فراموش کرتا ہے، کبھی ہپی ازم کی بنا ڈالتا ہے

کبھی کرتسنا ازم کا تجربہ کرتا ہے اور کبھی قیدجات کی بندشیں کاٹ ڈالتا ہے۔

اسلام کا نقطہ نظر ان دو انتہاؤں کے درمیان معتدل اور ہموار ہے، اس نقطہ نظر کے مطابق انسان جانور کی طرح صرف ایک مادی وجود کا نام نہیں جس کی خوشی صرف ظاہر سے وابستہ ہو اور صرف جسم وتن اور اعضائے بدن تک محدود ہو انسان کے بارے میں یہ سوچنا سراسر ظلم ہے، بلکہ وہ جسم اور روح دونوں کا مالک ہے اس لئے اس کی خوشی جسم اور روح دونوں سے جڑی ہوئی ہے۔ اسلام نہ ظاہر کو نظرانداز کرتا ہے اور نہ باطن سے غفلت برتتا ہے۔ اسلام میں خوشی وہی معتبر اور پائیدار ہے جو انسان کی فطرت سے پھوٹے۔ انسان کی فطری ترقی کا نتیجہ ہو اور انسان کی آخری خوشی (فطری انجام) سے ہم آہنگ ہو۔ اسلام کی نظر میں انسان کی فطرت نیک ہے۔ اس لئے حقیقی خوشی وہ ہے جس کی بنیاد نیکی ہو۔ انسان کا فطری ارتقاء یہ ہے کہ وہ سمتِ راست میں ترقی کرے۔ اس لئے سچی خوشی وہی ہے جو راہ راست پر چلنے سے حاصل ہوئی ہو۔ اور آخری خوشی یہ ہے کہ وہ آخرت میں رنج وغم اور نار جہنم سے نجات پائے اور جنت کی خوشی اسے حاصل ہو۔ اس لئے یہاں اصلی خوشی وہ ہے جو اس انجام خیر سے ہم آہنگ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر جملہ میں اسی مفہوم کو انتہائی حکیمانہ انداز میں یوں بیان فرمایا ہے۔

اذا سرتک حسنتک وساءتک	جب تمہاری نیکی تمہیں خوش کر دے اور
سیئتک فانت مومن	تمہاری برائی تمہیں بُری لگے تو تم مومن ہو۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس فلسفہ رنج وخوشی کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے سورہ الحدید میں ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ	اور زینت وآرائش ہے اور تمہارے آپس میں
وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ	فخر وستائش اور مال واولاد کی ایک دوسرے
غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ	سے زیادہ طلب ہے (اس کی مثال ایسی ہے،
يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ	جیسے بارش کے نتیجہ میں کسانوں کو کھیتی بھلی
حُطَامًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ	لگتی ہے پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر تو
وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط	دیکھتا ہے کہ وہ زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا

ہو جاتی ہے اور آخرت میں کافروں کے لئے عذاب
شدید اور مومنوں کے لئے خدا کی طرف سے
بخشش اور خوشنودی ہے۔

سورہ العبس میں قدرے دوٹوک انداز میں کہا گیا گئے۔

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

بہت سے چہرے اس دن چمک رہے ہوں گے، خنداں اور شاداں ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے اس دن وہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوگی یہ کفار بدکردار ہوں گے۔

عید کی خوشی اسلام کے اس ہمہ گیر تصور انبساط کا ایک حصہ ہے، رمضان المبارک کے پورے مہینے میں مسلمان روزہ رکھتا ہے، عبادت اور تلاوت کرتا ہے، صدقہ و خیرات کرتا ہے اور نیکی کا ایک ہمہ جہت ماحول بناتا ہے، اس سے اس کے اندر خوشی کی ایک طاقت اور کیفیت پیدا ہوتی ہے، نماز عید اس خوشی کا موزوں و مناسب اور اجتماعی اظہار ہے۔ اسلام میں وقتی اور عارضی خوشی بہر حال خوشی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ عارضی خوشی مذکورہ دائمی خوشی سے ہم رشتہ ہو اور اسی کی جستجو ہو۔

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں ایک مسلمان کے لئے پانچ دن عید کے ہوتے ہیں۔

(۱) جس دن وہ گناہ سے محفوظ رہے اور کوئی گناہ اس کے دامن دل کو تر نہ کرے۔
(۲) جس دن وہ دنیا سے اپنا ایمان سلامت لے جائے اور شیطان کی چالوں سے محفوظ رہے
(۳) جس دن وہ دوزخ کے پل سے بخیر و عافیت گذر جائے
(۴) جس دن وہ دوزخ سے بچ کر جنت میں داخل ہو جائے۔
(۵) جس دن وہ اپنے پروردگار کا دیدار حاصل کرلے اور اس کی رضا سے بہرہ یاب ہو۔

جہنم سے نجات، جنت میں داخلہ، اپنے رب کا دیدار اور اس کی رضا کا حصول ہی انتہائی سعادت اور آخری خوشی ہے چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں۔

عید گاہ ما غریباں کوئے تو   انبساط عید دیدن روئے تو
صد ہلال عید قربانت کنم   اے ہلال عید ما ابروئے تو

عید الفطر میں بندہ کو اللہ سے یہی کچھ ملتا ہے، اسی لئے عید کی خوشی دوسری قوموں کے

تہواروں سے بہت حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اس میں نہ کہیں رنگ و آہنگ ہے نہ رقص و سرود ہے، نہ بے حیائی اور فضول خرچی ہے بلکہ وقار اور سنجیدگی ہے، باہمی احترام و محبت اور اخوت و ہمدردی ہے، نفاست و پاکیزگی اور تعاون باہمی کا مظاہرہ ہے۔ اور یہی عید کی سچی خوشی ہے۔

اللہ کی نظر میں وہ خوشی زیادہ پسندیدہ ہے جو دوسروں کے لئے بھی وجہ شادمانی ہو۔ وہ خوشی اللہ کو قطعی پسند نہیں جو ایک فرد یا چند افراد کے آنگن میں مسرت کے پھول کھلائے، انبساط کی خوشبو پھیلائے اور دوسرے انسانوں کے دلوں میں رنج و غم کی آگ لگائے اور آہ و فغاں کا دھواں اٹھائے۔ انسانی زندگی میں خوشی کا بڑا موقع نکاح کا ہوتا ہے۔ اور اس خوشی کا اظہار ولیمہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ولیمہ پر لعنت بھیجی ہے جس میں مالدار تو بلائے جائیں اور نادار چھوڑ دیے جائیں۔ امیر تو مدعو ہوں مگر محتاج سے نظر چرائی جائے۔ عید بھی خوشی کا موقع ہے اس میں امیر و غریب سب کو برابر کا شریک ہونا چاہیے دھیان رکھیے کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ نئے اور خوشبو دار لباس زیب تن کئے ہنستے مسکراتے عیدگاہ کو نکلیں مگر ان کے پڑوس سے حسرتوں اور تمناؤں کا جنازہ نکلے۔ صدقۃ الفطر ہر صاحب حیثیت مسلمان پر اسی لئے واجب ہے کہ جو لوگ معیار زندگی کے نچلے زینہ پر کھڑے ہیں ان کی ضروریات کا پاس و لحاظ کیا جائے اور ان کی خوشی کا سامان مہیا ہو سکے خدا نہ کرے وہ دن آئے کہ انسانوں کی بھری پری بستی میں افلاس و تنگ دستی کچھ لوگوں کو روئے تماشا بنا دے اور مال و دولت کی فراوانی دوسرے لوگوں کو چشم تماشا بنائے رکھے۔

شکوۂ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

کم ظرفی و اعلیٰ ظرفی

مولانا سید حسن کمال ندوی

کارزارِ حیات کی تلخی یا شیرینی ہم سفر کے 'ظرف' پر منحصر ہے۔ ہم سفر وہ بھی ہیں جو چند ساعت کے لیے بس یا ٹرین میں ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہم سفر وہ بھی ہیں جو ہمارے پاس پڑوس اور محلے میں رہتے ہیں۔ اعزہ و اقربا، اہل خاندان، ہم سبق، ہم پیشہ، آفس اور کارخانے کے ساتھی بھی ہم سفر ہیں۔ استاد شاگرد، دوکان دار خریدار، کرایہ دار اور مالکان، اہل حرفہ اور ان کے گاہک، غرض یہ کہ جس مقام پر بھی دو انسانوں کا واسطہ ایک دوسرے سے پڑتا ہے وہ ہم سفر ہو جاتے ہیں۔ چاہے اُن کا یہ ساتھ چند منٹوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور برسوں کا ہو یا عمر بھر کا۔

اگر ہمارا شریکِ سفر، شریکِ کار اور شریکِ حیات عمدہ اخلاق اور اعلیٰ ظرف کا مالک ہے تو ہماری زندگی چین، سکون، آرام اور اطمینان سے ہنسی خوشی گزرے گی اور اگر وہ تنگ ذہن اور کم ظرف ہے تو ہماری زندگی گھٹن، بے کیفی، خوف و ہراس اور غم واندوہ سے عبارت ہوگی۔

انسان کی جسمانی اور دماغی صحت پر ان دونوں حالات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ جو اعلیٰ ظرف انسانوں کے درمیان شاداں و فرحاں زندگی گزار رہا ہو وہ چاق و چوبند، صحت مند، ملنسار اور خوش مزاج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو کم ظرف انسانوں کے درمیان رہ بس رہا ہو، وہ سست، مضمحل، بیمار، چڑچڑا اور تنگ مزاج بن جاتا ہے اور ظاہر ہے جس کے پاس جو کچھ ہوگا وہی وہ دوسروں کو بھی دے سکے گا۔ بدبودار بدبو اور خوشبو دار خوشبو کی سوغات تقسیم کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا جس سماج میں زیادہ تر لوگ اعلیٰ ظرف ہوں گے وہ سماج صحت مند، خوش حال، پرامن اور شادماں ہوگا اور جس سماج میں کم ظرفوں کی زیادتی ہوگی وہ سماج مریض، افلاس زدہ، بے چین اور غم زدہ ہوگا۔

"ظرف" عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی برتن کے ہوتے ہیں جس میں کوئی چیز رکھی جائے "ظرف زمانی" سے مراد وقت ہوتا ہے۔ جیسے صبح و شام، دوپہر وغیرہ۔ "ظرف مکانی" سے مراد جگہ ہوتی

ہے۔ جیسے کسی مقام کا نام وغیرہ۔ ظرف (برتن) سے مراد یہاں اخلاق کا برتن ہے۔ جس کا اخلاقی برتن جتنا بڑا ہے اس کے پاس اتنا ہی زیادہ اخلاق ہے اور جس کا اخلاقی برتن جتنا چھوٹا ہے اُس کے پاس اخلاق اتنا ہی کم ہے اور بد اخلاقی زیادہ ہے۔ اسی سے وسیع الظرف اور کم ظرف کی اصطلاحات بنی ہیں۔ ویسے خالی اور بھرے برتن سے بھی کم ظرفی اور اعلیٰ ظرفی کو تشبیہہ دی گئی ہے ؎

بھرے برتن بھلا آواز کہاں دیتے ہیں

ظرف خالی ہیں جو وہ صدا دیتے ہیں

کوئی برتن پانی سے بھرا ہوا ور آپ انگلیوں سے اس کو ٹھونکیں تو دھب دھب کی معمولی آواز آئے گی لیکن اگر برتن خالی ہو تو ٹھن ٹھن کی تیز آواز آئے گی۔ یہ مثال ہے انسانوں کی کہ باظرف متحمل مزاج و خاکسار ہوتے ہیں اور کم ظرف شیخی بگھارنے والے، احسان جتانے والے اور اتاولے ہوتے ہیں۔ "ثمردار درخت جھکتا ہے"۔ "بے ثمر شاخیں آسمان کی طرف اٹھی ہوتی ہیں"۔ ان محاوروں میں بھی اہل ظرف اور کم ظرفوں کا فرق واضح کیا گیا ہے۔

کم ظرفی کا جرثومہ ایسا لطیف اور خفیف جرثومہ ہے جو بسا اوقات خوردبینی نگاہوں سے بھی نظر نہیں آتا۔ یعنی آپ متعین طور پر اس رویّہ کو کسی گناہ یا بد اخلاقی کا نام دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے تاہم کردار کا یہ میلا پن احساسات کو متاثر کرتا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ کم ظرف انسان سماج میں، دوستوں میں اور ملنے جلنے والوں میں ایک ناپسندیدہ شخصیت بن جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو منطقی طور پر با اخلاق ثابت کرتے ہوئے بھی لوگوں کی نگاہوں میں محبوب نہیں بن پاتا۔ ہوسکتا ہے کہ ظرف کے معاملہ میں بھی انسان اپنی فطری جبلت، خاندانی ورثہ، سماجی رہن سہن اور انفرادی حادثات کا رہین منت ہو۔ تاہم ایک باشعور انسان جو اپنی شخصیت کو مقبول بنانا چاہتا ہو، اپنے کردار کے فیوض و برکات سے ہم سفروں کو معطر کرنا چاہتا ہو اور ایک کامیاب انسان بن کر چاروں طرف صحت و شادمانی کی کرنیں بکھیرنا پسند کرتا ہو اُس کے لیے ضروری ہے کہ ہمہ وقت اپنے گفتار و کردار اور رویّہ پر کڑی نظر رکھے۔ کسی بھی سلوک اور برتاؤ کو روا رکھنے سے قبل یہ دیکھ لے کہ کیا اس کا یہ کلام یا کردار اسے کم ظرف بنا رہا ہے یا اعلیٰ ظرف؟

ذیل میں ہم مثبت اور منفی اخلاقی قدروں کا ایک آئینہ پیش کر رہے ہیں۔ اس شیشہ کو سامنے رکھ کر ہر انسان کم ظرفی کے میل کچیل سے اپنے چہرے کو صاف کر سکتا ہے اور اعلیٰ ظرفی کے سنگھار سے اپنے کو سنوار سکتا ہے۔

دراصل انسان کی عظمت کا راز اعلیٰ ظرفی میں ہے۔ دنیا میں جتنے بھی عظیم انسان گزرے ہیں،

چاہے وہ انبیاء و صلحاء کی جماعت ہو، یا مصلحین و مجددین کا اولوالعزم گروہ ہو، سیاسی لیڈروں اور قومی رہنماؤں کا بلند پایہ طبقہ ہو یا درویشوں اور زاہدوں کا خدا رسیدہ گروہ ہو، عوام کے دلوں میں اُن کی بڑائی صرف ان کے اونچے ظرف کی وجہ سے جڑ پکڑ لیتی ہے۔ اعلیٰ ظرف انسان ایک مثالی باپ، ایک نمونہ کا بیٹا، ایک دلپذیر شوہر اور ایک عمدہ بھائی بن سکتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ ظرف عورت ایک مثالی ماں، ایک نمونہ کی بیٹی، ایک دلکش بیوی اور ایک عمدہ بہن ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ ہر رتبہ اور ہر حیثیت میں دوسروں کا دل جیت لے گی۔

(۱) ایک اعلیٰ ظرف انسان خوش مزاج ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی خلوص کے نور اور ہمدردی کی چمک سے منور ہوتی ہے۔ خندہ پیشانی اور مسکراہٹ اس کی پہچان ہوتی ہے۔ وہ جب اور جس وقت بھی دوسروں سے ملتا ہے تبسم کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ اگر وہ کسی پریشانی یا غم میں مبتلا ہو تو کمالِ تحمل سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔ مبادا مخاطب پر بھی اس کا اثر نہ ہوجائے۔

کم ظرف بدمزاج اور تند خو ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نحوست اور کرختگی پائی جاتی ہے۔ اس سے مل کر ہمیشہ دوسروں کو افسوس ہوتا ہے۔ اس کی تلخ کلامی اور سرد مہری مخاطب کو مضمحل بھی کردیتی ہے۔

(۲) ایک صاحبِ ظرف انسان خاکسار و منکسر المزاج ہوتا ہے۔ خدا کی عطا کردہ کوئی بھی نعمت اس کے اندر احساس تفاخر نہیں پیدا کرتی۔ وہ خدا کے ہر بندے کا احترام کرتا ہے۔ کسی کی تحقیر نہیں کرتا۔ کسی کا مذاق نہیں اڑاتا۔ کسی کا نام نہیں بگاڑتا۔ کسی کی کمزوری اور کوتاہی اس کے لیے وجہ عبرت ہوتی ہے نہ کہ باعث تعلی۔ وہ اپنے سے غریبوں، کمزوروں، بیماروں، اَن پڑھوں، خطاکاروں، ہر ایک کے ساتھ شفقت اور رحمت کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ کسی کی تحقیر و تذلیل نہیں کرتا بلکہ وہ دوسروں کی آبرو، عزتِ نفس اور وقار کو اپنی عزت سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس کے دل میں احساس برتری کا ذرا بھی مادہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے اور اپنی ہر اچھائی اور بڑائی کے لیے خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔ ہر ایک کی دل دہی کرتا ہے۔ اگر کچھ لوگ اس کے علم اور رتبہ کو پہچان نہ سکیں اور خاطر خواہ کسی جگہ مقام نہ مل سکے تو وہ اپنے علم اور رتبہ کو ظاہر کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کوئی خاص مقام، کوئی سفر حیثیت اور کوئی اونچا مقام پانے کی ہوس اس کے اندر نہیں ہوتی اور اگر کوئی رتبہ اسے مل جاتا ہے تو اُس کو وہ سراسر خدا کا فضل شمار کرتا ہے، اپنی قابلیت اور ذہانت پر نہیں اکڑتا۔ دوسروں کے جذبات و احساسات کو وہ کبھی ٹھیس نہیں پہنچاتا، چاہے اس خدمت میں خود اس کے جذبات کتنے ہی مجروح کیوں نہ ہوتے ہوں۔ اس کی نظر ہمیشہ لوگوں کی اچھائیوں پر ہوتی ہے۔

اس کے برعکس کم ظرف انسان مغرور و متکبر ہوتا ہے۔ خدا کی عطا کردہ ہر نعمت کو وہ اپنی قوت

وعقل کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ "ہم چوں ما دیگرے نیست" کے مرض میں گرفتار ہوتا ہے۔ اپنے کو عقلِ کل اور علمِ کل سمجھتا ہے۔ کبھی خاکساری، کبھی انکساری اور کبھی خدا کے ادائے شکر کا مصنوعی اظہار کرکے وہ اپنی اہمیت اور برتری جتلاتا رہتا ہے۔ اس کے سامنے کسی کی تحسین کی جائے تو اس میں کوئی خامی ضرور نکال دیتا ہے اور کسی کی غیبت کی جائے تو متکلم کو منع کرنے کے بجائے کم از کم اپنی لاعلمی کا اظہار کرکے اس کی تائید کر دیتا ہے۔ خودنمائی وخودستائی اس کی رگ رگ میں داخل ہوتی ہے وہ اپنی شخصیت کی نمائش کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ اپنی ادنیٰ سی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے دوسروں کے علم وسیرت میں بے بنیاد کیڑے نکالنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے کمزور پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ تمسخر، استہزاء اور نام بگاڑنا اس کے لیے عام باتیں ہوتی ہیں۔

(۳) اعلیٰ ظرف انسان ہمیشہ دوسروں کے ادنیٰ سے ادنیٰ احسان کو یاد رکھتا ہے۔ زبان سے بار بار اعتراف بھی کرتا ہے۔ اور اس سے کئی گنا بھلائی کرکے وہ اپنے محسن کا احسان چکانا چاہتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرکے وہ ہمیشہ بھول جاتا ہے۔ کبھی اس احسان کو زبان پر نہیں لاتا۔ اس کے برعکس کم ظرف احسان فراموش ہوتا ہے۔ کوئی اس کے ساتھ بھلائی کرے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس محسن نے یا تو بے وقوفی میں ایسا کیا ہے یا کسی مجبوری سے اس کو ایسا کرنا پڑا ہے۔ یا میں اس لائق ہی ہوں کہ لوگ میری خوشامد میں میرے ساتھ ایسا کریں۔

(۴) ظرف والے ہمیشہ عفو و درگذر سے کام لیتے ہیں۔ کسی نے کتنی ہی بڑی تکلیف کیوں نہ پہنچائی ہو، کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ کیا ہو مگر وہ اپنی عظمت و شرافت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ معاف کرتے ہیں اور دل سے بھلا دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف کم ظرف افراد سانپ اور کتے کی طرح منتقم المزاج ہوتے ہیں۔ ان کا اصول ہوتا ہے، اینٹ کا جواب پتھر سے۔ یا کم از کم جیسے کو تیسا۔

(۵) اہلِ ظرف ہمیشہ دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں۔ کسی معاملہ میں، کسی بھی جگہ کسی فرد کے لیے بداندیشی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ٹھیک اس کا الٹ، کم ظرف حضرات ہمہ وقت دوسروں کے نقصان کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اگر وہ خود نقصان نہیں پہنچا سکتے تو کسی دوسرے کے ذریعہ پہنچوانا چاہتے ہیں۔ یا کم از کم ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ فلاں شخص کا نقصان ہو جائے۔ کسی کی صحت خراب ہو جائے۔ کسی کا خسارہ ہو جائے۔ کسی کو ذلت نصیب ہو۔ ان کے سامنے کوئی پنپنے نہ پائے صرف میری ہی جے جے کار ہو۔ صرف میں ہی پھولوں پھلوں۔ گویا کہ وہ حاسد ہوتے ہیں۔

(۶) اہلِ ظرف دوسروں کے خیر خواہ اس حد تک ہوتے ہیں کہ ہمیشہ ایثار پر کمربستہ رہتے ہیں

خود بھو کے رہ کر دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ اپنی ضرورتیں محدود کرکے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ خود گمنام بن کر دوسروں کو نام عطا کرتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے کو بے نیاز اور دوسروں کو محتاج تصور کرتے ہیں۔ دوسروں کی پسند کو اپنی پسند پر مقدم رکھتے ہیں۔

کم ظرف دوسروں کا بدخواہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے مصائب، پریشانیاں اور بدنامیاں سن کر خوش ہوتا ہے۔ غلط مشورے دیتا ہے۔ خیرخواہ بن کر دشمن کا رول ادا کرتا ہے۔ دوسروں کے عظیم نقصان سے اگر اسے ادنیٰ سا بھی فائدہ ہو تو وہ انھیں گڈھے میں گرا کر اپنا فائدہ حاصل کرلیتا ہے۔ اس کا ذہن استحصالی اور استفادی ہوتا ہے۔ کسی بھی ملاقات، کسی بھی واقعہ اور کسی بھی تقریب کو وہ اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چاہے اس کی غرض وغایت کچھ بھی ہو۔

(۷) اعلیٰ ظرف والے مخلص ہوتے ہیں اُن کی گفتگو، برتاؤ، لین دین، تنبیہ اور محبت ہر چیز خیرخواہی اور خلوص پر مبنی ہوتی ہے وہ اپنی ہر بھلائی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ احسان کرکے بھول جایا کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی بھلائی کرتے ہیں اس کا اجر صرف اور صرف خدا سے چاہتے ہیں۔ انھیں نہ تو نام ونمود کی طلب ہوتی ہے، نہ لوگوں سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی کسی کو زیر احسان کرنا مقصود ہے۔ اس کے برخلاف ایک کم ظرف انسان یکا ریاکار ہوتا ہے۔ اس کا لباس، چال ڈھال، بول چال، لین دین، ہر چیز میں ریاکاری ہوتی ہے، دکھاوا ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے وہ اپنی خوبیوں اور نیکیوں کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔ کسی کے ساتھ چھوٹی سی بھلائی بھی کرتا ہے تو زندگی بھر یاد رکھتا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں احسان جتانے کو اپنا حق تصور کرتا ہے۔ کبھی وہ اس کو تحدیثِ نعمت کا نام دیتا ہے، کبھی تمثیلِ خیر کا اور کبھی ترغیبِ انفاق کا۔ دوسروں پر کیا ہوا ذرہ ذرہ احسان اسے یاد رہتا ہے مگر خود پر کیا گیا دوسروں کا بڑے سے بڑا احسان بھول جاتا ہے۔

(۸) اعلیٰ ظرف انسان متحمل مزاج اور صابر وشاکر ہوتا ہے۔ غصہ کی دہکتی، پھنکارتی موجوں کو وہ اپنے اخلاق کے سمندر میں جذب کرلیتا ہے۔ نہ تو خوشی ہی اُسے اتاؤلا بناتی ہے اور نہ ہی غم اس کو پاگل کرتا ہے۔ نہ تو وہ حالات سے جلد اکتاجاتا ہے اور نہ ہی کسی فرد سے جلد متنفر ہوجاتا ہے۔ حالات کو وہ خدا کی دین سمجھتا ہے اور پورے صبر وتحمل سے وہ اس کے بدلنے کا انتظار کرتا ہے۔ فرد کو وہ بشر جانتا ہے۔ اُس کی کمزوریوں سے صرفِ نظر کرکے وہ اس کی عمدہ صلاحیتوں کی قدر کرتا ہے اور اس کے فروغ کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے برخلاف کم ظرف جلد باز اور بے صبرا ہوتا ہے۔ وہ جتنی جلدی خوش ہوتا ہے اتنی ہی جلدی ناراض بھی ہوجاتا ہے۔ ادنیٰ سی تکلیف سے وہ پریشان ہوکر واویلا مچانا شروع کردیتا

ہے، شکوے شکایت کے دفتر کھول دیتا ہے۔ اس وقت وہ تقدیر اور خدا کو بھی نہیں بخشتا۔ حالات سے تنگ آکر وہ خودکشی بھی کرسکتا ہے۔ کسی انسان سے خوش ہوتا ہے تو اس کو دیوتا بنا دیتا ہے اور ناراض ہوتا ہے تو شیطان سے بھی بدتر ثابت کردیتا ہے۔ اس کے کسی کام میں توازن نہیں ہوتا۔ وہ پرلے درجے کا ناشکرا اور بے صبرا ہوتا ہے۔

(۹) اعلیٰ ظرف انسان ستار ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کا عیب چھپانا جانتا ہے۔ کسی کی پردہ دری نہیں کرتا۔ کسی کو بدنام نہیں کرتا۔ کسی کی ٹوہ میں نہیں لگتا۔ بات بات میں دوسروں کی کمزوری یا کسی خامی کا حوالہ نہیں دیتا۔ اس کی زبان سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ وہ نہ تو کسی پر جھوٹا الزام لگاتا ہے، نہ سنی سنائی برائیوں کو پھیلاتا ہے اور نہ ہی کھلے چھپے کسی کا عیب دوسرے پر ظاہر کرتا ہے۔ ہمیشہ ہر ایک کا تذکرہ وہ اچھے الفاظ میں اچھی صفات کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا اس کی عیب جوئی کرتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتا بلکہ معاف کردیتا ہے اور ہر برائی کے بدلے بھلائی کرتا ہے۔

کم ظرف دوسروں کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ اگر کسی کی ادنیٰ سی خامی اس کے علم میں آگئی تو وہ اس کو فوراً عام کردیتا ہے۔ کردارکشی سے وہ کسی وقت نہیں چوکتا۔ بہتان، تہمت، غیبت، ہر ہتھیار سے کام لے کر وہ معاشرہ میں دوسروں کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔ سانپ بچھو کی طرح منتقم اور مکھی کی طرح گندگی پسند ہوتا ہے۔ اس کی بینائی اچھی صفات دیکھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ لوگوں کے کمزور پہلوؤں پر ہوتی ہے۔

(۱۰) اعلیٰ ظرف انسان ہمیشہ دوسروں کی احتیاج اور ضروریات پر نظر رکھتا ہے۔ کسی کی محرومی، رنج و غم اور مصیبت اس سے دیکھی نہیں جاتی۔ وہ اپنے وقت، مال و دولت نیز صحت و قوت کے ذریعہ ہر ایک کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ بیمار، مریض، مظلوم، تنگ دست اور پریشان ذہن انسانوں کو اپنی استطاعت کے مطابق وہ مدد پہنچاتا ہے۔ بلکہ اپنی ذات کے علاوہ دنیا کے ہر انسان کو وہ اپنی مدد کا محتاج سمجھتا ہے۔ کبھی تبسم، کبھی ظرافت، کبھی زبانی دل دہی و ہمدردی اور کبھی مال و وقت خرچ کرکے دوسروں کے کام آتا ہے۔

کم ظرف اپنی ذات میں گم ہوتا ہے۔ اس کی جان، مال، وقت، وقار سب اس کی اپنی ذات کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اول تو اسے کسی سے سروکار ہی نہیں ہوتا اور اگر کبھی بھولے سے کسی کی ذرا سی مدد کردی تو ہزار احسان جتاتا ہے۔ اپنے کو کارساز ثابت کرتا ہے اور ادنیٰ سی خدمت کا بھی جگہ جگہ تذکرہ کرتا رہتا ہے۔

(۱۱) اعلیٰ ظرف انسان ہر ایک کے بارے میں خوش گمان ہوتا ہے۔ جب تک کوئی واضح ثبوت نہ ملے وہ کسی سے بدگمان نہیں ہوتا اور اگر کوئی معذرت پیش کرے تو اس کو قبول کر کے بدگمانی کے داغ سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے۔

اس کے برخلاف کم ظرف انسان کا ہر کام بدگمانی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کی گفتگو، آمد و رفت، لین دین، سلوک اور برتاؤ غرض ہر چیز میں منفی اور تاریک پہلو دیکھتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں کی نیکیوں کو بدنیتی اور دکھاوے پر محمول کرتا ہے۔ وہ اپنے علاوہ ہر ایک کو خود غرض اور ریاکار گنہ گار سمجھتا ہے۔

(۱۲) اعلیٰ ظرف راست باز ہوتے ہیں۔ ان کا رویہ ہر ایک کے ساتھ سیدھا اور سچا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے مکر و فریب، کھوٹ اور چھل کپٹ سے ان کا دل پاک ہوتا ہے۔ ان کا ہر معاملہ خلوص، دیانت داری اور صدق و صفا پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ دل کھول کر ہر ایک سے ملتے ہیں۔ باتیں صاف اور ستھری کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اچھا اور سیدھا راستہ بتاتے ہیں۔ کسی کو مغالطے میں نہیں رکھتے وعدہ پورا کرتے ہیں۔

کم ظرف دھوکے باز ہوتے ہیں مکر و فریب ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ مخاطب کو اکثر مغالطے میں رکھتے ہیں۔ بات ایسی پیچیدہ اور ذومعنی کرتے ہیں جس کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں اور ہمیشہ اپنی گفتگو کی وہی تشریح قبول کرتے ہیں جو اس کے مفاد میں ہو۔ وعدہ خلاف، شاطر، عیار اور مکار ہوتے ہیں۔

(۱۳) اعلیٰ ظرف صلح پسند اور ملنسار ہوتے ہیں۔ تعلقات کو ہمیشہ استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ معاف کرتے ہیں اور معافی مانگ لیتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر سدا نقطۂ اتفاق اور تعاون ان کا طریقۂ کار ہوتا ہے۔ وہ امن و سکون اتفاق و اتحاد کی برکتوں کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس کے لیے انھیں نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔

کم ظرف فتنہ پرور اور جھگڑالو ہوتے ہیں ضد، ہٹ دھرمی اور تکبر نفس کی وجہ سے ان کے تعلقات دوسروں سے ہمیشہ خراب رہتے ہیں۔ وہ نہ کسی کو معاف کرنا جانتے ہیں اور نہ کسی کے آگے جھکتے ہیں۔ اُن کی نازک حس ہمیشہ نقطۂ اختلاف تک پہنچتی ہے۔ تطابق اور تعاون کو وہ بزدلی خیال کرتے ہیں۔ فتنہ و فساد اور ہر طرح کے نقصان کو وہ اپنی آن کی خاطر برداشت کر سکتے ہیں۔ کسی ثالث یا مصالحت خواہ کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔

(۱۴) ظرف والے قدرداں ہوتے ہیں وہ خدا کے عطا کردہ وسائل زندگی، رشتہ دار، دوست، احباب خادم، مخدوم سب کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں۔ اُن کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہر ایک کے تعاون اور کام کو اپنے کام اور تعاون سے بڑا سمجھتے ہیں۔ بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں دل دہی، دلداری اور ہمت افزائی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کاروبار یا گھر یا دفتر کی ہر کامیابی

کا سہرا دوسروں کے سر باندھتے ہیں۔

کم ظرف ناقدرے اور خود پسند ہوتے۔ ان کو خدا کی عطا کردہ ہر چیز میں نقص نظر آتا ہے۔ ہر رشتہ دار خود غرض، ہر دوست مطلبی، ہر خادم کام چور، ہر حاکم ظالم محسوس ہوتا ہے۔ اپنا، غیروں کا، حالات کا، غرض ہر چیز کا شکوہ ان کے شب و روز کی تسبیح ہوتی ہے۔ عیب جوئی، ہمت شکنی، لعنت ملامت کرنے سے وہ کبھی باز نہیں آتے۔ وہ ہر ناکامی کو دوسروں کے سر منڈھتے ہیں اور کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں۔

(۱۵) اہلِ ظرف راز دار ہوتے ہیں۔ ان کا سینہ ایک بے کراں سمندر ہوتا ہے جس میں اپنے اور غیروں کے ہزاروں راز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی قیمت پر بھی کسی کا راز افشا نہیں کرتے۔ بعض اوقات تو دوسروں کی عیب پوشی میں ان کی شخصیت بھی داغ دار اور بدنام ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ ہر قسم کی قربانی دے کر دوسروں کی امانت کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ آخر کار ان کی موت کے ساتھ ہی وہ راز دفن ہو جاتے ہیں۔

کم ظرف پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں۔ جب تک وہ دوسروں کا راز کسی کے پاس اگل نہ دیں انھیں چین نہیں ملتا۔ بسا اوقات وہ ادنیٰ سی بات کو نمک مرچ لگا کر دلچسپ اور پراسرار بنا دیتے ہیں۔ دوست دشمن کسی کی عزت ان سے محفوظ نہیں رہتی۔ شرفا ان کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں۔

(۱۶) ظرف والوں کا سینہ حرص اور لالچ سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی عطا کردہ ہر نعمت پر وہ صابر و شاکر ہوتے ہیں۔ وقت ضرورت اپنے وقت، صحت اور مال کو دوسروں کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ خدمت کرنے کا ادنیٰ سے ادنیٰ موقع بھی وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ کسی بھی دوست، رشتہ دار یا ملاقاتی کی کوئی نہ کوئی خدمت کرنا پسند کرتے ہیں۔ اُن کے کام آتے ہیں اور اُن کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ فراخ دل اور سخی ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس آدھی روٹی ہو تو چوتھائی روٹی سے اپنے بھائی کی تواضع ضرور کرتے ہیں۔ بے نیاز اور خود دار ہوتے ہیں۔ اپنی حاجت کسی پر ظاہر نہیں کرتے لیکن دوسروں کی حاجت براری کے لیے ہر دم مستعد رہتے ہیں۔

کم ظرف پرلے درجے کے لالچی اور حریص ہوتے ہیں۔ مال و دولت، عزت و شہرت، نام و نمود، ہر چیز کی انھیں طلب ہوتی ہے۔ لیکن دوسروں کی مدارات میں بغیر کسی مفاد کے وہ ایک پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتے نہ ان کی حیثیت کسی کے کام آسکتی ہے اور نہ وقت۔ کنجوس اور تنگ دل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہنا بھی انھیں پسند نہیں۔ مگر اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ خوشامد اور چاپلوسی کر سکتے ہیں۔ قصیدے اور سپاسنامے پیش کر سکتے ہیں۔ وقت اور دولت کا بے تحاشہ استعمال بھی کر سکتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں پر مفاد کی عینک چڑھی ہوتی ہے۔ وہ خیر و احسان

سے کوئی مطلب نہیں رکھتے۔

(۱۷) اہلِ ظرف رحیم و کریم، شفیق و مہربان ہوتے ہیں۔ ان کے دل اُنس و محبت سے بھرے ہوتے ہیں۔ دوسروں کی تکلیف، پریشانی، نقصان اور مصیبت انھیں اپنی محسوس ہوتی ہے۔ غم خوار، دلدار اور مونس ہوتے ہیں۔ دوست احباب، رشتہ ناطے دار، پاس پڑوس، مسافر یا ملاقاتی کسی کی پریشانی سے وہ صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ مال و اسباب، تگ و دو، دعا و دوا، غرض جس طرح بھی، وہ کسی کے کام آسکتے ہیں آجاتے ہیں۔ کسی بھی موقع پر بے جا سہل انگاری اور تغافل سے کام نہیں لیتے۔ اگر ان کے ساتھ کبھی بے اعتنائی برتی گئی ہو تو وہ اس کو بھلا دیتے ہیں۔ کبھی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔

کم ظرف شقیق القلب اور بے رحم ہوتے ہیں۔ ان کا سینہ رافت و الفت جیسے لطیف جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو دنیا کا محتاج ترین اور مصیبت زدہ انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسروں کی مدد کرنے سے کترانے کے ہزار بہانے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ دوسروں کی محتاجی غربت، مصیبت اور پریشانی سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی تو وہ اس قدر بھیانک ہو جاتے ہیں کہ اپنے خونی رشتوں، مخلص دوستوں اور بے یار و مددگار محتاجوں پر بھی ترس نہیں کھاتے۔

اہلِ ظرف کے جو اوصافِ حمیدہ مندرجہ بالا سطروں میں گنائے گئے ہیں وہ ان مکارمِ اخلاق میں سے چند ہیں جن سے دینِ اسلام اپنے ماننے والوں کو مزین دیکھنا چاہتا ہے۔

اور کم ظرفوں کے جو اخلاقی رذائل گنائے گئے ہیں وہ ان بُری خصلتوں میں سے چند ہیں۔ دینِ اسلام جن سے اپنے ماننے والوں کو بچانا چاہتا ہے۔

مومن ایک معیاری انسان ہوتا ہے۔ اونچے ظرف والا آدمیت کی ساری خوبیوں سے مزین ہوتا ہے۔ آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ ظرف والے بُزدل، مصلحت کوش اور خوشامدی ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ بہادر، جری، صاف گو، حق شناس اور خود دار ہوتے ہیں۔

وہ صرف اور صرف خدا سے ڈرتے ہیں۔ آخرت کے انجام پر نظر رکھتے ہیں۔ چند روزہ دنیا کی فانی لذتوں سے بے رغبتی انھیں کم ظرف ہونے سے بچاتی ہے اور آخرت کی بیش بہا و سدا بہار نعمتیں انھیں اعلیٰ ظرفی کا حوصلہ دیتی ہیں۔

اب ہم قرآن و احادیث کے چند ایسے اقتباسات پیش کریں گے جن سے معلوم ہوگا کہ دراصل ساری اچھی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن و احادیث ہیں اور ان تعلیمات پر عمل کر کے ہی انسان اعلیٰ ظرف بن سکتا ہے اور اپنے آپ کو کم ظرفی سے بچا سکتا ہے۔ معاشرہ کا امن، تعلقات کی استواری اور روح کا سکون

ہم اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ ہم خدا کے فرمان اور اس کے رسول محمدؐ کی تعلیمات پر عمل کریں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ○ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ○ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○

(سورہ حجرات۔ ۱۱تا۱۳)

اے ایمان والو! تم میں سے مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہوسکتا ہے جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہوسکتا ہے کہ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو لعن طعن کرو۔ اور نہ کسی کا نام بگاڑو۔ ایمان لانے کے بعد کفر میں نام پیدا کرنا کتنا برا ہے۔ بس جو توبہ نہیں کرے گا اس کا شمار ظالموں میں ہوگا۔ اے ایمان والو! زیادہ گمان کرنے سے بچو کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں اور نہ کسی کی ٹوہ میں لگو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ تو تم ان سے گھن کروگے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کردیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سب سے افضل وہ ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ○ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ○ (المعارج ۲۴،۲۵)

اور مومنین کے مال میں مانگنے والوں اور ناداروں کا حق ہوتا ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ (المزمل ۱۰)	اور ان کی دل آزار باتوں کو سہتے رہو اور ان سے بحسن وخوبی کنارہ کشی اختیار کرو۔
وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص ۷۷)	اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرو جیسا کہ خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی۔
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (طٰہٰ ۱۳۱)	اور نگاہ بھی نہ اٹھاؤ دنیوی زندگی اور اس کی شان وشوکت کی طرف جو ہم نے ان میں سے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہے وہ تو ہم نے انھیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا حلال رزق ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور ۲۲)	اور انھیں چاہئے کہ معاف کریں اور درگذر سے کام لیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم سے درگذر فرمائے خدا تو بہت زیادہ درگذر فرمانے والا بہت مہربان ہے۔
خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف ۲۲)	درگذر کی راہ اختیار کرو، بھلی باتوں کی تلقین کرو اور جاہلوں سے نہ الجھو
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (لقمٰن ۱۸)	اور تکبر میں لوگوں سے اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اکڑ کر چل بے شک اللہ کسی بھی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔
وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَي الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان ۶۳)	اور خدا کے پیارے بندے زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (الفرقان ۷۲)	اور جب کسی بیہودگی سے ان کا گذر ہوتا ہے تو شرافت کے ساتھ گذر جاتے ہیں
وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ (التوبہ ۷۱)	اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ہمدم ورفیق ہیں۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (الحجرات ۱۰)	مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں پس دو بھائیوں میں ملاپ کرادو۔

.... وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۔ (البقرہ ۸۳) — اور لوگوں سے بھلی بات کہو

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى ۔ (النحل : ۹) — بے شک اللہ تعالیٰ انصاف، دوسروں پر احسان کرنے اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دیتا ہے۔

اب بعض احادیث آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ اِنْ كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا حِفْظُ اَمَانَةٍ وَصِدْقُ حَدِيْثٍ وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ وَعِفَّةٌ فِىْ طُعْمَةٍ (مشکوٰۃ) — حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار چیزیں تمہیں میسر ہوں تو دنیا کی کسی چیز سے محرومی تمہارے لیے نقصان دہ نہیں ہے: امانت کی حفاظت راست گفتاری، خوش خلقی اور روزی میں پاکیزگی۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِىْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ (مشکوٰۃ) — حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے سنا کہ مومن وہ نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے حالانکہ پڑوس میں اس کا ہمسایہ بھوکا تڑپ رہا ہے۔

عَنْ اَبِىْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِىِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَحَبَّكُمْ اِلَىَّ وَاَقْرَبَكُمْ مِنِّىْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَحَاسِنُكُمْ اَخْلَاقًا وَاِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَىَّ وَاَبْعَدَكُمْ مِنِّىْ مَسَاوِيْكُمْ اَخْلَاقًا الثَّرْثَارُوْنَ وَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ — بروایت ابو ثعلبہ خشنیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب اور زیادہ محبوب تم میں سے وہ ہوں گے جو اخلاق میں بہتر ہوں اور مجھ سے زیادہ دور اور ناپسندیدہ وہ ہوں گے جو تم میں سے اخلاق میں برے ہیں، جن کی زبانیں قینچی کی طرح چلتی ہیں جو منہ پھلا پھلا کر تکلف سے بات کرتے ہیں۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ ۔ — بروایت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گمان، اٹکل اور بے بنیاد قیاس آرائیوں سے بچو، اس لیے کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَا رَأَیْتُ اَحَدًا اَکْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (ترمذی، مشکوٰۃ)

عبداللہ بن حارثؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَۃً اِنْ کَرِہَ مِنْھَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْھَا آخَرَ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کوئی مومن شوہر اپنی بیوی سے بغض نہ رکھے۔ اگر اس کی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو اس کی کوئی دوسری خصلت اُسے خوش کر دے گی۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ۔ (مشکوٰۃ، مسلم، بخاری)

بروایت ابوموسیٰ اشعریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کے لیے سہارا بنتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثِ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔

(مشکوٰۃ، بخاری، مسلم)

بروایت ابوایوب انصاریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ بے تعلقی اختیار کرے۔ جب بھی دونوں آمنے سامنے ہوں تو ایک دوسرے سے منہ پھیر کر گذر جائیں۔ دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔"

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَہُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ (ترمذی، نسائی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہے اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کے بارے میں امن سے ہوں۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَکُمْ هُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا جو تم میں سے (مال جسم وجاہت میں) بہتر ہیں ان کو نہ دیکھو اور جو تم میں سے اس لحاظ سے فروتر ہیں ان کو دیکھو۔ اس طرح یہ صلاحیت پیدا ہو سکے گی کہ تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ جب تم میں سے کسی کی نگاہ ایسے شخص کی طرف اٹھے جو مال اور جسمانی طاقت میں اس پر فضیلت دیا گیا ہے تو چاہیے کہ اُسے دیکھے جو اس لحاظ سے فروتر ہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس الشدید بالصرعۃ انما الشدید من یملک نفسہ عند الغضب (مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پہلوان وہ نہیں جو حریف کو میدان میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے

عَنْ عُمَرَ قَالَ وَهُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ یَا اَیُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ نَفْسِهٖ صَغِیْرٌ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ عَظِیْمٌ وَمَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ صَغِیْرٌ وَفِیْ نَفْسِهٖ کَبِیْرٌ حَتّٰی فَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِمْ مِنْ کَلْبٍ وَخِنْزِیْرٍ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے ایک بار منبر پر سے خطبہ دیا دیتے ہوئے فرمایا۔ اے لوگو! تواضع، انکساری اختیار کرو۔ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، جو اللہ کے لیے جھکتا ہے اللہ اسے بلند کرتا ہے۔ وہ اپنے کو چھوٹا سمجھتا ہے حالانکہ وہ لوگوں کی نگاہ میں بڑا ہے اور جس نے تکبر کیا وہ لوگوں کی نگاہ میں چھوٹا ہے۔ حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو بڑا خیال کرتا ہے یہاں تک کہ وہ ان کے سامنے کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔

انسانِ کامل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اعلیٰ ظرفی کی مکمل مثال ہے۔ مکی زندگی زندگی کا صرف ایک واقعہ بطور مثال پیش ہے۔

دعوت و تبلیغ کا تیسرا دور ہے۔ ہر طرف مخالفتوں کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ گھر گھر الزام تراشیاں ہو رہی ہیں گلی گلی میں مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ کہیں کہیں ظلم و ستم کے بازار بھی گرم ہو رہے ہیں۔ اسی دوران مکہ کے بازار سے ایک بڑھیا کچھ سامان خریدتی ہے۔ سامان بھاری ہونے کی وجہ سے وہ کسی مزدور کی جستجو میں ہے۔ پیارے نبیؐ اس کی مدد کرتے ہیں اور کہتے ہیں" اماں چلئے میں آپ کا سامان پہنچا دوں۔ دونوں چلتے ہیں۔ راستہ میں بڑھیا اُس نبیؐ کو خوب کوستی ہے، گالیاں دیتی ہے جس نے بقول اُس کے مکہ کے گھر گھر میں انتشار پیدا کردیا ہے۔ آبائی رسم و رواج کو بُرا بھلا کہتا ہے اور معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ وہ بڑھیا اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے اور نصیحت کرتی ہے کہ تم اس نبیؐ کے چکر میں نہ آنا۔ حضورؐ پورے صبر و تحمل اور بُردباری سے ساری باتوں کو سنتے ہیں اور بڑھیا کے سامان کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے اُس کے گھر پہنچتے ہیں۔ بڑھیا مزدوری دینا چاہتی ہے۔ آپؐ لینے سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں، ضعیفوں، مجبوروں کی خدمت تو ہر انسان کا فرض ہے۔ پھر بڑھیا آپ کا تعارف چاہتی ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں، میں وہی محمدؐ نبی ہوں جس کو آپ راستے بھر صلواتیں سناتی آئی ہیں۔ بڑھیا آپؐ کے کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔

آپؐ کی زندگی ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک تھی۔ آپؐ کی بیویاں، صحابۂ کرام، ملنے جلنے والے، سبھی آپ کے گرویدہ تھے، عاشق تھے، جاں نثار تھے۔ کیوں کہ آپ کے دل میں کسی کے لیے بھی کوئی کپٹ نہ تھا آپ سب کے بہی خواہ اور مخلص صادق تھے۔

صحابۂ کرامؓ جن کی زندگی حضورؐ کی سیرت کی عکس جمیل تھی، بہت وسیع الظرف اور مثالی انسان تھے۔ حضرت ابوبکرؓ خلافت کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ایک بے سہارا بڑھیا کے گھر جا کر اُس کے گھر کا سارا گھریلو کام انجام دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ اپنی خلافت میں برسر منبر ہر قسم کی تنقید بڑے تحمل اور بردباری سے سن لیتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ شہید ہو گئے لیکن مسلمانوں میں خانہ جنگی کے احتمال سے آپ نے خارجیوں پر فوج کشی کا حکم نہیں دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک جنگ میں ایک یہودی کو پچھاڑ کر قتل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہودی آپ کے چہرۂ انور پر تھوک دیتا ہے۔ آپ قتل کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں کہ مبادیٰ یہ قتل میرے ذاتی جذبۂ انتقام کی وجہ سے نہ ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب ایک سازش کے تحت زہر ملا دودھ پی لیتے ہیں اور زہر کا اثر ہونے لگتا ہے تو دودھ پیش کرنے والے غلام کو فرار ہو جانے کا حکم دیتے ہیں کہ میری موت کے بعد لوگ سب سے پہلے تجھے ہی قتل کر دیں گے۔

تاریخ اسلام کے ہر دور میں اعلیٰ ظرفی کی مثالیں ملتی ہیں۔ سلطان ناصر الدین محمود ہندوستان کے ایک خدا ترس بادشاہ تھے۔ وہ سلطنت کے خزانے سے ذاتی اخراجات کے لیے ایک پیسہ

نہیں لیتے تھے۔ٹوپیاں سی کر اور کلام پاک نقل کر کے اپنے بال بچوں کی کفالت کرتے تھے۔ایک بار آپ کلام پاک لکھ رہے تھے۔ چند مہمان ملاقات کے لیے آگئے۔ان میں سے ایک صاحب نے کسی غلطی کی نشاندہی کی۔آپ نے اس جگہ کو پنسل سے گھیر دیا۔اُن صاحب کے چلے جانے کے بعد آپ نے پنسل کا دائرہ مٹا دیا۔لوگوں نے اس طرز عمل کی وجہ دریافت کی تو فرمایا "دراصل غلطی نہیں تھی مگر میں نے مہمان کا دل رکھنے کے لیے اُسے گھیر دیا تھا، اب مٹا دیا۔اُن کا دل بھی نہ ٹوٹا اور کلام کی صحت پر کوئی اثر بھی نہ پڑا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر بعض علماء کرام نے کتنی کیچڑ اچھالی اور مسلسل اُن کی ذات کو تذلیل و تنقیص کا نشانہ بناتے رہے لیکن آپ نے کبھی بھی اُن کا جواب ناشائستگی سے نہیں دیا اور لوگوں کے عیب و نقائص کا تحریری ثبوت رکھتے ہوئے بھی خدا کا بندہ پردہ پوشی کرتا رہا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک دن اپنا بیان ختم کر چکے تو ایک مرید آگیا۔معلوم ہوا کہ وہ دور دیہات سے صرف اُن کا بیان سننے آیا ہے۔آپ نے اس کے جذبہ کی قدر کی اور اس کو بٹھا کر اپنا پورا بیان دو ڈھائی گھنٹے کا دُہرا دیا۔

صبر و تحمل، توکل، ایثار، عیب پوشی، عفو و درگذر، تکریم، بے نفسی اور کسر نفسی ہی وہ اعلیٰ اوصاف ہیں جو ایک انسان کو اعلیٰ ظرف بناتے ہیں اور کم ظرفی کے مَیل سے پاک کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعلیٰ ظرف بنائے۔

سید قطب شہید - ایک عظیم اسلامی مفکر

جناب عبیداللہ فہد فلاحی

مصر کے نامور مصنف عباس محمود العقاد نے ۱۹۳۱ء میں پارلیمنٹ میں شاہ مصر فواد الاوّل پر شدید تنقید کی جنانچہ انہیں جیل بھیج دیا گیا مگر چند ہی دنوں کے بعد ان کی رہائی عمل میں آگئی۔ رہائی کے بعد عقاد کے ایک دوست نے ان سے دریافت کیا کہ "کیا یہ خبر صحیح ہے کہ احمد فواد نے وزیر اسماعیل صدقی کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ آپ کو مشورہ دے کہ آپ کچھ نہ کچھ معذرت پیش کر دیں تاکہ اسی کی بنا پر آپ کو رہا کر دیا جائے"؟ عقاد نے اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ دراصل احمد فواد اس بات سے ڈر گیا تھا کہ تاریخ کے صفحات پر یہ ثبت ہو جائے گا کہ اس کے عہد میں ایک اہل قلم کو آزادیٔ فکر کی پاداش میں نذر زنداں کر دیا گیا"۔ یہ مصر کا وہ دور تھا جسے مورخ تاریخ مصر کے سیاہ باب کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن بعد میں مصر کا ایک وہ دور بھی آیا جسے مصر کے "عہد زریں" اور اجتماعی مساوات" کے دور سے جانا جاتا ہے لیکن اسی" عہد زریں" کا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ایک ایسی کتاب کی تصنیف پر جس میں محکم اور مدلل انداز میں اصولی بحثیں کی گئی تھیں اور کسی شخصیت کو زیر بحث نہیں لایا گیا تھا۔ مصنف کو پھانسی دے دی گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ تماشہ بھی کہ فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تو دوران مقدمہ سرکاری وکیل کی طرف سے ملزم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا اس نے "معالم فی الطریق" کا مطالعہ کیا ہے اس مقدمہ کی فرد قرار داد جرم اسی کتاب پر مشتمل تھی۔ چنانچہ یہی کتاب سید قطب اور ان کے

---

(۱) یوسف حنا، محنۃ الفکر، روزنامہ الدفاع، اردن شمارہ ۱۳ اگست ۱۹۶۶ء

ساتھیوں کو تختہ دار پر لے جانے کا موجب ہوئی[۲]

سید قطب مصری معاشرہ میں ایک ہونہار ادیب کی حیثیت سے ابھرے۔ سیاسی اور اجتماعی نقاد کی حیثیت سے انھوں نے نام پیدا کیا، صحافت کی دنیا میں آئے تو سُرخ و زرد صحافتوں کے خلاف تہلکہ مچا دیا۔ ماہنامہ ''العالم العربی'' کی ادارت کی۔ ''الفکر الجدید'' کے نام سے اپنا ایک ماہنامہ جاری کیا۔ ''الاخوان المسلمون'' کی چند دنوں تک ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ تفسیر کی دنیا میں ''فی ظلال القرآن'' لکھ کر زندۂ جاوید بن گئے۔[۳] ان کی زندگی کے مختلف گوشے ہیں، خدمات کے مختلف میدان ہیں، متعدد کوچوں میں جولانی کی ہے لیکن یہاں ایک انقلابی مفکر کی حیثیت سے ان کا تعارف کرانا مقصود ہے ورنہ ان کی حیات و خدمات پر ایک الگ تصنیف درکار ہے۔

سید قطبؒ نے اسلامیات کے میدان میں جو تصنیفات چھوڑیں انھیں تین مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اسلامی علوم وفنون سے متعلق ان کی تحریروں کو پہلے مرحلہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں سید قطب نے اسلامیات کے مختلف میدانوں میں کتابیں لکھیں اور جو ادبی ذوق انھیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا اسے اسلام کی خدمت میں لگایا ایک زمانے میں وہ نامور ادیب طٰہٰ حسین کے حلقہ سے وابستہ تھے اور اپنا افسانہ 'طفل من القریہ' (گاؤں کا بچہ) انہیں کے نام سے معنون کیا تھا اور پھر عباس محمود العقاد کی مجلس علم وادب کے گل سرسبد رہ چکے تھے۔ مصطفیٰ صادق رافعی کے خلاف عقاد کے دماغ میں ان کی انشار پردازی قرآنی ادب کی جانشینی لے کر آئی اور ان کے ادب وانشار کا رشتہ خداوند عالم کی آخری کتاب کے ساتھ بندھ گیا۔ انھوں نے ادبی ذوق کی سیرابی اور اسالیب بلاغت اور اصول ایجاز کی تلاش میں قرآن پاک کو اپنے مطالعہ وتحقیق کا محور

۲۔ روزنامہ المنار، اردن شمارہ ۳۰ راگست ۱۹۶۶ء

۳۔ سید قطب کی زندگی کے ان مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے راقم نے ایک کتاب کا مسودہ تیار کرلیا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آجائے گا۔ یہ مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے جسے افادہ کی خاطر پیش کیا جارہا ہے۔

بنایا اور اسی وقفہ میں اللہ نے ان پر اپنی حکمت و ہدایت کے دروازے بھی وا کئے۔ اس مرحلہ میں سید صاحب کی تین گراں قدر تصنیفات رکھی جا سکتی ہیں:

۱۔ **مشاھد القیامۃ فی القرآن** (مناظر قیامت قرآن میں) اس کتاب میں سید قطب نے قیامت کے مناظر بیان کئے ہیں۔ یہ مناظر قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۸۰ سورتوں میں ۱۵۰ مواقع پر بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا صرف ادب و لطافت کی چاشنی سے ہی محظوظ نہیں ہوتا بلکہ آیات جنت کو پڑھتے ہوئے جنت کے لذائذ اور آیات دوزخ کو پڑھتے ہوئے دوزخ کی تپش کو بھی محسوس کرتا ہے۔ یہ کتاب ادب و فن کا شاہکار ہونے کے ساتھ دعوتی نقطۂ نظر سے بھی بے مثال ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ کے فرائض جناب نصراللہ خاں نے انجام دیئے ہیں۔

۲۔ **التصویر الفنی فی القرآن**: یہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ المجمع العلمی العربی نے اس موضوع پر اس کتاب کو بے مثل قرار دیا ہے۔ اس میں قرآن کی ادبی قدر و قیمت اجاگر کی گئی ہے۔ قرآن کی جادو بیانی کا منبع، قرآن کیسے سمجھا گیا، قرآن کے مناظر کی فنی تصویر کشی، حسی تخیل، فن کے لحاظ سے نظم کلام، قرآنی قصے، قصوں کے اغراض و مقاصد، قصہ گوئی میں فن اور دین کا امتزاج قصہ کے فنی خصائص، قصہ میں واقعہ نگاری کا جزو، قرآن کے انسانی نمونے، وجدان منطق اور قرآن کا طریق دعوت، ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری (پاکستان) نے کیا ہے اور ہندوستان سے بھی یہ ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ (۴)

۳۔ **فی ظلال القرآن**: یہ سید قطب کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ قرآن پاک کی یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اس تفسیر کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ بلند پایہ ادبی اسلوب میں تحریر کی گئی ہے، اسرائیلیات سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے تمام معروف تفاسیر سے اس طرح استفادہ کیا گیا ہے کہ یہ معلومات کا دائرۃ المعارف بن گئی ہے۔ معتزلہ و خوارج اور

---

(۴) یہ اردو ترجمہ "قرآن کے فنی محاسن" کے نام سے ۱۹۸۳ء میں فردوس پبلی کیشنز دہلی سے طبع ہو چکا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس کتاب کا اردو نام "قرآن کی منظر نگاری" ہونا چاہئے کیونکہ مصنف نے عام محاسن سے تعرض کرنے کے بجائے اسی ایک اسلوبی خصوصیت تصویر کشی اور منظر نگاری پر اپنی پوری توجہ مبذول رکھی ہے۔

اشاعرہ و ماتریدیہ کے تمام نزاعات سے خالی ہونے کے ساتھ اس تفسیر میں ایسی پاکیزہ روح اور شفاف فکر کارفرما نظر آتی ہے جو ایمان ویقین اور صبر و عزیمت کی دولت سے معمور ہے۔ فارسی میں درسایہ قرآن کے نام سے اس کے متعدد پارے چھپ چکے ہیں اور اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہورہا ہے۔[۵]

سید قطب کی اسلامی تصنیفات کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں انھوں نے اسلام کے مختلف موضوعات پر گہرافشانی کی ہے اور مضبوط و محکم دلائل اور مؤثر اسلوب میں دنیا کو اسلام کی طرف پلٹنے کی دعوت دی ہے۔ ان تحریروں میں سید قطب مشرقی و مغربی بلاکوں پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں اور امت مسلمہ کی کامیابی کا راز اسلام کی دعوت میں سمجھاتے ہیں۔ ان تحریروں میں انسانی ذہن کو اپیل کرتے، دماغوں کو دستک دیتے اور قلب انسانی کو جھنجھوڑتے ہیں۔ اس مرحلہ کی مشہور ترین کتابیں العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، معرکۃ الاسلام والراسمالیۃ، السلام العالمی والاسلام ہیں۔ سید قطب کی کتاب دراسات اسلامیۃ کو بھی اسی مرحلہ میں شامل کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ وہ متعدد صحافتی مقالات کا مجموعہ ہے اس لئے سید قطب کی صحافت سے بحث کرتے ہوئے اس تصنیف پر گفتگو کرنا بہتر ہوگا۔

تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں سید قطب اسلام کے عظیم مفکر و داعی نظر آتے ہیں۔ یہ تحریریں یورپ کے سفر کے بعد اسلام کی حقانیت اور صداقت پر مزید اطمینان کا پیغام ثابت ہوئیں حکومت کی طرف سے سید قطب کو جدید طریقۂ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کے لئے امریکہ بھیجا گیا اور دو سال کے قیام کے بعد مصنف امریکہ سے لوٹے اور اخوان المسلمون سے وابستہ ہوگئے۔[۶] یہ وہ دور تھا جب دوسری عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اخوان المسلمون کی تحریک نے عوامی پیمانے پر سیاسی مسائل میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ اس وقت اخوان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو سالوں کے اندر اندر ان کے صرف کارکنوں کی تعداد ۵ لاکھ تک پہونچ گئی تھی اور عام ارکان اور ہمدردوں اور حامیوں کی تعداد اس سے بھی دوگنی تھی۔[۷] اس مرحلہ میں سید قطب

۵) مولانا سید حامد علی نے اس کا ترجمہ کیا ہے جس کا آخری پارہ ہندوستان پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوچکا ہے۔ باقی پاروں کی طباعت واشاعت کا کام جاری ہے۔ (۶) یوسف العظم، الشہید سید قطب ص ۲۷

۷) محمد شوقی زکی، الاخوان المسلمون والمجتمع المصری، ص ۲۱

کی تحریروں نے ظلم و جاہلیت کے خلاف آگ لگادی۔ عوام کو منظم و متحد ہوکر اسلام کے قیام کے لئے جدوجہد پر اکسایا، اسلامی نظریہ اور اسلامی تنظیم کے خدوخال بیان کئے اور اس بنیادی مسئلہ پر ساری توجہ مرکوز رہی کہ جس طرح اسلام کے صدر اوّل میں اسلامی معاشرہ ایک مستقل اور جداگانہ معاشرہ کی صورت میں ترقی و نمو کے فطری مراحل طے کرتا ہوا بام عروج کو پہنچا تھا اس طرح آج بھی ویسا صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کے لئے اسی طریق کار کو اختیار کیا جانا لازم ہے۔ اس اسلامی معاشرہ کو اردگرد کے جاہلی معاشروں سے الگ رہ کر اپنا تشخص قائم کرنا ہوگا۔

اس ۔ علامیں ہذا الدین، المستقبل لہذا الدین، خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ، الاسلام ومشکلات الحضارۃ، اورمعالم فی الطریق جیسی انقلابی تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں اب ان تمام تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جائے گا اور آخر میں سید قطب کی تحریری خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام: اسلام کے عادلانہ اجتماعی نظام پر یہ کتاب سید قطب نے ۱۹۴۹ء میں لکھی تھی۔ ان کی پہلی تصنیف جس میں اسلامی فکر و تہذیب کے سوتے ابل رہے ہوں یہی ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں سید قطب اپنے تازہ مطالعہ کی بناپر ترمیم واضافہ کرتے رہے۔[۸۰] اس کتاب کے دنیا کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ SOCIAL JUSTICE IN ISLAM کے نام سے امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوچکا ہے۔ فارسی، ترکی، انڈونیشی اور اردو میں بھی ترجمے چھپ چکے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی نے "اسلام کا عدل اجتماعی" کے نام سے کیا ہے جو مترجم کے مقدمہ کے ساتھ متعدد بار چھپ کر اہل علم و تحقیق سے خراج تحسین وصول کرچکا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "قرآن کی فنی تصاویر" اور مناظر قیامت" کا ادیب لبیب اب فکر اسلامی کا داعی اور نظام اسلامی کا ترجمان بن چکا ہے جس میں

۸۰۔ پائس کے، مورادیب و مجاہد علال الفاسی لکھتے ہیں کہ "سید کی اس تصنیف پر میں نے بعض مقامات پر گرفت کی چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے ان مقامات پر تبدیلی کردی۔ (روزنامہ العلم، مراکش، شمارہ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۶ء) اور یہ کسی بھی مصنف کی وسعت ظرف اور وسعت تحقیق کی دلیل ہے۔

تدریج اسلامی شخصیت کے نشوونما تھا۔ اسلامی نظام کے فوائد و برکات اور عدل اجتماعی کے اسلامی تصور روشنی ڈالتے ہوئے سرزمین اسلام میں حکومت الہیہ کے قیام کا پر زور مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ادب و فن سے تحریک و انقلاب کی طرف ان کی یہ پیش رفت ان کے ان دو خطوط سے معلوم ہوتی ہے جو مصنف نے امریکہ میں قیام کے دوران اپنے مصری دوست نقاد و ادیب انور معداوی کو لکھے تھے۔ ان خطوط سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے :

سید قطب ان مسلمانوں پر سخت تنقید کرتے ہیں جو مغربی ممالک میں جا کر اپنی شخصیت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ یورپ کے فکری نظام اور مادی تہذیب کا شکار ہو کر عقل و خرد سے بے مایہ ہو جاتے اور اندھی تقلید میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بصیرت و بصارت سے محروم ان نقالوں پر مصنف کی جارحانہ تنقید ان کی اسلام سے شیفتگی اور غیر اسلامی فکر و تہذیب سے نفرت کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ جو مصری یورپ و امریکہ میں جا کر وہیں کی راگ الاپنے لگتے ہیں ان سے سید قطب متنفر ہیں۔

دوسری بات ان خطوط سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ امریکہ میں بیٹھ کر اسلامی نظام کے لئے ابتدائی خاکہ تیار کرتے ہیں اور ظلم و جاہلیت کے خلاف سینہ سپر ہونے کا عزم کرتے ہیں کیونکہ وہ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ جو زندگی باقی رہ گئی ہے اسے اجتماعی پروگرام کے لئے استعمال کیا جائے۔

مکتوب اول :

بھائی انور !

آپ پر سلامتی ہو۔ آپ کیسے ہیں اور آپ کے ادب و فن کا کیا حال ہے؟ اب تو مجھے ماضی قریب کی باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ یہاں اجنبیت ہی اجنبیت ہے۔ وطن ہی کی نہیں حقیقی غربت ہے، نفس اور فکر کی غربت، روح اور جسم کی غربت! ایک اضطراب اور بے چینی کی کیفیت ہے جس کی عالم جدید دعوت دے رہا ہے۔

اب مجھے اس پروپیگنڈہ کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے جو امریکہ دنیا بھر میں کر رہا ہے اور جس میں برابر کے شریک وہ مصری بھی ہیں جو امریکہ آکر یہاں سے واپس گئے ہیں۔ اب میں اس پروپیگنڈہ کا پردہ چاک کر سکتا ہوں جو یورپ اور یہاں سے واپس جانے والے مصری کرتے رہے ہیں۔ یہ مضمحل اور پژمردہ افراد اپنی کوئی قدر و قیمت محسوس نہیں کرتے اور یورپ و امریکہ کی شان میں قصیدے پڑھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ شاید اسی

سے وہ اپنی قدر و قیمت متعین کرنا چاہتے ہیں۔

اب انگریزی زبان کی تحصیل کا کام مکمل ہو چکا ہے اور میرے پاس وقت ہے کہ آپ لوگوں کے حالات و واقعات دریافت کروں اور وطن عزیز جو اپنی قوم میں گمنام ہے کی تفصیلات سن سکوں۔ شاید آپ کے پاس اتنا وقت ہو کہ وہاں کی زندگی، ادب اور اپنے نجی احساسات مطلع کر سکیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا بھائی سید قطب۔ کولوراڈو: ۲۲-۱۲-۱۹۴۹ء

مکتوب دوم

بھائی انور!

آپ کا مکتوب میری نفسیاتی ضرورت ہے کہ میں خوش رہ سکوں اور آپ کے بارے میں میرا حسن ظن باقی رہے۔ پردۂ خفا میں رہتے ہوئے بہت سے لوگ مجھ پر ملامت کر رہے ہیں کہ میں نے ادبی تنقید کے لئے آپ کو کیوں "العالم العربی" مجلہ میں بھیج دیا ہے حالانکہ میں نے عقل و ہوش مندی کے ساتھ یہ کام کیا ہے جبکہ ملامت گروں کو پرواہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

میری خوشی و مسرت میں اس سے اضافہ ہوتا رہا ہے کہ وقفہ وقفہ سے آپ نے "الرسالۃ" میں قسط وار چھپے ہوئے مضامین میرے پاس بھیجے ہیں جو مختلف موضوعات سے متعلق رہے ہیں۔

آپ کو میری واپسی کا انتظار ہے کہ میں وہاں ادبی تنقید میں اپنی جگہ سنبھال لوں، لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ اب بہتر ہے کہ ایک جدید ناقد ابھرے۔ میں نے طے کیا ہے کہ میں اپنی بقیہ زندگی اور متاع جہد ایک مکمل اجتماعی منصوبہ کی تکمیل میں لگاؤں جو متعدد عمر میں مانگتا ہے۔ میرے مطمئن رہنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ آپ ادبی تنقید کے سر سوار رہیں۔

اس مناسبت سے کیا مجھے یہ اجازت ہے کہ میں بعض ان اندیشوں اور خطرات کا تذکرہ کر دوں جو مجھے اس راہ میں محسوس ہو رہے ہیں ادبی تنقید کے میدان میں سب سے بڑا خطرہ دوستی اور محبت کی کشمکش، شہرت اور ناموری کی کشش انفرادی و اجتماعی زندگی میں تعلقات سنبھالنے کے مسائل اور ان سب سے بڑھ کر کلمہ حق

کا اظہار رہے جس کی قیمت اکثر بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ کیا مجھے اس بات کا اطمینان رہے گا کہ آپ ان تمام محرکات وعوامل سے محتاط رہیں گے اور ان میں سے کسی کو اس بات کا موقع نہ دیں گے کہ وہ آپ کے قلم کی سیاہی کو گدلا کر سکے۔

مجھے خیر کی توقع ہے اور اللہ سے توفیق کی دعا ہے۔ آپ نے میرے اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے درمیان تعلقات کی طرف اشارہ کیا ہے تو ہر صورت میں میرا یہ ایمان ہے کہ ملک کی بھلائی اس بات میں ہے کہ یہ شخص وزارت تعلیم میں ہو۔ وہ میرے خلاف ہوں یا موافق ہوں میں ان سے اس کی بازپرس نہیں کرنا چاہتا۔ میرا راستہ میرے سامنے واضح ہے اور تمام حالات میں میرا ہدف کیا ہوگا، یہ میں جانتا ہوں!"[9]

---

(۹) ابتدا میں سید قطب عقاد کی گہرائی وعمق مطالعہ اور طٰہٰ حسین کی روشن خیالی سے متاثر تھے۔ جب تک ان کا اپنا ایک منفرد طرز ادب وجود میں نہ آ گیا، طٰہٰ حسین کی ادبیت کی نقالی کرتے رہے۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعد میں جبکہ فکر اسلامی کے علمبردار اور نظام اسلامی کے مبلغ بن چکے تھے طٰہٰ حسین کا نام عزت واحترام سے لیتے رہے یہ دراصل ایک بڑے ادیب کی عظمت وصلاحیت کا اعتراف تھا ورنہ طٰہٰ حسین کی فکر سے وہ کبھی متاثر نہ ہوئے۔ چنانچہ اخوان سے منسلک ہونے سے پہلے ہی جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافۃ فی مصر" بازار میں آئی تو علماء نے جہاں اس کتاب کی دینی حیثیت پر اعتراضات کئے وہیں سید قطب نے مدلل اور محکم اسلوب میں اس کتاب کی تجزیاتی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ طٰہٰ حسین نے مصر کو مغربی تہذیب اختیار کرنے کی دعوت دی تھی اور یہ تجویز رکھی تھی کہ مصر میں آئندہ تہذیب مغرب سے ماخوذ ہونی چاہئے۔ سید قطب نے اس تجزیہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر موصوف کو دراصل یہ غلط فہمی ہے کہ دنیا دو بلاکوں میں منقسم ہے ایک مشرق ہے جس کی نمائندگی چین اور جاپان اور ہندوستان وانڈونیشیا کرتے ہیں اور دوسرا مغرب ہے جس کی نمائندگی فرانس اور انگلینڈ اور امریکہ ویورپ کرتے ہیں۔ دراصل ایک تیسرا بلاک بھی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ عالم اسلام کا بلاک ہے۔ اگر مصر ادپر اٹھے تو ان دونوں بلاکوں کے درمیان سنگم کا کام دے سکتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید قطب کا ابتدائی دور بھی مرعوبیت اور خیرگی سے پاک رہا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مجھے اس موقع پر "عالم عربی میں بوڑھوں اور جوانوں میں کشمکش کی ابتدا" مقالہ یاد آرہا ہے۔ کینیڈا کے ہائی وکس یونیورسٹی کے ایک استاذ نے مجھ سے اس مقالہ کے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی ہے، تاکہ امریکہ میں بھی اس کی اشاعت ہوسکے۔ میں نے اثبات میں جواب دے دیا ہے۔

خطوط لکھتے رہئے اور ہر خط کے جواب کا انتظار مت کیجئے۔

آپ کا بھائی

سید قطب

واشنگٹن ۵ مارچ ۱۹۵۰ء[10]

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا بہتر ہوگا کہ سید شہید نے ۱۹۴۸ء میں امریکہ کی طرف پرواز کیا تھا۔ اس وقت العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام مصر میں طبع ہوکر عوام تک پہنچ چکی تھی۔ اخوان جنگ فلسطین میں دادِ شجاعت دے رہے تھے اور گرفتاری و شہادت کے نام اعلیٰ مقامات پر فائز ہو رہے تھے۔ ان حالات میں جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو مصنف کی اسلامیت پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ پھر امریکہ جاکر وہاں کی تہذیب کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور اپنی تصنیف امریکا التی رأیت میں اپنے تاثرات ظاہر کئے۔ سید قطب گرچہ اخوان کے باضابطہ رکن اواخر ۱۹۵۳ء میں بنے[11] لیکن اخوان

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ کا) سید قطب کے یہ مضامین دارالعلوم میں اپریل ۱۹۳۹ء (ص ۲۸ - ۹۰) میں طبع ہوئے جسے جریدہ الاخوان المسلمون نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے صفحات میں انہیں نمایاں مقام پر شائع کیا۔ شاید یہی ادبی تعلق بعد میں تحریک اخوان سے وابستگی کے لئے تخم کا کام کر گیا۔ بعدہٗ ان تحریروں کو نقد مستقبل الثقافۃ فی مصر کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا

(۱۰) یہ دونوں خطوط یوسف العظم الشہید سید قطب، دارالقلم بیروت ۱۹۶۳ء ص ۱۵۲ ۔ ۱۵۴ سے ماخوذ ہیں۔ (۱۱) مولانا خلیل احمد حامدی نے جادۂ منزل (ص ۲۱) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ سید صاحب ۱۹۴۵ء ہی میں اخوان سے وابستہ ہوگئے تھے لیکن شاید یہ طباعت کی غلطی ہے کیونکہ اس وقت ان کے اور حسن البنا کے درمیان کچھ اختلافات بھی تھے اور امریکہ جانے سے پہلے دین کی خدمت کی طرف ان کا رجحان ہونے کے بجائے ادبی تنقید میں جولانیاں دکھاتا تھا۔ دیکھئے اسلام عدل اجتماعی ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ص ۳۷

کی ان دینی واجتماعی سرگرمیوں میں انھیں اپنی طرف ابتدا ہی میں متوجہ کرلیا تھا چنانچہ اس کتاب کا انتساب اس طرح کرتے ہیں۔

"ان نوجوانوں کے نام جنھیں میں بچشم تصور دیکھ رہا ہوں کہ وہ ازسرنو اس دین کو قائم کر رہے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جنگ کررہے ہیں۔ دشمنوں کو قتل کر رہے ہیں اور خود بھی شہید ہو رہے ہیں اور ان کے دلوں میں اس بات پر ایمان راسخ ہو چکا ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے . . .

ان جیالوں کی خدمت میں، جن کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ جلد ہی اسلام کی طاقتور روح انھیں ماضی سے نکال کر مستقبل کا معمار بنا دے گی۔ وقت بس آیا چاہتا ہے۔"

اس سے صاحب بصیرت لوگوں نے اخوان کو مخاطب سمجھا۔ چنانچہ مصری حکومت نے اس کتاب کی ضبطی کا اعلان کیا اور اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی اور دوسری طرف اخوانوں نے جیل کے اندر اور باہر اس کتاب کو اپنی تربیت کے کورس میں داخل کر لیا اور اس کے مطالعہ میں لگ گئے۔ اس وقت تک سید قطب اخوان سے منسلک نہ ہوئے تھے لیکن ان کے جذبۂ صادق مطالعۂ عمیق اور ذہن دور رس نے اس تحریک کا پتہ چلا لیا تھا جن کے ذریعہ اس کتاب کا مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حسن البنا شہید نے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ تو ہمارے ہی افکار ہیں اور اس کے مصنف کو ہمارے درمیان ہونا چاہئے۔" چنانچہ امریکہ سے واپسی کے بعد جب اخوان سے تعلق قائم ہو گیا اور اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا تو مصنف نے انتساب اس طرح کیا:

ان نوجوانوں کے نام جنھیں میں بچشم تصور دیکھ رہا ہوں کہ . . . اور اب میں نے انھیں پا لیا ہے[۱۴]

مصنف کی یہ کتاب زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر اور سیاسی، معاشی عدل کے بارے میں اس کے مزاج کی وضاحت میں پوری کامیاب قرار دی جا سکتی

---

(۱۴) یوسف العظم، نفس مصدر، ص ۱۵۵۔ بعض عرب مصنفین نے اس رائے سے عدم اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں سید قطب نے اس کتاب میں جن نوجوانوں کو مخاطب کیا تھا، وہ خیالی تھے۔ حقیقت کی دنیا میں ان کا وجود نہ تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ایسے نوجوان آگے بڑھیں جو اسلامی معاشرے کی تعمیر نو کا فریضہ انجام دیں۔ لیکن اس رائے میں کوئی زیادہ وزن نہیں ہے اس لئے ہم نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔

ہے۔ مصنف کے نزدیک اسلام کے قوانین سے زیادہ اہم وہ روح اور مزاج ہے جس کا اسلامی نظام حامل ہے۔ اس کتاب میں مصنف اسی اسپرٹ کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ مصنف کا تجزیہ یہ ہے کہ سیاسیات و اقتصادیات یا افراد و اقوام کے باہمی تعلقات کے ضمن میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے پہلے الوہیت، کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلام کا بنیادی فکر معلوم کرے اس لئے کہ یہ سب در اصل شاخیں ہیں۔ جو اسی بنیادی فکر سے نکلی ہیں۔ اسے سمجھے بغیر ان کو پوری صحت اور گہرائی کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا۔ حقیقی اسلامی فکر ابن سینا، ابن رشد، فارابی اور ان جیسے دوسرے فلاسفہ کے یہاں نہیں ملے گا جن کو دنیا فلاسفۂ اسلام، کہتی ہے۔ ان کا فلسفہ یونانی فلسفہ کا چربہ ہے جو اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کے لئے بالکل اجنبی واقع ہوا ہے۔ اسلام کے پاس اپنا حقیقی اور مکمل فکر موجود ہے جو اس کے فکری مآخذ قرآن وحدیث، سیرت پاک، اور آپ کے اسوہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے جس بنیادی فکر سے اس کی بقیہ ساری تعلیمات ــ قوانین، عبادات اور معاملات کی شکل میں ــ نکلتی ہیں اس کو پا لینے کے لئے یہ مآخذ ہر محقق کے لئے کافی ہیں۔[۱۳]

اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو الگ الگ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ روح اسلام کی کسوٹی پر مسلم تاریخ کو پرکھنے کے عمل نے سید قطب کو ممتاز و منفرد مقام عطا کیا ہے۔ ساتویں باب میں تاریخ اسلام سے مثالیں دی ہیں جو روح اسلامی کے بقاء تسلسل کا ثبوت ہیں اور اس حقیقت کو ذہن نشین کراتی ہیں کہ اسلام کا نظام ماضی کی مقدس یادگار ہی نہیں بلکہ آج کے دور میں بھی قابل عمل ہے اور یہ تاریخ اسلامی کے ہر دور کو کسی نہ کسی شکل میں متاثر کرتا رہا ہے۔[۱۴]

---

(۱۳) سید قطب، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، مطبع عیسیٰ البابی الحلبی و شرکاہ ۱۹۶۴ء ص ۲۰ - ۲۱

(۱۴) دیکھئے ساتواں باب من الواقع التاریخی فی الاسلام، ص، ۱۶۳ - ۲۰۴۔ یہ کتاب کا سب سے قیمتی باب ہے جو اس سے پہلے غالباً اتنی شرح و بسط کے ساتھ کبھی نہیں لکھا گیا کہ اس سے اسلام کے آج کے دور میں قابل عمل ہونے کا یقین پیدا ہو جائے۔

تراجم واقتباسات

نائیجریا میں مسلم عیسائی تعلقات

محمد رضی الاسلام ندوی

(مجلہ JOURNAL INSTITUTE MUSLIM MINORITY AFFAIRS
نے محترم م م بدنوس کا ایک مقالہ THE ISLAMIC APPROACH TO
RELIGIOUS DIALOGUE WITH SPECIAL REFRENCE TO NIGERIA
شائع کیا تھا اس میں نائیجریا کے تعلق سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے باہمی تعلقات کے
بارے میں کچھ مفید معلومات آگئی ہیں۔ ہم وزارت الاوقاف کویت کے شکریہ کے ساتھ
جس نے اس کا عربی ترجمہ شائع کیا تھا، تلخیص کرکے اس کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں)

نائیجریا کے موجودہ حالات تقاضا کرتے ہیں کہ وہاں مختلف مذہبی حلقوں کے درمیان امن و امان، خیر سگالی، رواداری اور باہمی تعاون قائم کرنے کے وسائل و ذرائع کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ وہاں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اقتصادی اور سیاسی پلاننگ کرنے اور اسے نافذ کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ وہاں پے در پے ہونے والے مذہبی اضطرابات کے سبب ملک کی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور اس کی رفتار میں کمی آئی ہے۔ ان مذہبی اضطرابات کو مباحثہ، گفت و شنید اور باہمی مذاکرات کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔ باہمی مذاکرات کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو باہمی ملاقات اور تعارف کے لیے ایک ایسا اسٹیج فراہم کیا جائے جہاں وہ سنجیدہ اسلوب اور احترام کی روح کے ساتھ ایک دوسرے کے خیالات معلوم کر سکیں اور اتحاد اور اختلاف کے حدود سے آگاہ ہو سکیں۔ درج ذیل سطور میں ہم جائزہ لیں گے کہ نائیجریا میں مسلمان اور عیسائی کہاں تک اس طریقے کو اپنائے ہوئے ہیں۔

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے وہ امن و سکون کی فضا قائم کرنے کے لئے مختلف ذرائع اختیار کرتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جس معاشرہ میں بھی رہتا ہے وہاں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ربط و تعلق رکھتا ہے۔ اللہ کے رسول حضرت محمدؐ نے جب مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو وہاں جو قبائلی اور نسلی اور مذہبی حلقے آباد تھے ان سے اور خاص طور پر یہود سے روابط پیدا کئے۔

اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عموماً احترام اور مفاہمت کا رویہ اپناتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ آپؐ نے یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب قرار دیا اور اپنی ہر ملاقات اور گفتگو میں ان کے ساتھ محبت و مودت کا برتاؤ کیا۔ قرآن نے انھیں "یا اھل الکتاب" کہہ کر مخاطب کیا۔ "ایھا الکفرۃ" اور "یا غیرالمسلمین" نہیں کہا۔ اس طرح اس نے محبت اور احترام کا اسلوب اپنایا۔ قرآن دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو برا بھلا کہنے سے بھی روکتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوا ۙ	اے مسلمانو یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو
وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ	پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ
وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝	ہو کر یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر
(الانعام: ۱۰۸)	اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

عہد اول کے مسلمانوں نے اس اصول کو اس حد تک اپنایا کہ جب نصاریٰ کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے تھے تو مسلمان ان کے غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ۶۱۴ء میں جب بت پرست فارس کے ہاتھوں روم کو شکست ہوئی تو اللہ کے رسولؐ اور آپ اصحاب کو بہت رنج ہوا۔ اس لیے کہ وہ عقیدۂ توحید کی وجہ سے روم کی طرف میلان رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ روم نازل فرمائی جس میں رسولؐ اور مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے بہت جلد روم کی فتح یابی کی بشارت سنائی۔ اسی طرح ۶۳۰ء میں عام الوفود میں آنحضرتؐ نے مختلف عیسائی وفود اور خاص کر وفد نجران کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ محبت و احترام سے گفتگو فرمائی اور ان پر اسلام کو تھوپنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان سے اعتماد و مفاہمت پر مبنی کچھ معاہدہ کئے۔

نائجیریا کے مسلمان بڑی حد تک رسول اللہؐ کے اس اسوہ پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر بولوحون جو عیسائیوں سے مذاکرات کے سلسلہ میں نائجیریا کے مسلمانوں کے نمائندہ سمجھے

جاتے ہیں۔ ہمیشہ مختلف اسالیب سے نائیجریا کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تفاہم و تعاون کے لئے کوشاں رہتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے برخلاف نائیجریا کے عیسائیوں کا رویہ ہمیشہ منفی رہا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور پادری اوبایان نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے کہا تھا

"اسلام اس دعوت پر شدت سے یقین رکھتا ہے جو پر امن ذرائع کے ساتھ ساتھ فوجی طاقت سے پھیلی ہے۔ قرآن بعض ایسے اصولوں کا انکار کرتا ہے جنھیں عیسائیوں کے نزدیک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آج جبکہ تمام عیسائی بت پرستوں اور غیر نصاریٰ میں انجیل کی اشاعت کے سلسلہ میں پُرامن ذرائع پر گہرا ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اسلام لوگوں کو حلقہ بگوش کرنے کے لئے فوجی یلغار کو جائز سمجھتا ہے"

یہ اقتباس اوبایان کی اس تقریر سے ماخوذ ہے جو انھوں نے ایک ایسے سیمنار میں کی تھی جس کا مقصد مذاکرات کے ذریعہ نائیجریا میں مختلف مذہبی حلقوں کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے ذرائع تلاش کرنا تھا۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ اوبایان قرآنی آیات کو بے محل پیش کر کے اسلام کے بارے میں یہ خیال پیش کرتا ہے کہ وہ اشاعت کے لئے ظلم وجبر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے درج ذیل آیت سے استدلال کیا ہے:

یا ایھا النبی حرّض المومنین علی القتال" (الانفال ۶۵) — اے نبیؐ مومنوں کو جنگ پر ابھارو

حالانکہ جنگ کی مشروعیت دراصل دفاع کے طور پر ہوئی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۚ	اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے ہیں صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

(الحج: ۳۹-۴۰)

لیکن مذکورہ پادری حقیقت سے اعراض کرتے ہوئے اور بے جا تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلی آیت کو مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کے نمائندہ پروفیسر بولوجون کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ وہ جب بھی انجیل کے فقرات سے استدلال کرتے ہیں تو انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

نائیجریا میں عیسائیوں کی طرف سے پیش آنے والے متعدد واقعات سے اوبابان کے مذکورہ مواقف کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نائیجریا میں عیسائی قیادت نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ عیسائیوں کے لئے قدوس کی زیارت کا بندوبست کرے۔ بظاہر عیسائیوں کا یہ مطالبہ نائیجریائی حکومت کے اس اہتمام کے ردعمل کے طور پر تھا جو مسلمانوں کے لیے حج کے سلسلہ میں کرتی ہے۔ لیکن اگر حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کا حج ایک فریضہ اور اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ جبکہ عیسائیوں کا قدس کی زیارت کوئی مذہبی فریضہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف نائیجریا کے مسلمانوں نے حکومت سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ عیسائیوں کو ان کے عقیدے پر عمل کرنے کے سلسلہ میں جو خاص سہولیات حاصل ہیں وہ انھیں بھی دی جائیں۔ باوجودیہ کہ عیسائیوں کو کچھ ایسی سہولیات حاصل ہیں جنھیں چیلنج کیا جاسکتا ہے مثال کے طور پر نائیجریا میں سنیچر اور اتوار کو سرکاری چھٹی ہوتی ہے۔ چھٹی کے یہ دن عیسائی خاندانوں کو کاموں کی تھکن اور اضطراب سے بچا کر پرسکون فضا میں عبادت کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مسلمان بھی تمنا کرتے ہیں کہ انھیں جمعہ کے دن ایسا موقع مل جائے جس میں وہ اطمینان سے جمعہ کی نماز ادا کر سکیں۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا۔

اسی طرح جب ادارۂ شا جاری نے مسلمانوں کے لئے ابوجا میں عبادت گاہیں تعمیر کرنے کے لئے فنڈ فراہم کیا تو عیسائی قیادت نے کہنا شروع کیا کہ مذکورہ ادارہ مسلمانوں کے سلسلہ میں تعصب سے کام لیتا ہے۔ جب کہ ان عیسائی قائدین کو یہ بھی معلوم تھا کہ اسی کے مثل فنڈ ابوجا میں تعمیر کے لئے عیسائیوں کو بھی دیا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی طرف سے عوام کے سامنے اس حقیقت کا اعلان نہیں کیا گیا۔

اور اس سلسلہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ نائیجریا کے اسلامی کانفرنس کے ممبر ہونے پر عیسائیوں نے زبردست احتجاج کیا اور اب تک اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کا اعتراف کرنے سے پہلوتہی کرتے ہیں کہ نائیجریا اور ویٹیکن کے درمیان سفارتی تعلقات محض مذہبی بنیادوں اور خاص طور پر کیتھولک بنیاد پر استوار ہیں عموماً سفارتی تعلقات اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی یا تربیتی فائدوں کے پیش نظر قائم کئے جاتے ہیں اور نائیجریا اور

ویٹیکن کے درمیان سفارتی تعلقات میں ان میں سے کسی چیز کی امید نہیں۔ جبکہ اسلامی کانفرنس کی ممبر شپ سے بہت سے فائدے وابستہ ہیں لیکن نائجیریا کے مسلمانوں نے کبھی نائجیریا اور ویٹیکن کے درمیان سفارتی تعلقات پر اعتراض نہیں کیا۔

نائجیریا میں مسلمان اور عیسائی دونوں اپنے مذہب کی اشاعت اور اپنی تعداد میں اضافہ کے لئے کوشاں ہیں۔ اور انہیں اس سلسلہ میں پوری آزادی بھی حاصل ہے۔ لہٰذا مناسب رویہ یہ ہونا چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک صرف دعوت پیش کرنے پر اکتفا کرے اور مخاطب کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ ان میں سے جس کا مذہب چاہے اختیار کرے۔

ماضی میں نائجیریا کے بہت سے باشندوں نے محض اس وجہ سے عیسائیت قبول کرلی تھی کہ وہ سامراجیوں کا مذہب تھا اور عیسائیت قبول کر لینے کے نتیجہ میں کام کے بکثرت مواقع حاصل تھے۔ اور دوسری طرف وہاں اسلام کی اشاعت کچھ ایسے افراد کے ذریعے ہوئی جو تاجر پیشہ تھے۔ لیکن اب جبکہ سامراجی ملک چھوڑ چکے ہیں ضروری ہے کہ ملک میں نئی روح جاری و ساری رہے۔ ہر مذہب کو اپنی تعلیمات کو عام کرنے اور لوگوں کو ان کی طرف دعوت دینے کے مواقع حاصل ہوں۔

نہ کیا ہو لیکن بعد میں اس کے خوشگوار اثرات کا دائرہ بڑھنے لگا ہے اور یقین ہے بڑھتا ہی رہے گا۔ یہ لہر تھی جماعت اسلامی یوپی کے ہفتہ خیر سگالی کی۔ اس مہم کا مقصد مختلف فرقوں کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کر کے انھیں ایک دوسرے کے قریب لانا، ان میں باہم خیر سگالی کے جذبے کو فروغ دینا نیز سماجی و اخلاقی برائیوں کو دور کرنے اور اچھائیوں کو فروغ دینے میں ایک دوسرے سے تعاون پر آمادہ کرنا تھا تاکہ زبان، تہذیب اور علاقہ و مذہب کی بنیادوں پر پائی جانے والی نفرت اور عصبیت کا خاتمہ ہو۔ جماعت اسلامی نے یہ کام کسی وقتی مصلحت کے تحت نہیں بلکہ اپنی مستقل پالیسی اور پروگرام کے تحت کیا تھا۔ فرقہ وارانہ منافرت، سماجی اونچ نیچ، چھوت چھات اور تہذیبی جارحیت کو ختم کرنا، بھلائیاں پھیلانا، برائیاں مٹانا، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی روابط کو پروان چڑھانا اور اختلافی امور و مسائل کو حل کرنے کے لئے مل جل کر کوشش کرنا جماعت کی پالیسی و پروگرام کا اہم حصہ ہے۔ جماعت یہ فریضہ تحریر و تقریر اور افہام و تفہیم کے ذریعہ گذشتہ چالیس سال سے انجام دے رہی ہے۔ اس کے اجتماعات کی کاروائی اور اخبارات کی تحریریں اس کی شاہد ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے چونکہ فرقہ وارانہ ماحول مسموم سا ہو چلا ہے اس لیے جماعت اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے زیادہ توجہ سے یہ کام انجام دینا چاہتی ہے۔ کچھ ریاستوں میں یہ مہم کامیابی سے

چلائی جا چکی ہے۔ گذشتہ نومبر میں جنوبی ریاست آندھرا پردیش میں "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" کے
عنوان سے ایک ہفتہ منایا گیا جس کے بہت مثبت اور خوشگوار نتائج برآمد ہوئے اور
اس طرح معلوم ہوا کہ اگر پورے خلوص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر دستک
دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا خاطر خواہ جواب نہ ملے۔ جماعت سے تعلق رکھنے والے
طلبا اور نوجوانوں کی تنظیم ایس۔ آئی او (اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن) نے جنوری میں "کال ٹو
پیس" (امن کی پکار) کے عنوان سے ملک بھر میں ایک پندرہ واڑہ منایا جس کے دوران
امن و آشتی کے وسیع تر مفہوم کے تحت لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تنظیم
اس سے قبل اخلاقی بگاڑ اور سماجی برائیوں کے خلاف مہم چلا چکی ہے۔ ان تمام پروگراموں میں
تمام فرقوں اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔

یو۔ پی میں ہفتہ خیر سگالی منانے کا فیصلہ کرتے وقت جماعت اسلامی کے سامنے ملک
کی سب سے بڑی ریاست کی مخصوص سیاسی اور فرقہ وارانہ صورت حال تھی۔ جماعت کو
ان مشکلات اور رکاوٹوں کا بھی احساس تھا جو اس کی راہ میں حائل ہو سکتی تھیں۔ صورت حال
کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہی اللہ کا نام لے کر یہ اقدام کیا گیا۔ جماعت اسلامی علاقہ لکھنؤ
کے ناظم حافظ منصور عالم صاحب اس پروگرام کے کنوینر بنائے گئے جو فیصلہ کے فوراً
بعد ہی سے اس کی تیاریوں میں لگ گئے۔ امیر حلقہ مولانا محمد رفیق قاسمی صاحب نے کارکنوں
کو تیار کرنے کا کام بہت تیزی سے کیا۔ اس سلسلے میں مختلف مقامات پر کارکنوں کے اجتماعات
کئے گئے مہم شروع ہونے سے پہلے بینر، پوسٹر، ہینڈبل، سینما سلائڈ، اخباری اعلانات، کارنر
میٹنگس، خصوصی دعوت ناموں اور ملاقاتوں کے ذریعے عوام تک بات پہنچائی گئی، ان سے
اس پروگرام میں شرکت اور تعاون کی اپیل کی گئی۔ ہفتہ کے آغاز سے دو دن قبل یعنی ۶؍ اپریل کو
لکھنؤ میں پریس کانفرنس کر کے ایک بیان جاری کیا گیا جس میں اس پروگرام کے محرکات اور اس
کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی نیز جماعت اسلامی کی دعوت اور پالیسی و پروگرام کا تعارف
کرایا گیا۔ اس پریس کانفرنس سے مولانا محمد سراج الحسن صاحب سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے
خطاب کیا اور مختلف سوالوں کے جوابات دیئے۔ ۸؍ اپریل سے مہم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ریاست
کے تقریباً ڈھائی سو چھوٹے بڑے مقامات پر یہ پروگرام چلایا گیا۔ اس دوران خطابات عام،
سمپوزیم، پریس کانفرنسیں، بار کاؤنسلوں سے خطاب، کارنر اور گروپ میٹنگس، مقامی

سرکردہ شخصیتوں سے ملاقاتیں، ہم خیال تعلیمی اداروں میں ریلیوں جلوسوں اور ڈراموں کا اہتمام، خواتین کے اجتماعات نیز ٹیپ اور ویڈیو کیسٹ دکھانے کا اہتمام کیا گیا۔ ہر مقام کے کارکنوں نے اپنی سہولیت اور موقع محل کے مطابق یہ پروگرام چلایا۔ البتہ سمپوزیم کا اہتمام تقریباً ہر مقام پر کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا" فرقہ پرستی۔ اسباب اور علاج"۔ بیشتر مقامات پر یہ سمپوزیم خطاب عام کی شکل میں اور جماعت کے ذمہ داروں کی صدارت میں ہوا۔ اور جیسا کہ باخبر لوگ جانتے ہیں جماعت اسلامی ملک و عوام کو درپیش مختلف مسائل کے سلسلہ میں مجالس مذاکرہ کا اہتمام کرکے مختلف مکاتب فکر کے افراد کو اظہار خیال کی دعوت دیتی ہے۔ اس سمپوزیم میں بھی بڑے شہروں میں ریاستی سطح کے سیاسی و سماجی لیڈروں اور چھوٹے مقامات پر مقامی اور علاقائی سطح کے سوشل ورکروں کو اظہار خیال کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ ہر جگہ مقررین نے دعوت قبول کی۔ بعض نے پہلے سے طے شدہ مصروفیت کے پیش نظر شرکت سے معذوری ظاہر کی بھی تو بہت اچھے انداز میں۔ جن لوگوں نے دعوت قبول کی وہ بالعموم تشریف لائے اور اظہار خیال کیا۔ مہم کی ضرورت و افادیت سے سبھی متفق تھے اور سبھی نے جماعت کی ان کوششوں کو سراہا۔

سمپوزیم میں بعض مقامات پر کچھ غیر مسلم مقررین کی طرف سے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا گیا کہ" جو جماعت خود فرقہ پرست سمجھی جاتی ہے وہ فرقہ پرستی کے خلاف مہم چلا رہی ہے"۔ بعض نے تو یہاں تک کہا کہ" ہماری شرکت کا واحد محرک یہی ہے کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ فرقہ واریت کے بارے میں جماعت کا موقف کیا ہے"۔ ظاہر ہے کہ ان مقررین کی یہ سوچ جماعت اسلامی کی دعوت سے ان کی ناواقفیت کا نتیجہ تھی۔ اس ملک کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے ناخواندہ اور سیدھے سادے عوام ہی نہیں، پڑھے لکھے افراد بھی مختلف امور میں سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں، براہ راست حقائق معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی ہند جیسی وسیع النظر تنظیم جو مسلمانوں کی دینی سرخروئی کے لئے کوشاں رہنے کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کی فلاح اور نجات کے لیے بھی فکرمند رہتی ہے، تنگ نظر اور فرقہ پرست بنا کر رکھ دی گئی ہے جبکہ اس کا دستور، پالیسی و پروگرام اور دعوتی لٹریچر سب کچھ چھپا ہوا اور عام ہے۔ اسے حالات کی ستم ظریفی کہنا چاہئے کہ جو جماعت ملک کی سب سے وسیع النظر، غیر فرقہ پرست، دوراندیش اور پوری انسانیت کا

درد اپنے دل میں رکھنے والی جماعت ہے، فرقہ پرست سمجھی جاتی ہے۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ شہریوں کے شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے اور لوگ جیسے جیسے جماعت کے پیغام سے براہ راست واقفیت حاصل کر رہے ہیں، غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں۔ ان سمپوزیمون میں بھی اس کا خوش آئند تجربہ ہوا۔ جماعت کے مقررین نے ان حضرات کی صاف گوئی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جب جماعت کی دعوت واضح کی تو فوری طور سے اس کے اثرات سامنے آئے مجلس کے اختتام پر لوگوں نے برملا کہا کہ جماعت کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پہلی بار آئی ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ اگر جماعت اسلامی کی یہی دعوت ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ پھیلنا چاہئے۔ سلطان پور میں امیر حلقہ آندھرا مولانا عبد العزیز صاحب بار السوسی ایشن کے ممبروں سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے تو وکیل حضرات شاید دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ یہ مولوی صاحب ہم سے آخر کیا کہیں گے لیکن تقریر کے اختتام پر وکیلوں نے انھیں گھیر لیا اور بار ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں نے پیش کش کی کہ "آئندہ ہم اپنے خرچ پر آپ کو یہاں بلائیں گے۔ آپ بہت بنیادی اور ٹھوس کام کر رہے ہیں" اسی طرح کے جذبات کا اظہار گورکھپور اور اعظم گڑھ میں بھی کیا گیا جہاں جناب عبد العزیز صاحب نے وکلا سے خطاب کیا تھا۔ فیروز آباد کے سمپوزیم میں اے ڈی ایم سٹی جناب دلبیر سنگھ نے کہا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں میں خیر سگالی میری زندگی کی سب سے عزیز چیز ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جماعت اسلامی یہ کام انجام دے رہی ہے" جلسہ کے اختتام پر جناب دلبیر سنگھ کے ہمراہ آئے ہوئے پولیس افسر نے مولانا سراج الحسن صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ اس سے شہر میں خوشگوار ماحول برقرار رکھنے میں ہمیں بہت مدد ملے گی"۔ علی گڑھ کے سمپوزیم میں ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر وید پال شرما نے کہا کہ اپنی ۶۳ سالہ زندگی میں مجھے اپنی بات کہنے کے لئے پہلی بار ایک صحیح اور موزوں پلیٹ فارم ملا ہے۔ ہند و مسلم اتحاد کی بات حکمراں اور سیاسی لیڈر بھی کرتا ہے لیکن اس کی بات منافقت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتی خلوص سے یہ کام صرف جماعت اسلامی جیسی تنظیمیں ہی کر سکتی ہیں"۔ شہر کی ایک سرکردہ شخصیت جناب گوپال پرشاد شرما نے تجویز رکھی کہ علی گڑھ میں جماعت اسلامی کی نگرانی میں محلہ وار کمیٹیاں قائم کی جائیں جو عوام کے درمیان اتحاد و خیر سگالی کے لیے مستقلاً کام کرتی رہیں۔ اس تجویز پر فوری طور سے عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کانپور اور اناؤ کے جلسوں میں جنتا پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر سبرامنیم سوامی ایم پی

نے بھی حصہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں جماعت اسلامی پر فرقہ پرستی کا الزام غلط ہے۔ یہ جماعت سارے انسانوں کو اپنا سمجھتی ہے۔ میں اس کی ہر بات سے متفق نہیں ہوں، لیکن جماعت مختلف فرقوں کے درمیان میل میلاپ اور خیر سگالی کے لئے جو کام کر رہی ہے اُس میں پوری طرح اس کے ساتھ ہوں۔ ڈاکٹر سوامی نے کہا کہ فرقہ پرستی کا مسئلہ قطعی مصنوعی مسئلہ ہے اور یہ مفاد پرست حکمرانوں کا پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ کسی مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو تو مسلمان لیڈروں کو اور ہندوؤں کی طرف سے ناانصافی ہو رہی ہو تو ہندو لیڈروں کو آگے بڑھ کر معاملہ کو سلجھانا چاہئے۔

سمپوزیم اور خطابات عام بالعموم جماعت کے ذمہ داروں کی صدارت میں ہوئے جماعت اسلامی یوپی کے امیر مولانا محمد رفیق قاسمی صاحب، ہفتہ خیر سگالی کے کنوینر حافظ منصور عالم صاحب، آل انڈیا مساجد کونسل کے صدر مولانا عبدالغفار ندوی صاحب مختلف علاقوں اور اضلاع کے نظماء اور مقامی امراء کے علاوہ مرکز جماعت سے مولانا محمد شفیع مونس صاحب اور مولانا محمد سراج الحسن صاحب، (سکریٹری) جماعت اسلامی دہلی کے امیر ڈاکٹر کوثر یزدانی صاحب، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کے صدر مولانا محمد فاروق خاں صاحب ادارہ تحقیق کے سکریٹری اور جریدہ تحقیقات اسلامی و ماہنامہ زندگی کے مدیر مولانا سید جلال الدین صاحب عمری اور جماعت اسلامی آندھرا پردیش کے امیر مولانا عبدالعزیز صاحب نے مختلف مقامات پر سمپوزیم اور خطابات عام میں حصہ لیا۔ مہم کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر محترم قیم جماعت مولانا افضل حسین صاحب نے بھی لکھنؤ اور کانپور کے پروگراموں میں شرکت کی اور سمپوزیم کی صدارت فرمائی۔

"فرقہ پرستی — اسباب اور علاج" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے جماعت کے نمائندوں نے بتایا کہ فرقہ پرستی ہو یا کوئی اور سماجی و اخلاقی برائی اس کا بڑا سبب خدا اور انسانوں کی حقیقت کو نہ پہچاننا ہے۔ خدا فراموشی کے نتیجہ میں انسان انسانیت سے گر جاتا ہے، زندگی کی حقیقت بھول بیٹھتا ہے اس کے اندر تنگ نظری اور کئی قسم کی عصبیتیں پیدا ہو جاتی ہیں — آج کی فرقہ پرستی کے لئے تاریخ کی غلط اور بددیانتی پر مشتمل تدوین، نصاب تعلیم کے اندر غیر ذمہ دارانہ تحریروں کی شمولیت، تقسیم وطن کے اسباب و محرکات کا غلط تجزیہ اور اس کے ذمہ داروں کا تعین کرنے میں ناانصافی بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ اس کے نتیجہ میں باہمی بے اعتمادی

ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور شکوک و شبہات کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ ان تمام باتوں کا تعلق بھی خدا سے بے خوفی اور انسانی زندگی کی حقیقت سے بے خبری سے ہے۔ انسان کے اندر اپنے خالق و پروردگار کا خوف اور اپنے اعمال کے لئے اس کے لئے اس کے سامنے جوابدہی کا احساس نہ ہو تو وہ ہر قسم کی بے انصافی پر اتر آتا ہے ـــــ لہذا انسانی کردار کی تعمیر اور ایک صحت مند اور مطمئن معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اس کی بندگی کرے اور اپنا ہر کام اس کی مرضی کے مطابق انجام دے۔ جماعت اسلامی ہند انسانوں کو یہی دعوت دیتی ہے کہ وہ ایک خدا کی بندگی اختیار کریں تاکہ انسانی سماج سے انسانیت کش جراثیم کا خاتمہ ہو، ناانصافیاں، نفرتیں اور عصبیتیں مٹیں، برائیاں دور ہوں، بھلائیاں پھیلیں، لوگ ایک دوسرے سے بحث کریں، خود غرضی کے دائروں سے نکلیں اور اس طرح ایک پرامن سوسائٹی تشکیل پا سکے۔ جماعت اسلامی فرقہ پرستی کو کسی ایک فرقہ کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں اور ملک و سماج کے لئے خطرناک اور تباہ کن سمجھتی ہے۔ جماعت چاہتی ہے کہ لوگ اس مسئلہ کے حقیقی اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں ـــــ اس کے ساتھ ہی جماعت کا یقین ہے کہ اس ملک میں اکثریت اب بھی اچھے اور شریف انسانوں کی ہے۔ شر پسندوں اور نفرت پھیلانے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ شرپسند عناصر تو متحد و منظم ہو کر سب کچھ کر گذرتے ہیں اور شریف عوام دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نفرت پھیلانے والوں کے مقابلہ میں نیک اور امن پسند انسان حرکت میں آئیں۔

سمپوزیم اور خطابات عام کے علاوہ مختلف شہروں میں پریس کانفرنسوں کے ذریعے بھی ہفتۂ خیرسگالی، کی غرض و غایت بیان کرنے کے ساتھ جماعتِ اسلامی کی پالیسی و پروگرام کا تعارف کرایا گیا اور نامہ نگاروں کے سوالوں کے جواب دیئے گئے۔ کارنر اور گروپ میٹنگوں کے ذریعے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں طلبا کے نمایندوں سے ملاقاتیں کی گئیں، نیز وکلاء، اساتذہ، سرکاری افسران، سماجی کارکنوں، صحافیوں اور دیگر سرکردہ شہریوں سے رابطہ قائم کرکے ان سے پروگراموں میں شرکت اور تعاون کی درخواست کی گئی۔

ریاست اترپردیش میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا تجربہ تھا جو ہر لحاظ سے خوش گوار اور خوش آئند رہا۔ ہر جگہ غیرمسلم بھائیوں نے خیرمقدم کیا۔ پروگرام میں اگر کہیں کوئی کمی رہ گئی تو اس میں کارکنوں کی کوتاہیوں کا دخل تھا۔ جس مقام پر جتنی زیادہ محنت اور سلیقہ سے کام کیا گیا

وہاں اتنے ہی زیادہ مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ کچھ مقامات پر انتظامیہ نے عام جلسوں کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ایک دو مقامات پر بار ایسوسی ایشن کے ممبروں نے یہ کہہ کر احتیاط برتی کہ "ہم صرف سیکولر افراد اور تنظیموں ہی کے ایڈریس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن بعد میں جماعت کے کارکنوں کی طرف سے رابطہ قائم کئے جانے پر ان حضرات نے اس کا برملا اعتراف کیا کہ ان کی احتیاط غیر ضروری تھی۔ کئی مقامات پر جماعت کے رفقاء نے پوسٹر، ہینڈ بل، دعوت ناموں، فولڈروں کی کاپیاں، نیز بینر اور سینما سلائیڈ کی نقلوں اور دیگر تفصیلات پر مشتمل پروگرام کی مکمل فائیلیں تیار کر کے انتظامیہ کے ذمہ داروں کو پیش کر دی تھیں تاکہ وہ کسی بھی پہلو سے تاریکی میں نہ رہیں۔ اس ہفتہ خیر سگالی کے نتیجہ میں جماعت اسلامی ہند کی اس دیرینہ رائے کی ایک بار پھر تصدیق ہو گئی کہ مختلف فرقوں کے درمیان دوریوں اور بدگمانیوں کی بڑی وجہ ایک دوسرے کو براہ راست سمجھنے کی کوشش نہ کرنا ہے۔ اگر ہر فرقہ کے خیر پسند افراد اسی طرح امن و محبت کا پیغام لے کر اٹھیں، ایک دوسرے کے دلوں پر دستک دیں تو اس کے نتائج نکل کر رہیں گے۔ خیر امت ہونے کے ناطے مسلمانوں کی یہ خاص طور سے ذمہ داری ہے۔